اقبالِ آدب

مُرتّبہ

سیّد وِقار عظیم۔ ایم۔ اے



پبلشر

لالہ رام نرائن لال بُکسیلر

الہ آباد

۱۹۳۹ء

اقبالِ ادب

مُرتّبہ

سیّد وقار عظیم - ایم - اے



پبلشر

لالہ رام نراین لال بکسیلر
الہ آباد

۱۹۳۹ء

دیباچہ

موجودہ انتخاب پر سرسری نظر ڈالنے کے بعد معلوم ہوجائے گا کہ اس میں جس چیز کا سب سے زیادہ لحاظ مدِنظر رکھا گیا ہے وہ اس کا تنوع اور دلچسپی ہے۔ مؤلّف نے سب سے پہلے اپنی نظر کے سامنے محکمۂ تعلیم کے مقرّرہ اصول کو رکھ کر ہر قسم کے انتخابات کئے اور اس کے بعد انھیں ہر ممکن طریقہ سے طلبار کے لئے دلچسپ بنانے کی کوشش کی۔ انتخابات میں قدیم اور جدید ہر دور کے مصنّفین کی انشا پردازی کے بہترین نمونے موجود ہیں اور پڑھنے والے دونوں میں برابر کی دلچسپی لیں گے۔ اب تک مختصر افسانوں اور مزاحیہ مضامین کو انتخابات میں قطعی جگہ نہیں دی جاتی تھی۔ موجودہ انتخاب میں اس بڑی کمی کو پورا کرنے کی بھی کوشش کی گئی ہے۔ اس طرح طالب علم اردو نثر نگاری کی قدیم اور جدید دونوں روشوں کے بہترین نمونوں سے اچھی طرح واقف ہوجائیں گے۔

مؤلّف

فہرست مضامین

خطوطِ غالب

نواب انوار الدولہ کے نام

پیر و مرشد۔ شبِ رفتہ کو مینہ خوب برسا۔ ہوا میں فرطِ برودت سے گزند پیدا ہو گیا۔ اب صبح کا وقت ہے ہوا ٹھنڈی بے گزند چل رہی ہے۔ ابرِ تنک محیط ہے آفتاب نکلا ہے۔ پر نظر نہیں آتا ہے۔ میں عالمِ تصور میں آپ کو مسندِ عزّ و جاہ پر جانشین اور منشی نادر حسین خاں صاحب کو آپ کا جلیس مشاہدہ کر کے آپ کی جناب میں کورنش بجا لاتا ہوں اور منشی صاحب کو سلام کرتا ہوں۔ کافرِ نعمت ہو جاؤں اگر یہ مدارج بجا نہ لاؤں۔ حضرت نے اور منشی صاحب نے میری خاطر سے کیا زحمت اُٹھائی ہے۔ بھائی صاحب بہت خوشنود ہوئے۔ منّت پذیری میں میرے شریک غالب ہیں۔ فی الحال بتوسط میرے سلام نیاز عرض کرتے ہیں۔ اغلب ہے کہ نامہ جداگانہ بھی ارسال کریں۔ حضرت آپ غالب کی شرارتیں دیکھتے ہیں۔ سب کچھ کہے جاتا ہے اور اُس اصل کا جس پر یہ مراتب متفرع ہوں ذکر نہیں کرتا۔ فقیر کو تو یہ طرز پسند نہ آئی۔ مطلب اصلی کو مقدر چھوڑ جانا کیا شیوہ ہے۔ یوں لکھنا تھا کہ آپ کا عنایت نامہ اور اُس کے ساتھ نسب نامۂ خاندان مجددِ علا کا پارسل پہنچا میں ممنون ہوا۔ نواب ضیاء الدین خاں بہادر

بہت ممنون و شاکر ہوئے۔ جناب عالی میں تو غالب ہرزہ سرا کا معتقد نہ رہا۔ آپ نے اُس کو مصاحب بنا رکھا ہے اِس سے اِس کا دماغ چل گیا ہے۔ قبلہ و کعبہ کیا جناب مولانا قلق ہیں۔ حضرت شفیق نے جو غالب کی شفاعت کی تھی وہ مقبول نہ ہوئی۔ اب جناب ہاشمی کو اپنا ہمزبان اور مددگار بنا کر پھر کہتے ہیں۔ آپ کی بات اس باب میں کبھی نہ مانوں گا۔ جب تک سیّد صاحب کا خوشنودی نامہ بھجوائیے گا اس سارٹیفکٹ کے حصول میں رشوت دینے کو بھی میں موجود ہوں۔ والسّلام۔

میر مہدی کے نام

میاں کس حال میں ہو اور کس خیال میں ہو؟ کل شام کو میرن صاحب روانہ ہوئے۔ یہاں اُن کی سُسرال میں قصّے کیا کیا نہ ہوئے۔ ساس اور سالیوں نے اور بی بی نے آنسوؤں کے دریا بہا دئے۔ خوشدامن صاحب بلائیں لیتی ہیں، سالیاں کھڑی ہوئی دعائیں دیتی ہیں۔ بی بی مانند صورت دیوار چُپ۔ جی چاہتا ہے چیخنے کو مگر ناچار چُپ۔ وہ تو غنیمت تھا کہ شہر ویران نہ کوئی جان نہ پہچان ورنہ ہمسایہ میں قیامت برپا ہو جاتی۔ ہر ایک نیک بخت اپنے گھر سے دوڑی آئی۔ امام ضامن علیہ السّلام کا روپیہ بازو پر باندھا گیا۔ اکیاون روپئے خرچ راہ دئے۔ مگر ایسا جانتا ہوں کہ میرن صاحب اپنے جد کی نیاز کا روپیہ راہ ہی میں اپنے بازو سے کھول لیں گے۔ اور تم سے صرف پانچ روپئے ظاہر کرینگے۔ آپ سچ جھوٹ تم پر کھل جائیگا۔ دیکھنا یہی ہوگا کہ میر صاحب تم سے بات چھپائیں گے۔ اِس سے بڑھ کر ایک بات اور ہے اور وہ محل غور ہے۔ ساس غریب نے بہت سی جلیبیاں اور تودہ

قلاقند ساتھ کر دیا ہے، اور میرن صاحب نے اپنے جی میں یہ ارادہ کرلیا ہے کہ جلیبیاں راہ میں چٹ کریں گے اور قلاقند تمھاری نذر کرکر تُم پر احسان دھریں گے۔ بھائی میں دلّی سے آیا ہوں، قلاقند تمھارے واسطے لایا ہوں، زنہار رد نہ کیجیو، مالِ مُفت سمجھ کرلے لیجیو۔ کون گیا ہے، کون لایا ہے۔ کلّو ایاز کے سر پر قرآن رکھو، کلیان کے ہاتھ گنگا جلی دو۔ بلکہ میں بھی قسم کھاتا ہوں کہ اِن تینوں میں اسے کوئی نہیں لایا۔ واللہ میرن صاحب نے کسی سے نہیں منگایا۔ اور سُنو مولوی مظہر علی صاحب لاہوری دروازہ کے باہر صدر بازار تک اُن کے پہنچانے کو گئے۔ رسم مشایعت عمل میں آئی۔ اب کہو بھائی کون بُرا اور کون اچھا ہے میرن صاحب کی نازک مزاجیوں نے کھیل بگاڑ رکھا ہے۔ یہ لوگ تو اُن پر اپنی جان نثار کرتے ہیں۔ عورتیں صدقہ جاتی ہیں۔ مرد پیار کرتے ہیں مجتہد العصر سلطان العلما مولانا سرفراز حسین کو میری دعا کہنا اور کہنا کہ حضرت ہم تُم کو دعا کہیں اور تُم ہم کو دعا دو۔ میاں کس قصّے میں پھنسا ہے۔ فقہ پڑھ کر کیا کرے گا۔ طب و نجوم و ہیئت و منطق فلسفہ پڑھ جو آدمی بنا چاہے۔ خُدا کے بعد نبی اور نبی کے بعد امام یہی ہے، مذہب حق والسّلام والاکرام علی علی کیا کر اور فارغ البال رہا کر۔

ایضاً

واہ واہ سیّد صاحب تُم تو بڑی عبارت آرائیاں کرنے لگے۔ نثر میں خود نُمائیاں کرنے لگے۔ کئی دن سے تُمھارے خط کے جواب کی فکر میں ہوں۔ مگر جاڑے نے بے حس و حرکت کر دیا ہے۔ آج جو بہ سبب ابر

کے وہ سردی نہیں تو میں نے خط لکھنے کا قصد کیا ہے مگر حیران ہوں کہ کیا سحر سازی کروں جو سخن پردازی کروں۔ بھائی تم تو اُردو کے مرزا قتیل بن گئے ہو۔ اُردو بازار میں نہر کے کنارے رہتے رہتے رودِ نیل بن گئے ہو۔ کیا قتیل، کیا رودِ نیل، یہ سب ہنسی کی باتیں ہیں۔ لو سُنو اب تمھاری دلّی کی باتیں ہیں۔ چوک میں بیگم کے باغ کے دروازہ کے سامنے حوض کے پاس جو کنواں تھا اُس میں سنگ و خشت و خاک ڈال کر بند کر دیا۔ بلّی ماروں کے دروازہ کے پاس کی کئی دُکانیں ڈھا کر راستہ چوڑا کر لیا۔ شہر کی آبادی کا حکم خاص و عام کچھ نہیں ہے۔ پنشنداروں سے حاکموں کو کام کچھ نہیں تاج محل مرزا قیصر مرزا جواں بخت کے سالے ولایت علی بیگ جے پوری کی زوجہ ان سب کی الہ آباد سے رہائی ہو گئی۔ بادشاہ مرزا جواں بخت مرزا عبّاس شاہ زینت محل کلکتہ پہنچے اور وہاں سے جہاز پر چڑھائی ہو گی۔ دیکھیے کیمپ میں رہیں یا لندن جائیں۔ خلق نے از روے قیاس، جیسا کہ دہلی کے خبر تراشوں کا دستور ہے، یہ بات اُڑادی ہے۔ سو سارے شہر میں مشہور ہے کہ جنوری شروع سال ۱۸۵۹ء میں لوگ عموماً شہر میں آباد کیے جائیں گے، اور پنشنداروں کو جھولیاں بھر بھر روپیے دیے جائیں گے۔ خیر آج بدھ کا دن ۲۲ر دسمبر کی ہے۔ اب شنبہ کو بڑا دن اور اگلے شنبہ کو جنوری کا پہلا دن ہے۔ اگر جیتے ہیں تو دیکھ لیں گے کہ کیا ہوا۔ تم اس خط کا جواب لکھو اور شتاب لکھو۔ میری جان سرفراز حسین تم کیا کر رہے ہو؟ اور کس خیال میں ہو؟ اب صورت کیا ہے اور آئندہ عزیمت کیا ہے؟ میر اشرف علی صاحب اب دائر سائر تھے۔ پانی پت میں مقیم کیونکر ہو گئے؟ کچھ لکھنے تو میں جانوں۔ میر نصیر الدین کو صرف دعا اور اشتیاقِ دیدار۔

میرن صاحب کہاں ہیں؟ کوئی جائے اور بلا لائے۔ حضرت آیئے سلام علیکم
مزاج مبارک۔ کہئے مولوی مظہر علی نے آپ کے خط کا جواب بھیجا یا نہیں
اگر بھیجا تو کیا لکھا؟ میں جانتا ہوں کہ میر اشرف علی صاحب اور میر سرفراز حسین
کم، اور یہ ستم پیشہ میر مہدی بہت آپ کی جناب میں گستاخیاں کرتے ہیں۔ کیا
کروں میں کہیں اور تم کہیں۔ وہاں ہوتا تو دیکھتا کہ کیونکر تم سے بے ادبیاں
کرسکتے ہیں۔ انشاء اللہ تعالیٰ جب ایک جا ہوں گے تو انتقام لیا جائیگا۔
ہائے ہائے کیوں کر ایک جا ہوں گے۔ دیکھئے زمانہ اور کیا دکھاتا ہے۔ اللہ اللہ اللہ۔

ایضاً

جان غالب اب کے ایسا بیمار ہو گیا تھا کہ مجھ کو خود افسوس تھا۔
پانچویں دن غذا کھائی۔ اب اچھا ہوں تندرست ہوں۔ ذی الحجہ ۱۲۷۶ھ
تک کچھ کھٹکا نہیں ہے۔ محرم کی پہلی تاریخ سے اللہ مالک ہے۔ میر نصیر الدین
آئے کئی بار میں نے اُن کو دیکھا نہیں۔ اب کی بار درد میں مجھ کو غفلت
بہت رہی۔ اکثر احباب کے آنے کی خبر نہیں ہوئی۔ جب سے اچھا
ہوا ہوں سیّد صاحب نہیں آئے۔ تمھاری آنکھوں کے غبار کی وجہ یہ ہے
کہ جو مکان دہلی میں ڈھائے گئے اور جہاں جہاں سڑکیں نکلیں، جتنی گرد
اُڑی اُس کو آپ نے ازراہِ محبت اپنی آنکھوں میں جگہ دی۔ بہر حال اچھے
ہو جاؤ اور جلد آؤ۔ مجتہد العصر میر سرفراز حسین کا خط آیا۔ میں نے میرن صاحب
کی آزردگی کے خوف سے اُس کا جواب نہیں لکھا۔ یہ رقعہ اُن دونوں صاحبوں
کو پڑھا دینا کہ میر سرفراز حسین صاحب اپنے خط کی رسید سے مطلع ہو جائیں
اور میرن صاحب میرے پاس اُلفت پر اطلاع پائیں۔

گزرا ہوا زمانہ

برس کی اخیر رات کو ایک بڈھا اپنے اندھیرے گھر میں اکیلا بیٹھا ہے۔ رات بھی ڈراؤنی ہے اور اندھیری ہے۔ گھٹا چھا رہی ہے۔ بجلی تڑپ تڑپ کر کڑکتی ہے۔ آندھی بڑے زور سے چلتی ہے۔ دل کانپتا ہے اور دم گھبراتا ہے۔ بڈھا نہایت غمگین ہے مگر اُس کا غم نہ اندھیرے گھر پر ہے نہ اکیلے پن پر۔ اور نہ اندھیری رات اور بجلی کی کڑک اور آندھی کی گونج پر، اور نہ برس کی اخیر رات پر۔ وہ اپنے پچھلے زمانہ کو یاد کرتا ہے اور جتنا زیادہ یاد آتا ہے اُتنا ہی غم بڑھتا ہے۔ ہاتھوں سے ڈھکے ہوئے مُنہ پر آنکھوں سے آنسو بھی بہے چلے جاتے ہیں۔

پچھلا زمانہ اُس کی آنکھوں کے سامنے پھرتا ہے۔ اپنا لڑکپن اُس کو یاد آتا ہے جب کہ اُس کو کسی چیز کا غم اور کسی بات کی فکر دل میں نہ تھی۔ روپیہ اشرفی کے بدلے، ریوڑی اور مٹھائی اچھی لگتی تھی۔ سارا گھر ماں باپ بھائی بہن، اُس کو پیار کرتے تھے۔ پڑھنے کے لئے چھٹی کا وقت جلد آنے کی خوشی میں کتابیں بغل میں لئے مکتب چلا جاتا تھا۔ مکتب کا خیال آتے ہی اُس کو اپنے ہم مکتب یاد آتے تھے۔ وہ اور زیادہ غمگین ہوتا تھا اور بے اختیار چلّا اُٹھتا تھا، ہائے وقت، ہائے وقت! ہائے گزرے ہوئے زمانے! افسوس کہ میں نے تجھے بہت دیر میں یاد کیا!!

پھر وہ اپنی جوانی کا زمانہ یاد کرتا تھا، اپنا سُرخ و سفید چہرہ۔ سڈول



سر سید احمد خاں



ڈیل، بھرا بھرا بدن، رسیلی آنکھیں، موتی کی لڑی سے دانت، اُمنگ میں
بھرا ہوا دل، جذباتِ انسانی کے جوشوں کی خوشی اُسے یاد آتی تھی۔
اِس آنکھوں میں اندھیرا چھائے ہوئے زمانہ میں ماں باپ جو نصیحت کرتے
تھے اور نیکی اور خُدا پرستی کی بات بتاتے تھے تو یہ کہتا تھا کہ آہ "ابھی بہت
وقت ہے" اور بڑھاپے کے آنے کا کبھی خیال نہیں کرتا تھا۔ اُس کو
یاد آتا تھا، اور افسوس کرتا تھا کہ کیا اچھا ہوتا اگر جب ہی مَیں اِس وقت کا
خیال کرتا اور خدا پرستی اور نیکی سے اپنے دل کو سنوارتا اور موت کے لئے
تیّار رہتا۔ آہ وقت گزر گیا، آہ وقت گزر گیا، اب پچتائے کیا ہوتا ہے۔
افسوس میں نے اپنے تئیں ہمیشہ یہ کہہ کر برباد کیا کہ ابھی وقت بہت ہے"
یہ کہہ کر وہ اپنی جگہ سے اُٹھا اور ٹٹول ٹٹول کر کھڑکی تک آیا۔ کھڑکی
کھولی، دیکھا کہ رات ویسی ہی ڈراؤنی ہے۔ اندھیری گھٹا چھا رہی ہے۔
بجلی کی کڑک سے دل پھٹا جاتا ہے۔ ہولناک آندھی چل رہی ہے۔
درختوں کے پتّے اُڑتے ہیں اور ٹہنے ٹوٹتے ہیں۔ تب وہ چلّا کر بولا۔
"ہائے، میری گزری ہوئی زندگی بھی ایسی ہی ڈراؤنی ہے، جیسی یہ رات"
یہ کہہ کر پھر اپنی جگہ آبیٹھا۔

اِتنے میں اُس کو اپنے ماں، باپ، بھائی، بہن، دوست آشنا،
یاد آئے۔ جن کی ہڈّیاں قبروں میں گل کر خاک ہو چکی تھیں۔ ماں گویا محبت
سے اُس کو چھاتی سے لگائے آنکھوں میں آنسو بھرے کھڑی ہے۔ یہ کہتی ہوئی
کہ ہائے بیٹا وقت گزر گیا، باپ کا نورانی چہرہ اُس کے سامنے ہے اور اُس میں
سے یہ آواز آتی ہے کہ کیوں بیٹا! ہم تمھارے ہی بھلے کے لئے نہ کہتے تھے۔
بھائی بہن دانتوں میں اُنگلی دئے ہوئے خاموش ہیں اور اُن کی آنکھوں

سے آنسوؤں کی لڑی جاری ہے۔ دوست آشنا سب غمگین کھڑے ہیں اور کہتے ہیں کہ اب ہم کیا کر سکتے ہیں۔

ایسی حالت میں اُس کو اپنی وہ باتیں یاد آئی تھیں جو اُس نے نہایت بے پروائی اور بے مروّتی اور کج خلقی سے اپنے ماں باپ، بھائی، بہن، دوست آشنا کے ساتھ برتی تھیں، ماں کو رنجیدہ رکھنا، باپ کو ناراض کرنا، بھائی بہن سے بے مروّت رہنا، دوست آشنا کے ساتھ ہمدردی نہ کرنا، یاد آتا تھا۔ اور اُس پر اُن گلی ہڈّیوں میں ایسی محبّت کا دیکھنا اُس کے دل کو پاش پاش کرتا تھا۔ اُس کا دم چھاتی میں گھُٹ جاتا تھا۔ اور یہ کہہ کر چلاّ اُٹھتا تھا کہ "ہائے وقت نکل گیا، ہائے وقت نکل گیا، اب کیونکر اِس کا بدلہ ہو۔"

وہ گھبرا کر پھر کھڑکی کی طرف دوڑا اور ٹکراتا، لڑکھڑاتا کھڑکی تک پہنچا۔ اُس کو کھولا اور دیکھا کہ ہوا کچھ ٹھہری ہے اور بجلی کی کڑک کچھ تھمی ہے۔ پر رات ویسی ہی اندھیری ہے۔ اُس کی گھبراہٹ کچھ کم ہوئی اور پھر اپنی جگہ آ بیٹھا۔

اِتنے میں اُس کو اپنا ادھیڑ پنا یاد آیا، جس میں نہ وہ جوانی رہی تھی نہ وہ جوانی کا جوبن، نہ وہ دل رہا تھا اور نہ دل کے ولولوں کا جوش۔ اُس نے اپنی اُس نیکی کے زمانہ کو یاد کیا جس میں وہ بہ نسبت بدی کے نیکی کی طرف زیادہ مائل تھا۔ وہ اپنا روزہ[1] رکھنا۔ نماز[1] پڑھنی۔ حج کرنا۔ زکوٰۃ[1] دینی بھوکوں کو

---

[1] لکھنؤ اور دلّی کی زبان میں اس جگہ جو فرق ہے اُسے اچھّی طرح سمجھ لینا چاہئے۔ لکھنؤ والے مصدر کو خواہ وہ مؤنث اسم کے ساتھ آئے خواہ مذکر کے ساتھ، کبھی مؤنث نہیں بناتے۔ اُسے ہمیشہ ویسا ہی رکھتے ہیں لیکن دلّی والے مصدر میں بھی تذکیر اور تانیث کو کام میں لاتے ہیں۔ مذکر کے ساتھ اصل مصدر اور مؤنث کے ساتھ اُس کا مؤنث جیسے اوپر کی مثالوں میں نماز اور زکوٰۃ کے مؤنث ہونے کی وجہ سے مصدر بھی مؤنث ہو گیا۔ لکھنؤ والے اس جگہ بھی 'پڑھنا' اور 'دینا' لکھتے ہیں۔

کھلانا، مسجدیں اور کنوئیں بنوانا۔ یاد کرکر[1] اپنے دل کو تسلی دیتا تھا، فقیروں اور درویشوں کو، جن کی خدمت کی تھی، اپنے پیروں کو، جن کی بیعت کی تھی، اپنی مدد کو پکارتا تھا۔ مگر دل کی بے قراری نہیں جاتی تھی۔ وہ دیکھتا تھا کہ اُس کے ذاتی اعمال کا اُسی تک خاتمہ ہے۔ بھوکے پھر ویسے ہی بھوکے ہیں۔ مسجدیں ٹوٹ کر کھنڈر رہیں۔ کنوئیں اندھے پڑے ہیں۔ نہ پیر اور نہ فقیر، کوئی اُس کی آواز نہیں سُنتا اور نہ مدد کرتا ہے۔ اُس کا دل پھر گھبراتا ہے اور سوچتا[2] ہے کہ میں نے کیا کیا جو تمام فانی چیزوں پر دل لگایا۔ یہ پچھلی سمجھ پہلے ہی کیوں نہ سوجھی۔ اب کچھ بس نہیں چلتا۔ اور پھر یہ کہہ کر چلا اُٹھا "ہائے وقت، ہائے وقت، میں نے تجھ کو کیوں کھو دیا"

وہ گھبرا کر پھر کھڑکی کی طرف دوڑا۔ اُس کے پٹ کھولے تو دیکھا کہ آسمان صاف ہے۔ آندھی تھم گئی ہے۔ گھٹا کھُل گئی ہے۔ تارے نکل آئے ہیں۔ اُن کی چمک سے اندھیرا ابھی کچھ کم ہوگیا ہے۔ وہ دل بہلانے کے لئے تاروں بھری رات کو دیکھ رہا تھا کہ یکایک اُس کو آسمان کے بیچ میں ایک روشنی دکھائی دی اور اُس میں ایک خوبصورت دُلہن نظر آئی۔ اُس نے ٹکٹکی باندھ کر اُسے دیکھنا شروع کیا۔ جوں جوں وہ اُسے دیکھتا تھا وہ قریب ہوتی جاتی تھی۔ یہاں تک کہ وہ اُس کے بہت پاس آگئی۔ وہ اُس کے حُسن وجمال کو دیکھ کر حیران ہوگیا اور نہایت پاک دل اور محبت کے لہجہ سے اُس سے پوچھا کہ تُم کون ہو؟ وہ بولی کہ "میں ہمیشہ رہنے والی نیکی ہوں۔" اُس نے پوچھا کہ "تمھاری تسخیر کا بھی کوئی عمل ہے؟" وہ بولی "ہاں ہے۔ نہایت آسان پر بہت مشکل، جو کوئی خدا کے

---

[1] کر: اب متروک ہے اس کی جگہ کر کے بولتے ہیں۔ [2] اب سوچتا لکھا جاتا ہے۔

فرض ادا کر کہ انسان کی بھلائی اور اُس کی بہتری میں سعی کرے، اُس کی
مَیں مسخّر ہوتی ہوں۔ دُنیا میں کوئی چیز ہمیشہ رہنے والی نہیں ہے۔ انسان ہی
ایسی چیز ہے، جو اخیر تک[1] رہے گا۔ پس جو بھلائی کہ انسان کے لئے کی جاتی
ہے وہی نسل درنسل اخیر تک چلی جاتی ہے۔ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، اُسی
تک ختم ہوجاتا ہے۔ اُس کی موت اِن سب چیزوں کو ختم کردیتی ہے۔
مادّی چیزیں بھی چند روز میں فنا ہوجاتی ہیں مگر انسان کی بھلائی اخیر تک
جاری رہتی ہے۔ میں تمام انسانوں کی روح ہوں، جو مجھ کو تسخیر کرنا چاہے،
انسان کی بھلائی میں کوشش کرے۔ کم سے کم اپنی قوم کی بھلائی میں،
دل وجان ومال سے ساعی ہو" یہ کہہ کر وہ دُلہن غائب ہوگئی اور بُڈھا پھر
اپنی جگہ آبیٹھا۔

اب پھر اُس نے اپنا پچھلا زمانہ یاد کیا اور دیکھا کہ اُس نے اپنی پچپن
برس کی عمر میں کوئی کام بھی انسان کی بھلائی، اور کم سے کم اپنی قومی بھلائی
کا نہیں کیا تھا۔ اُس کے تمام کام ذاتی غرض پر مبنی تھے۔ نیک کام جو کئے تھے
ثواب کے لالچ اور گویا خُدا کو رشوت دینے کی نظر سے کئے تھے۔ خاص
قومی بھلائی کی خالص نیت سے کچھ بھی نہیں کیا تھا۔

اپنا حال سوچ کر وہ دلفریب دُلہن کے ملنے سے مایوس ہوا۔ اپنا اخیر
زمانہ دیکھ کر آئندہ کرنے کی بھی کچھ اُمید نہ پائی، تب تو نہایت مایوسی
کی حالت میں بے قرار ہوکر چلّا اُٹھا "ہائے وقت، ہائے وقت! کیا پھر
تجھے مَیں بُلا سکتا ہوں۔ ہائے مَیں دس ہزار دینارین[2] دیتا، اگر وقت پھر آتا
اور مَیں جوان ہوسکتا" یہ کہہ کر اُس نے ایک آہ سرد بھری اور بیہوش ہوگیا۔

---

[1] اب آخر استعمال ہوتا ہے۔ [2] اب جمع میں بھی اس موقع پر صرف دینار لکھیں گے۔

تھوڑی دیر نہ گذری تھی کہ اُس کے کانوں میں میٹھی میٹھی باتوں کی آوازآنے لگی۔ اُس کی پیاری ماں اُس کے پاس آکھڑی ہوئی۔ اُس کا باپ اُس کو دکھائی دیا۔ چھوٹے چھوٹے بھائی بہن اُس کے گرد آکھڑے ہوئے، ماں نے کہا کہ "بیٹا کیوں برس کے برس دن روتا ہے؟ کیوں تو بے قرار ہے۔ کس لئے تیری ہچکی بند ہو گئی ہے۔ اُٹھ مُنہ ہاتھ دھو، کپڑے پہن۔ نوروز کی خوشی مَنا۔ تیرے بھائی بہن تیرے منتظر کھڑے ہیں" تب وہ لڑکا جاگا اور سمجھا کہ میں نے خواب دیکھا اور خواب میں بڈھا ہو گیا تھا۔ اُس نے اپنا سارا خواب اپنی ماں سے کہا۔ اُس نے سُن کر اُس کو جواب دیا کہ "بیٹا۔ بس تو ایسا مت کر جیسا اُس پشیمان بُڈھے نے کیا، بلکہ ایسا کر جیسا تیری دُلہن نے تجھ سے کہا"

یہ سُن کر وہ لڑکا پلنگ پر سے کود پڑا، اور نہایت خوشی سے پُکارا کہ "او۔ یہی میری زندگی کا پہلا دن ہے۔ میں کبھی اُس بڈھے کی طرح نہ پچتاؤں گا۔ اور ضرور اُس دُلہن کو بیاہوں گا جس نے ایسا خوبصورت اپنا چہرہ مجھ کو دکھلایا اور ہمیشہ زندہ رہنے والی نیکی اپنا نام بتایا۔ او خُدا! او خُدا! تو میری مدد کر۔ آمین۔

پس اے میرے پیارے نوجوان، ہم وطنو! اور اے میری قوم کے بچّو! اپنی قوم کی بھلائی پر کوشش کرو تاکہ آخیر وقت میں اُس بڈّھے کی طرح نہ پچتاؤ۔ ہمارا زمانہ تو اخیر ہے۔ اب خُدا سے یہ دُعا ہے کہ کوئی نوجوان اُٹھے اور اپنی قوم کی بھلائی میں کوشش کرے۔[1] (سرسید)

---

[1] سرسید نے جتنے مضامین لکھے ہیں وہ اپنے اخبار تہذیب الاخلاق کے لئے۔ تہذیب الاخلاق کے نکالنے کا اصل مقصد صرف یہی تھا کہ مسلمانوں کی ذہنی۔ اخلاقی۔ قومی۔ تجارتی اور تعلیمی حالت کو بلند اور بہتر بنایا جائے۔ اس لئے اُن کے مضامین شروع میں چاہے کیسے ہی ہوں آخر میں آکر وہ ایک واعظ کی طرح اپنے اصل مقصد کا اظہار کر دیتے ہیں۔

کاہلی

یہ ایک ایسا لفظ ہے جس کے معنی سمجھنے میں لوگ غلطی کرتے ہیں۔ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہاتھ پاؤں سے محنت نہ کرنا، کام کاج۔ محنت مزدوری میں چستی نہ کرنا۔ اُٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے میں سستی کرنا کاہلی ہے مگر یہ خیال نہیں کرتے کہ دلی قویٰ کو بیکار چھوڑ دینا سب سے بڑی کاہلی ہے۔

ہاتھ پاؤں کی محنت، اوقات بسر کرنے اور روٹی کما کر کھانے کے لئے نہایت ضروری ہے اور روٹی پیدا کرنا اور پیٹ بھرنا ایک ایسی چیز ہے کہ مجبوری اُس کے لئے محنت کی جاتی ہے اور ہاتھ پاؤں کی کاہلی چھوڑی جاتی ہے۔ اور اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ محنت مزدوری کرنے والے لوگ اور وہ جو کہ اپنی روزانہ محنت سے اپنی بسر اوقات کا سامان مہیّا کرتے ہیں۔ بہت کم کاہل ہوتے ہیں۔ محنت کرنا اور سخت سخت کاموں میں ہر روز لگے رہنا گویا اُن کی طبیعت ثانی ہو جاتی ہے مگر جن لوگوں کو ان باتوں کی حاجت نہیں ہے وہ اپنے دلی قویٰ کو بے کار چھوڑ کر بڑے کاہل اور بالکل حیوان صفت ہو جاتے ہیں۔

یہ سچ ہے کہ لوگ پڑھتے ہیں اور پڑھنے میں ترقّی بھی کرتے ہیں اور ہزار پڑھے لکھوں میں سے شاید ایک کو ایسا موقع ملتا ہوگا کہ اپنی تعلیم کو اور اپنی عقل کو ضرورتاً کام میں لاوے[۱]۔ لیکن انسان اگر اُن عارضی ضرورتوں

---

[۱] اب واؤ کے ساتھ متروک ہے اور اس قسم کے سب لفظ بغیر واؤ کے لکھے جاتے ہیں۔ مثلاً آئے۔ جائے۔ کھائے۔ لائے وغیرہ۔

کا منتظر رہے اور اپنے دلی قویٰ کو بے کار ڈال دے تو نہایت سخت کاہل اور وحشی ہو جاتا ہے۔ انسان بھی مثل اور حیوانوں کے ایک حیوان ہے اور جبکہ اُس کے دلی قویٰ کی تحریک سُست ہو جاتی ہے اور کام میں نہیں لائی جاتی تو وہ اپنی حیوانی خصلت میں پڑ جاتا ہے۔ پس ہر ایک انسان پر لازم ہے کہ اپنے اندرونی قویٰ کو زندہ رکھنے کی کوشش میں رہے اور اُن کو بے کار نہ چھوڑے۔

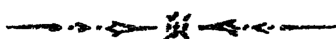
ایک ایسے شخص کی حالت کو خیال کرو جس کی آمدنی اُس کے اخراجات کو مناسب ہو اور اُس کے حاصل کرنے میں اُس کو چنداں محنت و مشقت کرنی نہ پڑے (جیسے کہ ہمارے ہندوستان میں ملکیوں اور لاخراج داروں کا حال تھا) اور وہ اپنے دلی قویٰ کو بھی بے کار ڈال دے تو اُس کا حال کیا ہوگا۔ یہی ہوگا کہ اُس کے عام شوق وحشیانہ باتوں کی طرف مائل ہوتے جاویں گے۔ شراب پینا اور مزیدار کھانا اُس کو پسند ہوگا۔ قمار بازی اور تماش بینی کا عادی ہوگا۔ اور یہی سب باتیں اُس کے وحشی بھائیوں میں بھی ہوتی ہیں، البتہ اِتنا فرق ہوتا ہے۔ وہ پھوہڑ، بدسلیقہ، وحشی ہوتے ہیں اور یہ ایک وضع دار وحشی ہوتا ہے۔ شراب پی کر پلنگ پر پڑے رہنا اور پیچوان کے دُھوئیں اُڑانا اِس کو پسند ہوتا ہے اور جنگل کے ریت پر پڑے رہنا اور ناریل میں تمباکو کے دُھوئیں اُس کو پسند ہوتا ہے۔ پس پیچوان اور ناریل اور بچھونے اور ریت کے فرق سے، کچھ مشابہت میں جو ان دونوں میں ہے، کمی نہیں ہوتی۔

ہم قبول کرتے ہیں کہ ہندوستان میں ہندوستانیوں کے لئے ایسے کام بہت کم ہیں جن میں ان کو قوائے دلی اور قوت عقلی کو کام میں لانے کا

موقع ملے۔ اور برخلاف اِس کے اور ولایتوں میں، اور خصوصاً انگلستان میں، وہاں کے لوگوں کے لئے ایسے موقعے بہت ہیں اور اِس میں بھی کچھ شک نہیں کہ اگر انگریزوں کو بھی کوشش اور محنت کی ضرورت اور اس کا شوق نہ رہے جیسا کہ اب ہے تو وہ بھی بہت جلد وحشت پنے کی حالت کو پہنچ جاویں گے۔ مگر ہم اپنے ہم وطنوں سے یہ کہتے ہیں کہ ہمارے مُلک میں جو ہم کو اپنے قوائے دلی اور قوّت عقلی کو کام میں لانے کا موقع نہیں رہا ہے، اِس کا بھی سبب یہی ہے کہ ہم نے کاہلی اختیار کی ہے۔ یعنی اپنے دلی قویٰ کو بے کار چھوڑ دیا ہے۔ اگر ہم کو قوائے قلبی اور قوّت عقلی کے کام میں لانے کا موقع نہیں ہے تو ہم کو اِسی کی فکر اور کوشش چاہیئے کہ وہ موقع کیونکر حاصل ہو۔ اگر اس کے حاصل کرنے میں ہمارا کچھ قصور ہے تو اِسی کی فکر اور کوشش چاہیئے کہ وہ قصور کیونکر رفع ہو۔ غرض کہ کسی شخص کے دل کو بیکار پڑا رہنا نہ چاہیئے۔ کسی نہ کسی بات کی فکر و کوشش میں مصروف رہنا لازم ہے، تاکہ ہم کو اپنی تمام ضروریات کے انجام کرنے کی فکر اور مستعدی رہے۔ اور جب تک کہ ہماری قوم سے کاہلی یعنی دل کو بے کار پڑا رہنا نہ چھوٹے گا، اُس وقت تک ہم کو اپنی قوم کی بہتری کی توقع کچھ نہیں ہے۔ نہایت حکیمانہ قول ہے کہ ؎

بے کار مباش کچھ کیا کر
گر کر نہ سکے تو کچھ کہا کر

(سرسید)



تعلیم و تربیت

تعلیم و تربیت کو ہم معنی سمجھنا بڑی غلطی ہے۔ بلکہ وہ جُدا جُدا دو چیزیں ہیں۔ جو کچھ کہ انسان میں ہے اُس کو باہر نکالنا انسان کو تعلیم دینا ہے اور اُس کو کسی کام کے لائق کرنا اُس کا تربیت کرنا ہے۔ مثلاً جو قوتیں کہ خدا تعالیٰ نے انسان میں رکھی ہیں اُن کو تحریک دینا اور شگفتہ و شاداب کرنا انسان کی تعلیم ہے اور اُس کو کسی بات کا مخزن اور منبع بنانا اُس کی تربیت ہے۔

انسان کو تعلیم دینا درحقیقت کسی چیز کا باہر سے اُس میں ڈالنا نہیں ہے بلکہ اُس کے دل کے سوتوں کا کھولنا اور اندر کے سرچشمہ کے پانی کو باہر نکالنا ہے، جو صرف اندرونی قویٰ کو حرکت میں لانے اور شگفتہ و شاداب کرنے سے نکلتا ہے اور انسان کو تربیت کرنا، اُس کے لئے سامان مہیا کرنا اور اُس سے کام کا لینا ہے، جیسے جہاز تیار ہونے کے بعد اُس پر بوجھ لادنا اور حوض بنانے کے بعد اُس میں پانی بھرنا۔ پس تربیت پانے سے تعلیم کا بھی پانا ضرور[1] نہیں ہے۔ تربیت جتنی چاہو کرو۔ اور اُس کے دل کو تربیت کرتے کرتے مُنہ تک بھر دو، مگر اس سے دل کی سرچی سوتیں نہیں کُھلتیں، بلکہ بالکل بند ہو جاتی ہیں۔ اندرونی قویٰ کو حرکت دئے بغیر تربیت تو ہو جاتی ہے مگر تعلیم کبھی نہیں ہوتی۔ اس لئے ممکن ہے کہ ایک شخص کی تربیت تو اچھی ہو اور تعلیم بہت بُری۔ یہی ٹھیک ٹھیک حال ہم مسلمانوں کے عالموں اور تربیت یافتہ لوگوں کا ہے کہ تربیت تو نہایت

---

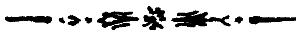
[1] اب ضروری لکھنا چاہئے۔ ضرور اس معنی میں متروک ہے۔

اچھی ہے اور تعلیم کچھ نہیں۔ ظاہر میں دیکھو تو طمطراق بہت کچھ، مگر جب اصلیت ڈھونڈو تو کچھ نہیں۔ بھاری بھرکم تو عمامہ و دستار، جبّہ و کرتہ سے بہت کچھ، مگر دل کی اور اندرونی قویٰ کی شگفتگی دیکھو تو کچھ بھی نہیں۔ نہایت عمدہ قول ہے کہ کتابوں کا پڑھا دینا تو تعلیم کا نہایت ادنیٰ اور سب سے زیادہ حقیر جزو ہے بلکہ اس قسم کے بہت سے پڑھنے سے جس میں اندرونی قویٰ کی تحریک اور شگفتگی نہ ہو، جس قدر دل کے قویٰ کمزور اور ناکارہ ہو جاتے ہیں ایسے اور کسی چیز سے نہیں ہوتے۔ ہم اپنے یہاں کے عالموں کا حال بالکل یہی دیکھتے ہیں کہ اُن کے روحانی قویٰ بالکل نیست و نابود ہو جاتے ہیں۔ اور صرف زبانی بک بک یا تکبّر و غرور اور اپنے آپ کو بے مثل و بے نظیر قابل ادب سمجھنے کے اور کچھ باقی نہیں رہتا۔ زندہ ہوتے ہیں مگر دلی اور روحانی قویٰ کی شگفتگی کے اعتبار سے بالکل مُردار ہوتے ہیں۔ کتابیں پڑھتے ہیں اور جس قدر عمدہ کتابیں افراط سے بہم پہنچیں اُن کو اور زیادہ پڑھتے ہیں اور اُن سے تربیت حاصل کرتے ہیں اور ایسے بیل کے مانند ہو جاتے ہیں جو برابر چرتا ہے اور پھر بھی چراگاہ ہی میں رہنے کی خواہش کرتا ہے۔ پس کتابیں پڑھ لینے سے انسانیت نہیں آجاتی بلکہ وہ کتابی علم خود اُن پر بوجھ ہوتا ہے۔

اس تقریر سے ہمارا مطلب یہ ہے کہ تمام خرابیوں کی جڑ جو ہم پر نازل ہیں، یہی ہے ہم نے اپنے دل کو اور اپنے اندرونی قویٰ کو بالکل خراب کر دیا ہے۔ علم جو حاصل کرتے ہیں وہ بھی بعوض اس کے کہ روحانی قویٰ کو شگفتہ و شاداب کرے، اِن کو پژمردہ کر دیتا ہے۔ اور ہمارے قویٰ کو جو درحقیقت سرچشمے تمام نیکیوں کے ہیں، بالکل کمزور اور

ناکارہ کر دیتا ہے اور ہماری حالت تمام معاملات میں، کیا دین کے اور کیا دُنیا کے، خراب ہوتی چلی جاتی ہے۔ پس ہم کو اپنے پر رحم کرنا چاہئے اور ایسی تعلیم اختیار کرنا چاہئے جو اندرونی قویٰ کو شگفتہ و شاداب کرے اور دل کے سوتوں کو کھول کر سرچشمہ سے پانی باہر نکالے، جس سے ہماری زندگی سرسبز و شاداب ہو۔

(سرسیّد)



ہندو اور مسلمانوں میں ارتباط

جس قدر سوشل برتاؤ اور باہمی محبت و ارتباط ہندو اور مسلمانوں میں ترقی پکڑتا جاوے ہم کو نہایت خوشگوار معلوم ہوتا ہے۔ ہندوؤں کی آریہ قومیں بھی خاص ہندوستان کی رہنے والی نہیں ہیں۔ دوسرے ملک سے آکر ہندوستان میں فتح مندی کے ساتھ آباد ہوئی ہیں اُن کے ہندوستان میں آباد ہونے کو زمانہ کثیر گذر گیا جس کے سبب وہ ہندوستان کے متوطن اور ہندوستان کے رہنے والے ہندو کہلائے۔ مسلمانوں کو بھی ہندوستان میں آئے ہوئے کچھ کم زمانہ نہیں ہوا۔ اُن کو بھی متعدد پُشتیں ہندوستان ہی کی زمین پر گزری ہیں۔ بہت سے ایسے مُسلمان ہیں جن میں آریاؤں کے خون کا بھی میل ہے۔ بہت سے ایسے ہیں جو خالص آریہ کہلائے جاسکتے ہیں۔ صدیاں گزرگئیں کہ ہم دونوں ایک ہی زمین پر رہتے ہیں۔ ایک ہی زمین کی پیداوار کھاتے ہیں۔ ایک ہی زمین کا یا دریا کا پانی پیتے ہیں۔ ایک ہی مُلک کی ہوا کھاکر جیتے ہیں۔ پس مسلمانوں اور ہندوؤں میں کچھ مغائرت نہیں ہے۔ جس طرح آریہ قوم کے لوگ ہندو کہلائے جاتے ہیں، اُسی طرح مسلمان بھی ہندو یعنی ہندوستان کے رہنے والے کہلائے جاسکتے ہیں۔ ہم نے متعدد دفعہ کہا ہے کہ ہندوستان ایک خوبصورت دُلھن ہے اور ہندو اور مسلمان اُس کی دو آنکھیں ہیں۔ اُس کی خوبصورتی اس میں ہے کہ اُس کی دونوں آنکھیں سلامت و برابر رہیں۔ اگر اُن میں سے ایک برابر نہ رہی تو وہ

خوبصورت دُلہن بھینگی ہو جاویگی، اور اگر ایک آنکھ جاتی رہی تو کانی ہو جاویگی۔ ہم دونوں کی سوشل حالت قریب قریب ایک ہی سی ہے، بلکہ بہت سی عادتیں اور رسمیں ہم مسلمانوں میں ہندوؤں کی آگئی ہیں۔ پس جس قدر اِن دونوں قوموں میں زیادہ تر محبت، زیادہ تر اخلاص، زیادہ تر ایک دوسرے کی امداد، بڑھتی جاوے اور ایک دوسرے کو مثل بھائی کے سمجھیں، کیونکہ ہم وطن بھائی ہونے میں تو کچھ شبہ نہیں۔ اُسی قدر ہم کو خوشی ہوتی ہے۔ اِس زمانہ میں تین باتوں سے اِس محبت و اخلاص کا علانیہ ثبوت دیا گیا ہے۔ سب سے اوّل یہ بات ہے کہ اِن دِنوں میں سلطان کی یونان پر فتح ہونے کی اکثر جگہ مسلمانوں نے خوشی کی اور مجلسیں آراستہ کیں، شہر میں چراغاں روشن کئے، سلطان کو مبارکبادی کے تار بھیجے۔ ہم نے سُنا ہے کہ دکن کے ہندوؤں نے بھی اُسی طرح خوشی منائی اور سلطان کو مبارک باد کے تار بھیجے، جو کافی ثبوت دونوں قوموں میں اخوّت کا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ہم نے سُنا ہے کہ بریلی میں ہندو مسلمانوں نے نہایت خوبی سے ایک دوسرے کی محبت کا ثبوت دیا ہے۔ یعنی بقرعید کے روز مسلمانوں نے گائے کی قربانی نہیں کی بلکہ ہندوؤں کی خاطر سے بکرے اور بھیڑوں کی قربانی کی اور ہندوؤں نے بھی اس بات کا خیال اُٹھا لیا کہ کوئی مسلمان گائے کی قربانی کا خیال کرتا ہے یا بکرے بھیڑ کی۔ اور ہندوؤں نے محرّم کے زمانہ میں سبیلیں لگانے کا اور مسلمانوں کے ساتھ غم میں شریک ہونے کا اقرار کیا ہے۔ ہماری بھی مدّت سے یہی رائے ہے کہ اگر گائے کی قربانی ترک کرنے سے آپس میں ہندو اور مسلمانوں کی دوستی اور محبت قائم

ہو تو گائے کی قربانی نہ کرنا اُس کے کرنے سے ہزار درجہ بہتر ہے تیسری
بات یہ ہے کہ سول ڈویژن مانک پور گنج ضلع ڈھاکہ میں ایک مسجد
بنانے کی ضرورت ہے اور اُس مسجد کی تعمیر کے لئے روپیہ جمع کرنا چاہئے۔
اس کے لئے ہندو اور مسلمان دونوں نے شامل ہو کر کمیٹی بنائی ہے اور
ہندو اور مسلمان مل کر اُس کی تعمیر کے لئے چندہ جمع کر رہے ہیں۔
معلوم ہوتا ہے کہ وہاں کے مسلمان زیادہ غریب اور زیادہ ذلیل ہیں۔
اس لئے ہندو اُس مسجد کی تعمیر کے لئے زیادہ کوشش کر رہے ہیں۔ ہم
اس محبت و ہمدردی اور باہمی بھیّا چارہ پر، جو ہندوؤں نے ظاہر کی ہے
دونوں قوموں کو مبارک باد دیتے ہیں۔ ہماری رائے میں جس طرح کہ
اختلاف مذہب جیسا کہ مسلمانوں اور ہندوؤں میں ہے۔ سوشل برتاؤ
اور باہمی محبت و اخلاص اور ایک دوسرے کی ہمدردی کا مانع نہیں ہو سکتا؛
اُسی طرح پولیٹکل امور کا اختلاف بھی سوشل برتاؤ اور باہمی محبت و
اخلاص اور ایک دوسرے کی ہمدردی کا مانع نہیں ہے۔ اس زمانہ
میں ہندو اور مسلمان دونوں گورنمنٹ انگلشیہ کی رعایا ہیں۔ اور
اُس کے سایۂ عاطفت میں ہر قسم کی خوشی اور امن و آزادی سے بسر
کرتے ہیں لیکن اس میں کچھ شبہ نہیں کہ دونوں قوموں کے باہم پولیٹکل
امور میں اختلاف رائے ہے۔ ہندو اُس پولیٹکل پالیسی کے طرفدار ہیں
جو کانگرس کے اعلےٰ ممبروں یا اُس کے حامیوں اور طرفداروں کی ہے۔
اور جس کا ہر سال مختلف مقامات میں کانگرس کے نام سے اعلان
کیا جاتا ہے، اور اُس پر زور دیا جاتا ہے۔ مسلمان اُس پالیسی کے
برخلاف ہیں۔ لوگ اُن پر اتہام لگاتے ہیں کہ گورنمنٹ کے خوشامدی

ہیں۔لیکن یہ اتہام غلط ہے بلکہ مسلمانوں کے نزدیک مُلک کے انتظام اور امن میں اُس پالیسی سے خلل پڑنے کا اندیشہ ہے اور کسی طرح وہ پالیسی ہندوستان کی حالت کے مُناسب نہیں ہے۔پس اس اتحاد یک جہتی سے جو اس وقت ہندوؤں نے مسلمانوں کے ساتھ ظاہر کی ہے، اگر یہ مقصود ہو کہ مسلمان بھی ہندوؤں کے ساتھ کانگرس میں اور اُن کی پالیسی میں شریک ہوجائیں گے تو ہمارے نزدیک اس مقصد کا حاصل ہونا محالات سے ہے، اور مُلک کے انتظام اور امن میں نہایت خلل ڈالنے والا ہے۔گو بعض ناعاقبت اندیش اور امورِ مملکت سے ناواقف اور ناشدنی باتوں پر یقین کرنے والے مسلمان ہندوؤں کی پالیسی میں شریک اور کانگرس کے جلسوں میں شامل ہوجاویں مگر عموماً مسلمان اُس میں شریک نہیں ہوسکتے۔ بلاشُبہ ہم یہ چاہتے ہیں کہ جس طرح ہم اختلاف مذہب سے قطع نظر کرکے ہندو مسلمانوں میں دوستی و محبت و یگانگت اور آپس میں ہمدردی کا برتاؤ چاہتے ہیں۔اُسی طرح پولٹیکل اختلاف رائے سے بھی قطع کرکے سوشل امور میں باہم دوستی و محبت و ہمدردی و بھائی بندی کا برتاؤ چاہتے ہیں، اور ہم یقین کرتے ہیں کہ اس زمانہ میں جو غیر معمولی طریقہ پر ہندوؤں نے مسلمانوں کے ساتھ بھائی بندی و ہمدردی کا اظہار کیا ہے وہ ایک دھوکا مسلمانوں کو کانگرس میں شامل کرنے کا نہیں ہے، بلکہ سچّی بھائی بندی۔سچّی ہمدردی اور سچّی ہموطنی کا سبب ہے اور ہم خدا سے دعا کرتے ہیں کہ ایسا ہی ہو۔اور ہم دونوں قومیں نہایت محبّت و اخلاص سے گورنمنٹ انگلشیہ کے سایۂ عاطفت

میں اپنی زندگی نہایت وفاداری سے بسر کریں اور ملکہ معظمہ وکٹوریہ قیصر انڈیا کی سلامتی اور درازی سلطنت کی دعا کرتے رہیں جس کے بے نظیر سلطنت کے ساٹھویں سال جلوس کا عنقریب جشن ہونے والا ہے۔

(سرسید)

خطوط سرسیّد
(وقار الملک کے نام)

عزیزی ومکرمی نواب انتصار جنگ بہادر آپ کا عنایت نامہ رجسٹری شدہ پہنچا۔ باعث افتخار ہوا۔ آپ کی عادت ہمیشہ بے فائدہ طول نویسی کی ہے۔ اسی سبب سے اِس خط کو بھی غیر ضروری طول دیا ہے۔ اس لئے میں نے آپ سے یہ خواہش نہیں کی کہ آپ اپنی رائے کے برخلاف رائے دیں۔ بے شک آپ کو کیفیات سے اطلاع نہیں ہے اور اس لئے غلط رائے قائم کی ہے۔ اگر آپ کو کچھ اطلاع ہے تو اس سے زیادہ اطلاع نہیں ہے جیسے کہ آپ کو شراب اور اُس کے نشے سے لفظی اطلاع ہے اور کیفیت سے اطلاع نہیں۔ پس اگر آپ کو میری دیانت پر جو یہ لفظ جامع جمیع الفاظ ہے، طمانیت ہوتی تو آپ یقین کرتے کہ مشکل مرحلے کے اختیار کرنے کے لئے کوئی ایسا امر درپیش ہے جس کے سبب یہ طریقہ اختیار کیا ہے۔ اس امر کے لئے مجبوراً قبول کرنے کو بھی مَیں نے آپ سے کبھی خواہش نہیں کی۔ جب مجھ کو یقین تھا کہ آپ خُدا کے الہام پر بھی اپنی رائے سے منحرف ہونے والے نہیں ہیں جیسا کہ مَیں نے خود آپ کو لکھا تھا تو کوئی توقع برخلاف اس کے اگر میں کرتا تو میری حماقت تھی۔ مَیں کسی شخص سے جس نے مخالف رائے دی ہے رنجیدہ نہیں ہوا۔

بجز اُن لوگوں کے جنھوں نے مخالفت کا طریقہ اختیار کیا۔ اُن میں سے میں
صرف اُن لوگوں سے جن کو مجھ سے بھی کچھ کم ارتباط نہ تھا اور وہ ناراضی
صرف تین شخصوں پر منحصر ہے۔ مولوی م۔ ک۔ خواجہ ی۔ م۔ خ۔ ان سے
بار ہا کہا کہ تمھاری جو رائے ہو لکھدو مگر مخالف پارٹی قائم کرنے اور علانیہ
مخالفت کا طریقہ اختیار کرنے میں کوشش مت کرو اور اس میں شریک مت ہو۔
جب اُنھوں نے نہیں مانا اور کیا جو کچھ کیا۔ مَیں نے اُن سے صاف کہدیا کہ
مثل ایسے شخصوں کے جن سے کوئی خاص دوستی یا راہ ورسم نہ ہو مَیں آپ سے
ملوں گا۔ آپ کا ادب و تعظیم بجا لاؤنگا۔ مگر مجھ سے اور آپ سے دوستی کی
راہ ورسم نہیں ہے۔ میری عادت کسی سے منافقانہ ملنے کی نہیں ہے۔ پس
مجھ سے اور آپ سے مطلق دوستی نہیں ہے اور نہ میں آپ سے دوستی کی راہ ورسم
رکھنا چاہتا ہوں آپ نے کوئی کام ایسا بلا شبہہ نہیں کیا مگر اس میں کچھ شک نہیں
ہے کہ اگر کوئی میرا مخالف ہوتا (نہ مخالف رائے) اور جس کے دل میں نہایت
کینہ ہوتا وہ بھی اس سے زیادہ میری نسبت نہ لکھ سکتا تھا جس قدر آپ نے
تحریر فرمایا ہے۔ صرف مَیں ہی نہیں ہر شخص کو تعجب ہے۔ خود ڈپٹی صاحب
نے اور مولوی س۔ خ کی پارٹی نے فرمایا کہ سیّد صاحب مولوی س۔ خ
کے چند لفظ لکھنے سے ناراض ہو گئے تھے مگر مولوی مشتاق حسین نے جو
مولوی س۔ خ کے مقابلہ میں بہت زیادہ سخت اور اُن کو خود غرض وغیرہ
وغیرہ بتایا ہے تو اُن سے کچھ نہیں کہتے۔ روپیہ کے سبب سے اور اس ڈر
سے کہ مشتاق حسین جاگیر ضبط نہ کرا دیں، اُن کی خوشامد ہی کرتے رہیں گے۔
لعنۃ اللہ علی وجھھم بل علی خیالھم وسوء ظنھم۔ میں خود حیران ہوں
کہ آپ کو کس چیز نے برانگیختہ کیا ہے جو یہ طریقہ اظہار رائے کا اختیار کیا۔

گو تم نے بالکل نیک نیتی برتی ہو تو وہ معاملہ خدا سے ہے مگر دنیا میں تو کوئی شخص بھی اُس کو بجز کینہ کے اظہار کے اور کچھ تصور نہیں کرسکتا۔ خود مولوی س۔ خ نے لوگوں سے کہا تھا کہ جب مشتاق حسین کی رائے آوے گی تو حقیقت کھُلے گی۔ یہ نہیں معلوم کہ اُن کا مقصد میری حقیقت کھُلنے سے تھا یا آپ کی۔ مَیں اس بات کو ہرگز دل میں رکھنا نہیں چاہتا کہ بے شک آپ نے نہایت نامناسب طریقہ اختیار کیا اِس کا کوئی سبب ہوا گر مَیں نے پرائیوٹ خط میں مہدی علی کو لکھا تھا کہ تم خط نواب انتصار جنگ کو دکھلادو یا مولوی س۔ خ کو بھیجدو تو میری صاف دلی پر دال تھا۔ اِس لکھنے سے وہ خط پبلک نہیں ہوسکتا اور کوئی حق اُن کو نہیں تھا کہ اُس کو چھاپ کر مشتہر کرتے اور اس طریقے پر جس سے بعوض اس صاف دلی کے کوئی ورجہ میری بدنیتی بے ایمانی خود غرضی کا باقی نہیں رہتا۔ آپ کو یہ باتیں اپنی تحریر میں نہ دکھائی دیتی ہوں گی مگر تمام عالم کو دکھائی دیتی ہیں۔ کوئی دھمکی نہیں ہے ایک قدرتی اور نیچرل بات ہے کہ اگر مدرسہ کے کاموں کے انجام میں مجھ سے اس قسم کی مخالفت کی جائے۔ خود میرا شوق اور میری کوشش اس میں باقی نہیں رہ سکتی۔ اگر مَیں چاہوں بھی تو مجھ سے نہیں ہوسکتی اور اُس کا لازمی نتیجہ مدرسہ کی بربادی ہے۔ اگر بدبختی سے امر متنازعہ کی طرف مجاری ہو جاتی تو یقیناً مجھ کو مدرسہ سے علیحدہ ہونا پڑتا۔ میرا دل ہی اُس کام پر نہ رہتا بلکہ ایسے واقعات پیش آتے کہ مجھ سے مدرسہ کو قائم رکھنا محالات سے ہوتا۔ پس فرض کیجیے کہ ایک طرف تو میری خودغرضی سید محمود کے مقرر کرنے کی تھی اور ایک طرف مدرسہ کی نفس بربادی تھی۔ جو شخص نہایت ایمانداری سے قوم کا بہی خواہ تھا۔

اِن دونوں بلاؤں میں کس بلا کو اختیار کرنا قوم کے حق میں بہتر ہوتا۔
مَیں کامل یقین کرتا ہوں اور پورے ایمان سے کہتا ہوں کہ تم نے غلطی
کی ۔ قیامت میں خدا کے سامنے، رسول کے سامنے کہوں گا کہ اے
میرے دادا رسول خُدا مَیں نے بغیر کسی غرض دینی و دُنیوی کے تیری
اُمّت کی بھلائی کی کوشش میں کوئی درجہ باقی نہ رکھا تھا۔ جن لوگوں
نے اِس کو برباد کرنا چاہا منجملہ اُن کے ایک یہ نواب انتصار جنگ ہیں ۔
آپ کہیئے گا کہ مَیں نے نہایت نیک نیتی سے کیا تھا۔ خدا یقینی آپ کو
معاف کریگا۔ گو میری اور میرے دادا کی تشفّی نہ ہو گی ۔ باللہ نہ ہو گی ثم باللہ
نہ ہو گی ۔ یہ میری رائے ہے آپ کی نسبت ۔ اِس وقت تک آپ نے
جو کیا مجھ کو یقین ہے کہ آپ نے مولوی س ۔ ح کے سبب سے کیا ۔
اور یہ کسی طرح میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ نے میرے ساتھ کوئی کینہ دیرینہ
نکالا ہے ۔ بجز غلطی اور نا عاقبت اندیشی اور غلط دینداری کے اور کوئی سبب
نہیں ہے ۔ پھر آپ سے قطع ملاقات، جب آپ علی گڑھ میں آویں کیا
وجہ اور اگر میرے کلبہ احزان کو قدوم سے منوّر کرنا چاہیں تو مجھے کیوں
مضائقہ ہوگا بلکہ خوشی ہو گی ۔ بہت سے بہت آپ کی نسبت یہ خیال
کر سکتا ہوں کہ بہت سے لوگوں نے دانستہ و بدنیتی سے مجھے بُرا بھلا
کہا ہے ۔ آپ نے نادانستہ اور نیک نیتی سے ۔ میرا کلبۂ احزان موجود
ہے ۔ جب آپ چاہیں تشریف لاویں ۔ پھر اِس خط میں بھی آپ نے
بے فائدہ بحث کی ہے ۔ مَیں اُس کا کچھ جواب دینا نہیں چاہتا ۔ بجز اِس کے آپ
کی رائے غلط اور آپ کی پیشین گوئیاں سب غلط ۔ آپ کے خیالات غلط، جو کچھ
آپ نے فرض کر لیا ہے سب غلط ہے ۔ پھر اُن تقریروں کے اعادہ کرنے سے

کیا نتیجہ ؟ اِس واقعہ کی یادگار میں مکان بنانے کی تجویز مجھ کو بھی نہایت پسند ہے۔ آپ ضرور کوشش کیجئے گا۔ اُمید ہے کہ جو واقع ہونا تھا ہو لیا۔ جو آپ کو کرنا تھا آپ نے کر لیا۔ آب اُس کو چھوڑ دینا چاہیئے اور اعادۂ معذرت یا دلیل سے قایل یا ساکت کرنے کی کچھ ضرورت نہیں ہے۔ والسّلام۔

خاکسار

سیّد احمد۔ علی گڈھ۔ ۲ر نومبر ۱۸۸۹ء

ایضاً

عزیزی و مکرمی نواب وقار الملک۔ آپ کا عنایت نامہ پہنچا۔ آپ کی علالت اور ضعف طبع کا درحقیقت نہایت افسوس ہے۔ زیادہ افسوس یہ ہے کہ کام کرنے سے آپ کو مُہلت نہیں ہوتی۔ آپ کے عنایت نامے سے جس کے ساتھ نواب عماد الملک اور نواب محسن الملک بھی متّفق ہیں۔ مجھے بھی اتفاق ہے۔ زیادہ عمدہ بات یہ ہے کہ معاملہ یکسو ہو گیا۔ اب اخیر فیصلہ متّفق علیہ یہ ہے کہ اگر حضور ایڈریس کا لینا اور ڈیپوٹیشن کا پیش ہونا منظور فرماویں تو ہم سب آویں گے، ورنہ نہ آویں گے۔ میں بھی اس فیصلہ کو پسند کرتا ہوں۔ ہم کو بھوپال بھی جانا ہے اور یہ تجویز تھی کہ حیدر آباد جاتے ہوئے جاویں گے۔

چونکہ ہم کو بہر حال بھوپال جانا ہے۔ پس قطع نظر اس کے کہ حیدر آباد جانا ہو یا نہ ہو، ہم بھوپال جانے کی تاریخ مقرر کرتے ہیں جو غالباً عشرہ محرّم کے بعد کی ہوگی۔ پس اگر آپ کا تار حسب مراد آیا تو حیدر آباد چلے آویں گے ورنہ بھوپال سے اپنے گھر لوٹ آویں گے۔ ما بخیر شما بہ سلامت۔

مگر آپ کا تار ہست یا نیست کا جس قدر جلد ممکن ہو آنا چاہیئے۔ میں اُس کے انتظار میں یہاں چند روز مقیم رہوں گا۔ اگر صرف بھوپال جانا ہوا تو ہم کو زیادہ انتظام کی ضرورت نہ ہوگی، اور اگر حیدر آباد آنا پڑا تو زیادہ انتظام کی ضرورت پڑے گی۔ پس تار کے بھیجنے کی جس قدر جلد ممکن ہو کوشش کرنی چاہیئے۔ نواب عماد الملک کوئی دقیقہ کوشش کا جو اُن کی قدرت میں ہوگا، ہرگز فروگذاشت نہ کریں گے۔ مگر احتیاطاً آپ کو لکھتا ہوں کہ اگر بالفرض حضور ڈیپوٹیشن کا اور ایڈریس پیش ہونا منظور فرمالیں تو ایڈریس کی تیاری آپ اپنے ذمہ رکھیں۔ ایڈریس کا مسودہ لکھوائیں، اُس کو خوش خط عمدہ کاغذ پر لکھوائیں، طلائی کام بنوائیں۔ چاندی کا بکس جس قیمت کا آپ مُناسب سمجھیں بمبئی سے منگوائیں۔ غرضکہ سب چیز مرتّب ہو کہ ہم کو وہاں پہنچکر صرف دستخط کرنے باقی رہ جائیں کیونکہ ہم کو ان سب کاموں کے انجام کی خصوصاً ایسی حالت میں کہ ہم کو جلد بھوپال جانا بہرحال لازم ہے، فرصت نہیں ہے اور اُمور مذکورہ بالا کا انجام ہم سے غیر ممکن ہوگا۔ بھوپال میں ہم کو معلوم نہیں کہ کیا ہوگا۔ آپ کو معلوم ہے کہ بھوپال اب تک ہمارے لئے کوہ قاف رہا ہے۔ اس وقت صرف یہ امر پیش آیا ہے کہ ایک دوست نے بھوپال سے لکھا کہ سفر حیدر آباد میں آپ کو بھوپال آنا چاہیئے۔ اور اس باب میں منشی محمد امتیاز علی صاحب کو آپ لکھیئے۔ میں نے ایک دو حرفی اور الگھ طرز کا خط منشی محمد امتیاز علی صاحب کو لکھا جس کا پہلا فقرہ یہ تھا کہ ہم کو بھوپال میں گھُسنے کی اجازت ہو سکتی ہے الخ اُس کے جواب میں منشی محمد امتیاز علی صاحب کا مختصر یہ خط آیا ہے "میں اپنی خوش نصیبی پر فخر کروں گا اگر بھوپال میں تشریف لا کر کچھ بھی قیام فرمائیں گے۔ بلاشک مجھ کو حیرت ہوگی اگر آپ حیدر آباد کو تشریف

لے جاویں اور بھوپال کو اپنی تشریف دہی سے سرفراز نہ فرماویں۔ حضور سرکار عالیہ سے میں نے ذکر کردیا ہے، لیکن دیگر رؤسا و عمائد ملک سے مجھے کچھ بھی اُمید نہیں،" پس ہم نہیں جانتے کہ وہاں کیا ہوگا۔ بہرحال ہم نے بھوپال جانے کا اقرار کرلیا ہے اور وہاں انشاء اللہ تعالیٰ ضرور جاتے ہیں۔ خواہ حیدرآباد آنا ہو یا نہ ہو۔ بھوپال سے میرے آنے کی خبر سُن کر چند عمائد بھوپال کے چند خط آئے ہیں جو بہت زیادہ عنایت و مہربانی اور اخلاق میرے ساتھ کرنی چاہتے ہیں مگر وہاں کا حال مجھ کو معلوم نہیں اور مَیں نہیں سمجھتا کہ مجھ کو وہاں کیا طریقہ اختیار کرنا ہوگا۔ اس قدر ضرور لازم ہوگا کہ جناب بیگم صاحبہ کی مرضی کے خلاف کوئی کام نہیں کرسکنے کا۔ حالانکہ میری حیثیت بھوپال ہو یا حیدرآباد ایک سائل کی ہے۔ سائل کا ہر ایک سے سوال کرنا اُس کا پیشہ ہے۔ اندرونی معاملات سے اُس کو کیا سروکار ہے ایک مختصر بات اور ہے کہ حیدرآباد آنا مشتبہ ہے اور جانب عدم زیادہ راجح معلوم ہوتا ہے۔ پس اب آسمان منزل کا چندہ پورا کرنے کی زیادہ کوشش فرماویں اور جلد بھیجیں، کیونکہ روپیہ کی ہم کو تنگی ہوگئی ہے۔ آسمان منزل کرسی تک تیار ہوگئی ہے۔ نہ صرف آسمان منزل کا کرسی تک بلکہ کلب تک اُس طرف کی لین کا کرسی تک بنانا لازم تھا۔ اب ممکن ہے کہ کرسی پر سے صرف آسمان منزل عمارت چلی جاوے مگر کُل لین کو کرسی تک بنانا لازم تھا۔ اگر آنا ہوا تو وہ نقشہ جس پر آسمان منزل بنی شروع ہوئی ہے ساتھ لیتا آؤنگا۔

یہ خط بجنسہ نواب عمادالملک اور نواب محسن الملک کو بھی دکھا دینا۔ والسلام

خاکسار۔ سیّد احمد

الہ آباد۔ ۱۳ر جولائی ۱۸۹۱ء



ڈاکٹر نذیر احمد

ابن الوقت کا صلۂ خیر خواہی

"مولانا نذیر احمد کی ایک مشہور تصنیف "ابن الوقت" ہے جس کے مشہور ہیرو ابن الوقت نے غدر کے زمانے میں ایک انگریز نوبل صاحب نامی کی جان بچائی۔ اُنھوں نے رفتہ رفتہ اُس سے اتنا اثر لیا کہ اُس کی وضع قطع اختیار کر لی۔ یہ مضمون اُس وقت کے حالات بیان کرتا ہے جب غدر ختم ہو گیا اور سرکار برطانیہ کی طرف سے خیر خواہوں کو انعام تقسیم ہوئے"

امن عام کی منادی گلی گلی اور کوچے کوچے پھرنے لگی اور معلوم ہوا کہ ملکۂ معظمہ نے کمپنی سے ملک نکال کر اپنے اہتمام میں لیا، اور بڑی دھوم کا جشن ہونے والا ہے۔ کل جشن ہوگا اور نوبل صاحب کی کچھ خبر نہیں۔ کوئی چار گھڑی دن رہتے رہتے کمشنری کا چپراسی ابن الوقت کے نام کا ایک لفافہ لایا۔ شرکت جشن کے بلاوے کا خط تھا۔ ابن الوقت جی ہی جی میں بہت زچ ہوا کہ مجھ کو انگریزی دربار میں کبھی جانے کا اتفاق ہوا نہیں۔ حکام میں کسی سے معرفت نہیں۔ کیا نوبل صاحب کو ایسے ہی وقت میں مجھے چھوڑ کر جانا تھا۔ بارے کشاں کشاں گیا تو نوبل صاحب کو موجود پایا۔ آج پہلا دن تھا کہ ابن الوقت نے نوبل صاحب کو اُن کی اصلی

شان میں دیکھا۔ بیسوں انگریز اور ہندوستانی رئیس اُن کو گھیرے ہوئے
تھے اور نوبل صاحب دربار کے اہتمام میں اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے
اِدھر دوڑے دوڑے پھر رہے تھے۔ تھوڑی دیر تک تو ابن الوقت کو انھوں
نے دیکھا تک نہیں، مگر جب اُن کی نظر پڑی فوراً اُس کے پاس آکر
ہاتھ ملانے کے بعد کہنے لگے۔ "میں رات کے دس بجے آیا۔ اِس وقت
مجھ کو آپ سے بات کرنے کی مطلق فرصت نہیں۔ وہ فلاں نمبر کی کرسی
آپ کی ہے، وہاں بیٹھئے۔ آج (ذرا سوچ کر) بلکہ کل بھی میں آپ سے
نہیں مِل سکوں گا۔ پرسوں نو بجے سے گیارہ بجے تک جس وقت آپ کا
جی چاہے آپ مجھ سے ٹامسن صاحب کی کوٹھی پر مِل سکتے ہیں۔" ابن الوقت
نے شاہی دربار بہتیرے دیکھے تھے۔ اُن میں ان گئے گذرے وقتوں
میں رونق کہو، شان کہو، صرف درباریوں کے زرق برق کی تھی۔ وہ
بھی پُرانی جامہ واریں، دقیانوسی پشمینے۔ اِس دربار میں سارے دربارِ شاہی
کے مول کا تو ایک قالین ہوگا اور شامیانے اور خیمے اور میز کرسی اور
جھاڑ فانوس اور تصاویر اور اسباب آرائش کا تو کون اندازہ کرسکتا تھا؟
ابن الوقت نے آج جانا کہ ساری رونق سادگی اور صفائی میں ہے۔
غرض شاہی اشتہار پہلے انگریزی اور پھر اردو میں پڑھا گیا۔ میدان
دربار اور چھاؤنی اور قلعے سے تہری شاہی سلامی سر ہوئی۔ انگریزی باجے
بجنے لگے۔ نذریں گزرنی شروع ہوئیں۔ اب خیر خواہانِ سرکار کا نمبر آیا۔
ابن الوقت اپنے دل میں اپنی ہی خیر خواہی پر بڑا نازاں تھا۔ اب
معلوم ہوا کہ خاص شہر کے خیر خواہوں کی فہرست میں اُس کا نمبر
(۱۲۵) ہے۔ بہر کیف جب ابن الوقت کی نوبت آئی اور اُس کا

نام پکارا گیا تو صاحب کمشنر نے اُس کو سامنے کھڑا کر کے اپنے ہاتھ سے
نادان سنگھ جاٹ باغی زمیندار ضلع گوڑگانوہ کے علاقۂ منضبط میں سے
موضع کھیر کا پور (خیر خواہ پور) کی سند زمینداری حوالے کی اور نوبل صاحب
نے کمشنر صاحب کے پیچھے سے گردن نکال کر اشارے سے وہیں مبارکباد دی۔
ابن الوقت کی خیر خواہی کا چرچا تو اُسی دن سے لوگوں میں ہونے لگا تھا
جس دن کہ دلی فتح ہوئی۔ آج کے دربار نے اُس کو اور بھی مشتہر کر دیا۔
اور معرفت قرابت کے لوگ جو ہنوز شہر کے باہر خانہ بدوش پڑے
پھرتے تھے، آسرا پا کر کچھ تو سُننے کے ساتھ لوٹ آئے اور کچھ لوٹنے کے
سامان کرنے لگے۔ مگر ابن الوقت عجب کھرّے، روکھے، کھُردرے،
اکھڑّ، انگریزی مزاج کا آدمی تھا کہ یوں بے غرض اُس سے ملو، ملاقات
کرو۔ خوش گپ۔ خوش مزاج، خوش صحبت، اور حرف مطلب
زبان پر آیا نہیں اور اُس نے دوٹوک ٹکا سا جواب پتھر کی طرح مُنہ پر
کھینچ مارا۔ نہیں، اگر سیدھی طرح سے لوگوں سے کہہ دیا کرتا کہ انگریزوں
کو معاملے مقدمے میں سفارش کی چڑ ہوتی ہے، یا میں صاف طور پر سفارش
کرتے ہوئے ڈرتا ہوں، یا موقع پاؤں گا تو کلمۃ الخیر سے دریغ نہیں کروں گا
تو شاید لوگ اُس سے اس قدر بے دل نہ ہوتے، مگر اُس کا تو حال یہ تھا
کہ کسی نے پُٹھے پر ہاتھ رکھا اور اُس نے دولتیاں جھاڑنی شروع کر دیں۔
اگرچہ ابن الوقت کی کج مداراتی سے لوگوں کے دلوں میں اُس کی طرف
سے نفرت پیدا ہو گئی تھی، مگر اپنی غرض کو اُس کا پیچھا نہیں چھوڑتے تھے۔
اور کچھ نہیں تو اتنی ہی بات کے بہانے سے گھڑی دو گھڑی کو آ بیٹھتے
کہ آپ نے تو غضب ہی کی جرأت کی۔ ایسی شورش میں انگریز کو

میگزین سے اُٹھا لائے اور گھر میں پناہ دی۔ مُنہ پر کہنا تو خوشامد ہے مگر سچ تو یہ ہے کہ رستم کو بھی مات کیا۔ **دوسرا** "خیر بہادری تو بہادری کمال تو یہ تھا کہ ناف شہر میں مجمع مجاہدین یعنی خانقاہ کے زیر سایہ انگریز چھپا رہا اور کسی کے فرشتوں کو خبر نہ ہوئی" **تیسرا** "بھلا انگریزوں کی قدردانی کو تو ذرا ملاحظہ کیجئے کہ اس جان جوکھم کے صلے میں دیا تو کیا دیا، تین ہزار کی زمینداری، اے جناب یہ ملک کے بخش دینے کے کام ہیں۔ ہائے آج کو شاہ جہاں ہونا تھا"۔ **چوتھا**۔ "اجی ابھی کیا خبر ہے۔ انگریزوں کے یہاں زمین کے دینے کا دستور نہیں، مگر ڈپٹی کر دیں۔ صدر اعلیٰ کر دیں۔ کابل میں سفیر یا کسی ریاست میں وزیر بنا کر بھیج دیں، جو چاہیں سو کر سکتے ہیں اور میرا دل گواہی دیتا ہے کہ کریں گے۔ میں آپ کو دکھا دونگا"

کھُلی خوشامد ہوتی تو ابن الوقت بھی ایسا نرا احمق نہ تھا کہ سُن کر اظہار بشاشت کرتا۔ مگر عیّار لوگ دوشالوں میں لپیٹ لپیٹ کر جوتیاں مارتے تھے۔ اور یہ جھانسے میں آکر فخر کے طور پر ایک ایک کے آگے غدر کی حکایتیں بیان کرکے داد چاہتا تھا۔ جب لوگ اس کو بھرّے پر چڑھا لیتے تو باتوں ہی باتوں میں یہ بھی پوچھتے "کیوں صاحب، پھر وہ انگریز کپڑے کیسے پہنتا تھا؟

ابن الوقت۔ "جب صاحب کو ہم لاشوں میں سے اُٹھا کر لائے تو اُن کے کپڑے تمام خون میں لت پت تھے۔ صاحب کو اپنے تن بدن کی مطلق خبر نہ تھی، اور اُس وقت تک ہم میں سے کسی کو معلوم نہیں کہ کہاں کہاں زخم لگے ہیں۔ جو کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ بہتیرا چاہا کہ چیر کر الگ کر دیں مگر کپڑے اس بلا کے ڈھسٹے تھے کہ پھاڑے نہیں پھٹتے تھے۔

ہار کر قینچی سے کترے۔ پھر جب تک صاحب ہمارے گھر رہے، یہی ہم لوگوں کی طرح کے ہندوستانی کپڑے پہنتے رہے۔ مگر طنزاً نہیں، بلکہ نصیحتاً اکثر کہا کرتے "افسوس ہندوستان کے لوگ عقل سے مطلق کام نہیں لیتے۔ ایک کپڑے ہم لوگ پہنتے ہیں کہ برسوں پھٹنے کا نام نہیں جانتے اور ایک کپڑے یہ ہیں کہ پہنے اور کھسکے، ایسے نازک اور مہین کپڑے عورتوں کی زیب و زینت کے لئے زیادہ مُناسب ہیں۔ مردوں کو خدا نے اسی غرض سے زیادہ توانائی دی ہے کہ ان کو محنت اور مشقت کرنی ہے۔ ہندوستانیوں کا لباس اُن کی کاہلی اور آسائش طلبی کی دلیل ہے۔ میں دیکھتا ہوں تو اس لباس میں چستی اور چالاکی باقی نہیں رہ سکتی۔"

ہم نشین۔ بھلا صاحب اُن کے کھانے کا آپ نے کیا انتظام کیا تھا؟"

ابن الوقت "انتظام کیا کرنا تھا، جو کچھ گھر میں پکتا تھا صاحب بھی کھا لیا کرتے تھے۔ البتہ اتنا اہتمام کرنا پڑتا تھا کہ اُن کے کھانے میں مرچ نہیں ڈالی جاتی تھی۔ ایک نمک دان میں پسا ہوا نمک، دوسرے میں کالی مرچیں اُن کے لئے الگ لگا رکھتے تھے۔ ہندوستانی کھانوں میں پلاؤ، کباب، سموسے، فیرینی، ہلکی ہلکی مٹھائیاں زیادہ رغبت سے کھاتے تھے۔"

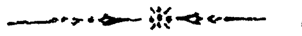
ہم نشین "آپ نے اُن کے برتن الگ کر دئے ہوں گے"؟

ابن الوقت۔ بھائی سچی بات تو یہ ہے کہ ہم نے تو برتن بھانڈا کچھ الگ ولگ کیا نہیں۔ کھانا ہمارا، برتن ہمارے، پکانے والے ہم، پھر الگ کرنے کی وجہ"؟

ہم نشین "آخر وہ تھا تو انگریز"

ابن الوقت ۔ انگریز تھا تو ہونے دو ۔ کھانے میں تو کوئی حرام چیز نہیں ہوتی تھی"

ابن الوقت نے اس بات کو ذرا زور سے کہا تو ہم نشین سمجھ گیا کہ میرا کہنا ناگوار طبع ہوا ۔ بے چارہ تھا ابن الغرض، دم بخود ہو کر رہ گیا ۔ مگر اُس کے بعد سے لوگ ابن الوقت کے حقّے پان سے ذرا احتراز سا کرنے لگے تھے۔



دربار کے مجمع میں نوبل صاحب نے اپنا وقت ملاقات بتا ہی دیا تھا۔ دربار کے تیسرے دن ابن الوقت ٹامس صاحب کی کوٹھی پر جا موجود ہوا ۔ کوٹھی بجائے خود ایک چھاونی تھی ۔ دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ زرد بنگلے میں ہیں، بنگلے کا احاطہ الگ تھا ۔ دیکھتا کیا ہے کہ احاطے کے بیرونی دروازے پر ملاقاتیوں کی سواریاں کھڑی ہیں ۔ دروازے کے اندر چھوٹا سا مگر وسعت بیش صحن میں کے مناسب چمن، خوبصورت، آراستہ، اور اتنے ہی چمن میں چار مالی کام کر رہے ہیں ۔ درختوں کی شادابی، سڑکوں کی صفائی، روشوں کی درستی کہے دیتی ہے کہ مالی صرف نوکری کے ڈرے نہیں بلکہ اپنے شوق سے بھی کام میں لگے لپٹے رہتے ہیں ۔ پر ہاں کیاریوں کی قطع اور درختوں کے انتخاب سے ایک خاص سلیقہ اور مذاق ظاہر ہوتا ہے جو کسی مالی کے بس کا نہیں ۔ ابن الوقت چمن سے جا بجا رکتا، ٹھٹکتا برآمدے تک پہنچا تو ملاقاتیوں کا ہجوم تھا ۔ بعض کرسیوں پر تھے ۔ بعض فرش پر اور بعض برآمدے کے دونوں طرف نیچے ہاتھ باندھے کھڑے تھے ۔ نوبل صاحب کے آدمی ابن الوقت کو پہچان تو چکے ہی تھے ۔ آتا ہوا دیکھ کر سب نے اُسے کھڑے ہو کر سلام کیا اور اتنی اُس کے ساتھ خصوصیت برتی کہ الگ کمرے میں لیجا کر بٹھا دیا۔

(نذیر احمد)

دلّی کے مسلمانوں کی سوسائٹی

"نذیر احمد کے ایک مشہور ناول کا نام 'رویائے صادقہ' ہے،
اس میں انھوں نے شادی اور اُس کی ضروریات سے بحث کی ہے۔
یہ مضمون اُسی کتاب کا ایک باب ہے۔"

میر خسرو معمولی طور پر بیٹی کو بیاہتے تو شہر میں اُن کے عزیز واقارب، دوست آشنا، جان پہچان، اَڑ کر ہزار دو ہزار آدمی جانتے۔ یا اب گلی گلی کوچے کوچے ایک ڈھنڈورا سا پٹ گیا۔ مولوی تو ایسی باتوں کی ٹوہ ہی میں لگے رہتے ہیں۔ اُن کو رسالوں کے واسطے مضمون، فتوؤں کے لئے مسئلہ، وعظ میں بیان کرنے کو قصہ، ہاتھ آیا۔ سیّد صادق شروع سے اپنے پڑھنے لکھنے میں لگے رہے۔ یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ اُن کو مسلمانوں کے مذہبی خیالات سے آگاہی نہ تھی۔ تھی اور بہت کچھ تھی۔ مگر وہ اتنا ہی جانتے تھے کہ مذہبی تعصب مسلمانوں کی دنیاوی ترقی کا مانع ہے۔ اب جو انھوں نے دِلّی سے ایک تعلق پیدا کیا اور یہاں کے لوگوں نے زبردستی سر ہو ہو کر اپنے تئیں پہچنوایا تو انھوں نے جانا کہ شاید روئے زمین پر کہیں کے مسلمانوں کی مذہبی حالت ایسی ردّی نہ ہوگی جیسی دلّی کے مسلمانوں کی۔ انھوں نے دیکھا کہ اِس بدنصیب شہر کے بدنصیب مسلمانوں کو محاربات سلطنت اور ضعفِ سلطنت اور زوالِ سلطنت اور آخر کار ۱۸۵۷ء کے غدر کی وجہ سے جیسے جیسے صدمے پہنچے وہ اُن کو سیکڑوں برس تک پنپنے نہ دیتے، مگر یوں کہو خدا کی کچھ ایسی ہی مہر کی نظر تھی کہ انگریز حاکم وقت

ہوئے۔ اور ماں باپ اولاد کی کیا پرداخت کریں گے جو انھوں نے رعیت کی پرداخت کی۔ اور اُن کی عملداری میں رعیت اس قدر آسودہ ہوئی کہ کبھی کسی وقت میں نہ ہوئی ہوگی۔ لیکن مسلمانوں کی کچھ ایسی مت ماری پڑی کہ یہ لگے انگریزوں سے بدگمانی رکھنے۔ نتیجہ یہ ہوا اور اس کے سوائے ہونا بھی کیا تھا کہ دوسرے لوگ بازی لے گئے اور یہ مُوئے دیکھتے کے دیکھتے ہی رہے۔ بھلا کہیں خدا سے بندے کی ضد چلتی سُنی ہے؟ سٹ گئے برباد ہو گئے، تب کچھ چیتے۔ پھر بھی سب نہیں۔ ہزاروں میں ایک آدھ وہ بھی دلّی میں نہیں، کہ یہ اپنی اُسی پُرانی لکیر کے فقیر بنے بیٹھے ہیں۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کے مسلمانوں پر خدا کا خاص غُصّہ ہے نعوذ باللہ من غضب اللہ اور وہ ابھی پورا نہیں ہوا۔ بلا سے یہ کہیں غارت ہو چکیں کہ مسلمانوں کے سر سے بلا ٹلے خس کم جہاں پاک مصیبت یہ ہے کہ آپ بگڑے، سو بگڑے۔ یہ نادان دوست دوسرے مسلمانوں کو بھی سنورنے نہیں دیتے۔ مصرع

میں تو ڈوبا ہوں مگر تم کو بھی لے ڈوبونگا

یہ سچ ہے کہ بننا بگڑنا سب کچھ خدا کی طرف سے اور اُسی کے حکم سے ہے، لیکن خُدا شیر یا بھیڑیا بن کر آدمیوں کو نہیں پھاڑتا پھرتا، اور نہ سانپ کے جون میں آکر ڈستا ہے، بلکہ عادت الٰہی یوں جاری ہے کہ جو کچھ کرنا ہوتا ہے ہمارے دل میں ویسے ہی خیال ڈال دیتا ہے اور ہم ہی اپنے ہاتھوں سے اپنا فائدہ یا نقصان، بھلائی یا بُرائی، بہتری یا بدتری سب کچھ کر لیتے ہیں اور اتنے ہی تعلق سے تحسین یا ملامت کے مستحق ٹھہرتے ہیں۔ اور پھر انسان نِرا پتھر بھی نہیں کہ جگہ سے سرکاؤ تو سرکے اور اُٹھاؤ تو اُٹھے۔

بلکہ ایک حد تک فاعل مختار ہے۔ اور خُدا نے کسی کو اس حد کا علم نہیں دیا۔ تو خواہی نہ خواہی سارا بوجھ انسان ہی کو اُٹھانا پڑتا اور ہرصورت سے وہی ملزم ٹھہرتا ہے۔ تم ہی بتاؤ مسلمانوں کو بگڑا دیکھ کر مسلمانوں سے نہ کہیں تو اور کس سے کہیں۔ طالب العلمی کی وجہ سے سید صادق کے مزاج میں تو ایک طرح کی عزلت پسندی آگئی تھی اور حقیقت میں وہ ملاقات کا چور تھا۔ لوگوں کی جیسی عادت ہے، طرح طرح کی اُس کی توجیہات کرتے۔ کوئی کہتا مغرور ہیں۔ کوئی سمجھتا انگریزیت چڑھ گئی ہے، ہندوستانیوں سے نفرت رکھتے ہیں۔ کوئی خیال کرتا عقائد بگڑے ہوئے ہیں۔ کیا مُونہہ لے کر مسلمانوں میں بیٹھیں۔ لیکن چاہیئے کہ اس خیال سے اس کی ملاقات سے کنارہ کشی کریں، کیا مذکور؟ دلّی میں کتنے لوگ ایسے بے کار پڑے پھرتے ہیں جن کو دُنیا اور دین کا کوئی کام کرنے کو نہیں۔ صبح ہوئی یہ خُدا جانے کہاں رہے۔ کوئی ڈیڑھ پہر رات جاتے جاتے بیوی کے ڈر سے گھر آئے۔ چھینکے پر سے روٹی اُتار مونڈھے تلے سے سالن کی پتیلی نکال، بچا کھچا کھا پی، مُونہہ لپیٹ پڑ رہے۔ سویرے آنکھ کھلے کیا خاک۔ غرض جیسے دیر کر سوئے تھے ویسے ہی دیر کر اُٹھے۔ مُونہہ ہاتھ دھویا، بالوں میں کنگھی کی، تیل ڈالا، سُرمہ لگایا، پان کھا، چھڑی رومال ہاتھ میں لے چلتے ہوئے۔ کسی کام سے نہیں، کسی خاص شخص کی ملاقات کو نہیں۔ جس کسی جان پہچان کے گھر جی چاہا جا موجود ہوئے۔ بلکہ جان پہچان کی بھی کیا ضرورت ہے۔ یہ معلوم ہونا کافی ہے کہ مردانی بیٹھک ہے۔ تقریب ملاقات کو اِتنا بس کرتا ہے کہ بندہ بہت دنوں سے آپ کی ثنا و صفت سُن سُن کر مشتاق ملاقات تھا مگر کل ادھر ہو نکلا اور قاتم

یہ مسرت تو آج حاصل ہونی لکھی تھی۔ ہر چند ارادہ کیا، نہ بن پڑا۔ اِس وقت اتفاق سے اِدھر گزر ہوا تو طبیعت بے اختیار ہو گئی۔ اسم شریف؟"

صاحب خانہ: ۔ کمترین کا اصل نام تو میر خورم علی خاں ہے، بچپن میں پیار سے چھٹّن صاحب کہتے تھے اور جہاں بیٹھا ہوں، یہ میری سسرال ہے۔ اور جب سے یہ تعلق ہوا ہے یہیں رہنے کا اتفاق ہوتا ہے۔ یہاں لوگ مجھ کو شہنشاہ دولھا پکارتے ہیں۔ اور چونکہ اپنی بولی میں کچھ تُک سے تُک بھی ملا لیتا ہوں، میر موزوں کے نام سے مشہور ہوں۔"

نئے ملاقاتی: ۔ (جن کا نام خواجہ سلطان تھا) ماشاءاللہ جیسا سُنتے تھے اُس کا ہزار چند پایا۔ ہائے ہائے زمانہ ہی قدر ہنر کا نہیں، ورنہ آپ جیسے باکمال آدمی کے دروازے پر تو ہاتھی جھومتے ہوتے۔ کیوں حضرت وجہ معیشت تو یہی کرایہ وغیرہ سے ہوگی۔ آخر کتنے ایک کی آمدنی ہے؟"

شاہنشاہ دولھا میر خورم علی خاں موزوں: ۔ اے جناب کیا آمدنی ہے؟ یوں تو نئی سڑک کے نکڑ سے لے کر چھوٹے دریبے تک کی لین کی لین یہ سب اپنی ہی جائداد تھی، اور متفرقات علاوہ۔ لیکن طبیعت واقع ہوئی تھی لااُبالی۔ روپے کو کبھی روپیہ سمجھا نہیں۔ وہ جائداد تو ہاتھ سے نکل گئی۔ اب گھر کے لوگوں کے نام چند دوکانیں قاضی کے حوض پر ہیں۔ اور سبزی منڈی میں چار ہزاری، آپ نے سُنا ہو ایک باغ ہے۔ بس یہ کُل کائنات ہے۔ کچھ خُدا کی برکت سے گزر ہوئے چلا جاتا ہے۔ بزرگوں کے وقت سے مہاجن لگا ہوا ہے، جو ضرورت ہوئی کہلا بھیجا۔ آدمی ہے بھلا مانس، کسی بات میں آج تک تو عذر کیا نہیں، ورنہ

میں تو اِس ریوڑی کے چکر میں آکر رسڑی ہوگیا ہوتا۔"

خواجہ سلطان :۔ "نصیب اعدا آپ کی تقدیر میں جو پلاؤ کی رکابی لکھی ہے سو ملے ہی گی قسمت پرشاکر رہئے۔ اور آخر آج تک ایک شان سے گزری ہے، انشاء اللہ اُسی طرح گزرے جائے گی۔

موزوں :۔ جی ہاں میں تو فکر کو پاس نہیں آنے دیتا۔ دوست آشناؤں میں ہنس بول کر اپنا وقت گزار دیتا ہوں۔ مجھ کو خبر نہیں ہوتی کہ کس وقت صبح ہوئی اور کب شام ہوئی۔"

خواجہ سلطان :۔ "بس کیا عرض کروں بجنسہ میری بھی یہی خصلت ہے، سرمو تفاوت نہیں۔ گویا ہم دونوں کے مزاج ایک سانچے میں ڈھلے ہیں اور تعجب ہے کہ ہم دونوں میں آج تک معرفت کیوں نہیں ہوئی؟"

موزوں :۔ آپ صورت آشنا تو ہیں۔ بارہا چلتے پھرتے آپ کو دیکھا ہے۔ طبیعت تو میری بھی آپ سے اُنس کرتی تھی مگر وہی آپ کا فرمانا کل اُدھر ہوں باوقار۔ حضرت کا نام نامی؟"

خواجہ سلطان :۔ "فقیر کو خواجہ سلطان کہتے ہیں۔ اور آپ کی پُشت پر جو یہ کم بخت ہیجڑوں کی گلی کہلاتی ہے، اسی میں غریب خانہ ہے۔ میں تو پہلے میر عاشق کے کوچے میں رہتا تھا۔ مالک مکان کم بخت ایسا بے مروّت کہ صرف سوایا ڈیڑھ برس کا کرایہ اتفاق سے چڑھ گیا تھا۔ لگا سخت تقاضا کرنے، مجھ کو ہوا ناگوار، بھری برسات میں مکان چھوڑ دینے کا ارادہ کیا۔ وقت پر اور کوئی مکان اپنے ڈھب کا ملا نہیں۔ آخر اسی مکان میں رہا۔ خانہ داری خدا کے فضل سے [illegible]

زیادہ ہے۔ مکان ہونا چاہئے گنجائش کا اور یہ آسائش تو اس میں خاصی ہے۔"

موزوں "آپ نے کچھ خیال ہی نہ کیا ہوگا۔ ورنہ چاہتے تو بہتیرے مکان اپنی ذات کے کرلئے ہوتے۔"

خواجہ۔ جناب بزرگ تو کچھ ایسے قناعت والے لوگ تھے کہ جو ملا کھا لیا۔ جو میسر آیا پہن لیا۔ اُنھوں نے دُنیا میں بہت پاؤں پھیلانے چاہئے ہی نہیں۔ رہا یہ عاجز تو والد مرحوم نے اپنے اوپر تکلیف سہی مگر میری آنکھ پر کسی طرح کا میل نہیں آنے دیا۔ اور میں نے اُن کی بدولت وہ وہ عیش کئے کہ جب کبھی یاد آجاتے ہیں روئیں روئیں سے دعا نکلتی ہے۔ اور اب بھی اُن ہی کی بدولت عیش نہیں تو خیر خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے تکلیف بھی نہیں۔ ہم دو ہی بھائی بہن تھے ہمشیر کو اُنھوں نے ایسی اچھی جگہ دیکھ کر دیا کہ اُن کی سسرال سے بہت کچھ مدد ملتی ہے۔ اور اِدھر میرے ایک برادر نسبتی رجواڑے میں نوکر ہیں وہ اپنی بہن کی خبر لیتے رہتے ہیں۔ اور نہ کیوں لیں؟ اپنے اسی دن کے لئے ہوتے ہیں۔ قیامت میں تو کوئی کسی کو بخشوانے ہی کا نہیں۔ غرض آپ کی دعا سے مجھ کو تو کسی طرح کا تردد کرنا پڑتا نہیں۔ دو وقت گھر میں گئے اور کھانا کھا لیا۔ خانہ داری کے جھگڑوں سے میری طبیعت اُلجھتی ہے اور میں نے گھر میں کہہ رکھا ہے کچھ بھی کر دمیں جس وقت آؤں کھانا تیار پاؤں۔ سو وہ نیک بخت اس کا اہتمام رکھتی ہے۔ جب تک والدہ زندہ رہیں وہ میری ضرورتوں کی خبر لیتی رہیں۔ اب اُن کی جگہ یہ عورت ہے۔ بندۂ درگاہ نے نہ کبھی ہاتھ پاؤں ہلایا اور

نہ جیتے جی ہلائیں۔

موزوں۔ بس تو ہماری آپ کی صحبت خوب نبھے گی ؎

قیس جنگل میں اکیلا ہے مجھے جانے دو
خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو

اِس کے بعد دونوں میں اور بہت سے سوال و جواب ہوئے اور پہلی ہی ملاقات میں ایک دوسرے سے اِتنے کھُلے کہ سارا کچا چٹھا حال اُنھوں نے اِن کا، اِنھوں نے اُن کا کھود کھود کر دریافت کر لیا۔ بس ایک عورتوں کے نام پوچھنے کی نوبت تو نہیں آئی۔ اور وہ بھی شاید اس سبب سے کہ موزوں کے گھر سے کھانے کے لئے بُلاوے پر بُلاوا چلا آتا تھا، بارے روزانہ دو وقتہ مُلاقات کی قسما قسمی ہو کر دن کے ایک بجتے بجتے بمجبوری خواجہ سلطان رُخصت ہوئے۔ گھر گئے اور وہی ٹھنڈی روٹی جما ہوا سالن جو اُن کی تقدیر کا تھا کھا، توے کا حُقّہ پی، پھر جو سوئے تو دو گھڑی دن رہے کی خبر لی۔ جاگے اور پڑے پڑے سر اُٹھا کر چُندھی چُندھی آنکھوں سے دُھوپ کو دیکھا تو گھبرا کر اُٹھے اور یہ اُن کے نصیبوں کی دوسری صبح ہوئی۔ اُٹھتے کے ساتھ پہلے گھر کی ماما پر خفا ہوئے کہ صبح کا نکلا نکلا دو پہر پیچھے گھر آیا۔ تُم کیا جانو کس کام میں تھا۔ ذرا کی ذرا لیٹا۔ بندہ بشر ہے، آنکھ لگ گئی تو تُم سے اِتنا نہ ہو سکا کہ جگا دیتیں۔ مگر تُم کو تو سوائے کھانا پکانے کے اور کسی کام کو ہاتھ لگانے کی قسم ہے۔ آواز دینے میں بھی کچھ زبان تھکی جاتی تھی۔ ماما تو میاں کے پیچھے جھاڑ ہو کر چمٹتی، مگر بی بی لقمہ توڑ بول پڑیں "کہ خیر ہے، خواہی نہ خواہی خدا واسطے کو ماما کے سر کیوں ہوئے؟ بچّوں نے

اِتنی اُدھم مچائی تو تمھارے فرشتوں کو خبر تک نہ ہوئی، ماما کیا تمھارے کان میں جا کر ڈھول بجاتی۔"

میاں :- "پھر تم نے میری بات میں دخل دیا۔"

بی بی :- "ہاں ہاں دیا اور سو دفعہ دیں گے۔ ہزار دفعہ دیں گے۔ تم ہمارے آدمی سے بولنے والے کون ہوتے ہو؟ مُوئی لگائی ڈومنی گائے تال بتال۔ ماماؤں کو نکالنا ہی جانتے ہو یا کبھی اِتنی عمر میں کوئی ماما بلوا کر بھی دی ہے۔ ماما نہیں ہوتی تو مصیبت تو ہمارے دم پر پڑتی ہے، تمھارا کیا ہے، آئے اور پکی پکائی نگلنے کو بیٹھ گئے۔"

میاں :- "میں نے نکالنے کو تو نہیں کہا۔ ماما تم ہی خدا لگتی بات کہنا۔ ہاں اب کیوں بولو گی مگر یہ بی بی شہ دے دے کر تم کو کسی اور کے کام کا تو رکھنے کی نہیں۔"

بی بی :- "چلو جب تمھارے گھر والے نوکری کرنے جائے گی تو مجھ نہ رکھنا۔ اور تم یوں بھی کیوں رکھنے لگے تھے۔ تم اللہ رکھے رکھو گے غلام رکھو گے باندیاں۔"

میاں :- "تم کچھ اپنے بھائی کے برتے پر اتراتی ہو گی تو میں کسی کا دَبیل نہیں بنتا۔ وہ جو کچھ دیتے ہوں گے تو تم کو دیتے ہوں گے۔ مجھ کو تو خدا نے تمھارے یا اُن کے نمک کا بھی شرمندہ نہیں کیا اور نہ کرے گا۔ خدا میرے دولھا بھائی کو سلامت رکھے، جن کی بدولت میں چاہوں تو تم جیسی چار اور کر لاؤں۔"

بی بی :- "نگوڑے، بے غیرت، بہنوئی کے کھونٹے پر کودتے ہوئے شرم نہیں آتی ہے؟"

وہ تو ماما ہی بی بی کو ٹال کر کوٹھے پر لے گئی، نہیں تو خوجم صاحب کے پٹے بی بی کے ہاتھ میں ہوتے اور بی بی صاحب کی چٹیا خوجم صاحب کے ہاتھ میں۔ مگر ہے یہ کہ خوجم صاحب تھے بھی دل کے بہت ہی صاف۔ اُن کا غصہ پانی کی سی ایک لہر ہوتی تھی۔ اِدھر آئی اُدھر اُتری۔ بی بی کوٹھے تک پہنچی بھی نہ ہوں گی کہ اُنھوں نے مُونھ ہاتھ دھویا، کنگھی کی، شام کی سیر کے کپڑے بدلے، پٹاری کھول پان بنایا اور بن ٹھن کر باہر کو چلے۔ چلتے چلتے پکار کر کہتے گئے کہ شام کو ٹکے کے کباب اور ایک آنہ کی ملائی منگا رکھنا۔ دیکھنا بھولنا مت۔ اور دن نئے باسوں سے لے کر قاضی کے حوض ہوتے ہوئے چاوڑی، اور وہاں سے بڑے دریبے کے تین تو ضرور، اور کبھی چار پھیرے بھی ہو جاتے تھے۔ آج جو کسی قدر دیر ہو گئی تھی تو دو ہی پھیروں میں جھٹپٹا ہو گیا اور بازار کے چلنے والوں کو کوٹھوں پر کا آدمی اچھی طرح دکھائی نہیں دیتا تھا۔ خوجم صاحب کو خیال تو آیا کہ میر موزوں سے وعدہ کیا ہے، چلیں اُن ہی کے سر ہوں، مگر گنجفے شطرنج کے پُرانے ٹھکانے بندھے ہوئے تھے۔ اُن کا معمولی ناغہ کرنے سے اپنی بھی ایک طرح کی ہیٹی ہوتی تھی کہ کل برابر ماتیں کھائیں، سفو پر نادری چڑھوائی۔ آج بھاگ کھڑے ہوئے۔ ناچار اپنے قدیم اکھاڑے پر جا موجود ہوئے۔ خوجم صاحب کا پیٹھ پیچھا ہے، یہ بیچارے اپنی طرف سے بہتیری ہی جلدی کرتے تھے مگر بازی پر تو کسی کا بس نہیں چلتا۔ اڑی تو اڑی اور اکثر ایسا بھی ہوتا تھا کہ جو ہارا وہ پیچھا نہیں چھوڑتا کہ اب کے بازی لے جاؤ تو جانوں۔ جھٹنے کی چڑھی تو نہیں ہے کہ دینی آئی تو اب نہیں کھیلتے۔

غرض ہر چند قصد کرتے تھے، بارہ بجے سے اِدھر کبھی چھٹکارا ہوا ہی نہیں۔ اور بی بی کے ساتھ اور بگاڑ ہی کا ہے کا تھا۔ مرد ہو کر نکھٹو اور اس پر گھر کے رہنے سہنے کا یہ حال کہ مسافر بھی بھٹیاری کی سرائے میں شام سے آ پڑتا ہے۔ اور یہ سویرے لوٹے تو آدھی بجے اور نہیں تو ایک بجے دو بجے۔ لیکن ہم کو تو موقع نہیں ورنہ اُس نیک بخت کو ضرور سمجھا دیتے کہ کیوں اس غم میں گھُلی جاتی ہو؟ یہ شخص گھر ہی پڑا پڑا کیا کریگا؟ سینے کا یہ نہیں، پرونے کا یہ نہیں۔ ہاں دن بھر اس کو گڑگڑانے کو حُقّہ اور چبانے کو پان دیئے جاؤ۔ تو تم جاننا پان تمباکو ہی کا خرچ بچا اور ہر وقت کے پاس رہنے سے دو برتن ہوتے ہیں تو وہ بھی کبھی نہ کبھی کھڑکھڑا ہی اُٹھتے ہیں۔ ایسے آدمی سے تو جتنی دیر الگ رہو اُتنی دیر کوفت سے بچو۔ آنکھوں دیکھتے تو صبر نہیں ہو سکتا کہ ایک آدمی ہٹّا کٹّا، لنگڑا نہیں۔ لولا نہیں، اپاہج معذور نہیں، اندھا نہیں۔ بہرا نہیں، اور کمانے کے نام موئی مٹّی۔ کالا مُونہہ نیلے ہاتھ پاؤں۔ خواجہ سلطان کے طور کے احدی بندے شہر میں بہتیرے ہی بھرے پڑے تھے۔ اور یہ لوگ اگرچہ اور سب باتوں میں تو احدی ہوتے ہیں مگر چل پھر کر اپنے ڈھب کے آدمی ڈھونڈھ نکالنے میں بڑے چالاک۔ سید صادق کو تازہ وارد سُن کر دھر لپکے۔ لیکن سیّد صادق میں اور اِن میں کوئی وجہ مناسبت تھی ہی نہیں، کسی کی دال نہ گلی اور پہلی ہی ملاقات میں اپنا سا مُونہہ لے کر بیٹھ رہے۔ اِن کے جلسوں میں ذکر تذکرے تو ہر طرح کے رہتے ہی ہیں، سیّد صادق کے بارے میں اِن لوگوں کی یہ رائے تھی کہ آدمی ہے تو قابلِ ملاقات، مگر خدا جانے علی گڈھ کے نیچری نے کیا پڑھ کر کان میں

پھونک دیا ہے کہ یار لوگوں کے ہتّے پر چڑھنے والا نہیں۔ میر خسرو بھی اِس کا ظاہر حال دیکھ کر گر رہے ہیں۔ اب پچتائیں گے۔ یہ عمر اور ایسا مردہ دِل کہ کتنی ہی گدگدی کرو خبر نہیں۔ اُس نے تو ملّانوں کو بھی مات کیا ہے۔ آدمی کی صورت سے جھینپتا ہے۔ اِس سے نوکری چاکری کیا خاک ہو سکے گی۔ وہ ہاتھ ہی نہیں دھرنے دیتا، ورنہ ہم تو دو تین ملاقاتوں میں اِس کو اپنے طور کا کر لیتے۔ اس کی جھجک دور کرتے۔ اس کو علم مجلس سکھاتے کہ اس کے دروازے پر بھی ایک جمگھٹا رہتا۔ عجب کوڑ مغز آدمی ہے۔ کسی چیز کا مذاق نہیں۔ گنجفہ، شطرنج، چوسر، پتنگ، بٹیر، مُرغ، ستار، شعر و سخن، سیر و تماشا۔ ارے میاں میں نے اس کو ہر ہر طرح سے ٹٹولا۔ اس عزیز کے کان پر جوں بھی تو نہ چلی۔ خُدا جانے کس مُلک کا جانگلو پکڑ کر آیا ہے۔ ہاں صورت شکل تو ایسی پائی ہے کہ ہزاروں میں ایک۔ جی چاہتا ہے کہ بیٹھے دیکھا کیجئے۔ مگر تمھارا اثر قرآن کی جگہ ہے، بس دیوالی کی مورت۔ جان نہیں، مُونہہ میں زبان نہیں، خیر اِن بلاؤں سے تو خُدا نے سیّد صادق کا پیچھا چھڑایا اور آج کیسا چھڑایا، اِس کا پیچھا اُس دن سے چھوٹا ہوا تھا جب سے یہ علی گڈھ کالج میں داخل ہوا۔ کھیل تو لڑکوں کو وہاں بھی کھلائے جاتے ہیں اور ایسی تاکید سے کہ جیسا پڑھنے کا اہتمام ویسا، بلکہ اس سے بڑھ کر کھیلنے کا، مگر کھیل کھیل میں فرق ہے۔ ایک تو ہمارے یہاں کے کھیل ہیں جن میں سے اکثر بے سود اور بے سود ہوں تو خیر، اُلٹے مفسد اخلاق کی تمہید۔ کاہلی کی تعلیم، اور بعض میں جو کچھ دماغی فائدے نکل سکتے ہیں۔ مثلاً گنجفے میں حافظے کی ترقی، چوسر شطرنج میں غور اور خوض کی عادت۔ تو

ان میں بڑی قباحت یہ ہے کہ دنیاوی معاملات میں ان سے مطلق مدد نہیں ملتی۔ اگر کوئی شخص گنجفہ اچھا کھیلتا ہے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ اُس کو پتّوں کی یاد داشت اچھی ہے۔ لیکن بازیوں کے ورق یاد رکھنے سے کتابوں کے ورق تو کیا صفحہ بلکہ دو چار سطریں بھی یاد نہیں ہو سکتیں۔ اِسی طرح بڑے سے بڑا شاطر شطرنج کے نقشے میں خوب طبیعت لڑاتا ہے مگر ایک سیدھا سا مقدمہ اُس کے سامنے بیان کرو تو سمجھ نہیں سکتا، تدبیر سوچے گا کیا اپنا سر؟ غرض ہندوستانیوں کے جتنے کھیل ہیں سب نِکمّے، موجب تضیع وقت۔ اب مدرسے کے کھیلوں پر نظر کرو تو نری جسمانی ریاضت اور تفریح طبع کے علاوہ دماغی زحمت کا کچھ دخل نہیں، کیونکہ اوقات درس میں جتنی دیر پڑھنے میں مصروف رہے بس دماغی محنت بہتیری ہوئی، اب کھیل میں بھی شطرنج کی طرح سوچنا پڑے تو دماغ کہاں تک اس فشار کو وفا کر سکتا ہے۔ اور اگر جسم سے بالکل کام نہ لیا جائے تو جس طرح گھوڑا تھان پر بندھے بندھے ہڈّے موترے نکال لاتا، بادی میں بھر جاتا، دانہ گھاس اچھی طرح ہضم نہیں کر سکتا، تھوڑی دور چلنے سے ہانپنے لگتا، کوس دو کوس دوڑانا چاہو تو دوڑ نہیں سکتا، یہی حال آدمی کا ہے کہ اگر وہ اپنے ہاتھ پاؤں سے کام نہیں لیتا تو اگر اور کوئی بیماری اُس کو نہ بھی ستائے، یہ کیا تھوڑی بیماری ہے کہ وہ اپاہج ہو جاتا ہے۔ اِسی آرام طلبی کے نتیجے ہیں کہ ہماری عمروں کے اوسط گھٹتے اور ہماری نسلیں کمزور ہوتی چلی جاتی ہیں۔ خیر کابل کے پٹھانوں اور گوروں کے ساتھ تو ہم ہندوستانی گرگئیں کیا مقابلہ کریں گے۔ اپنے ہی ملک کے دیہاتی کبھی شہر میں آ نکلتے ہیں تو

تو اُن کو دیکھ کر عقل حیران ہو جاتی ہے کہ الٰہی یہ بھی آدمی ہیں جن کی کاٹھیاں لوہے کی اور ہاتھ پاؤں پتھر کے ہیں۔ معلوم ہے کہ ساگ بھوجی اور جوار باجرے کی روٹی کے سوائے اور کچھ میسّر نہیں آتا۔ مگر یہ آنکھوں دیکھی بات ہے کہ ایک دیہاتی سوسوا سومن کی چھ بلدی گاڑی ہانکے لئے چلا جا رہا تھا۔ شہر کی بھیڑ دیکھ کر بیل بدکے گاڑی کا ایک پہیہ نالی میں جا رہا۔ بیلوں نے بہتیرا زور مارا پہیہ جگہ سے نہ کھسکا۔ گاڑیبان نے اُتر کر کمر کا سہارا لگا بات کی بات میں گاڑی کو ایسا دھکّا دیا کہ بیچ سڑک میں۔ نہ دیہاتیوں کا پانی، نہ شہریوں کا ماء اللحم، نہ اُن کا چبینا اور نہ ہمارے بادام پستے، بے شک شہر اور دیہات کی آب وہوا میں بھی بہت بڑا فرق ہے۔ مگر دیہاتیوں کی توانائی اور اُن کا ٹانٹا پن ہے، محنت کی وجہ سے۔ شہر کی ایک تو کثرتِ آبادی کی وجہ سے آب وہوا خراب اُس پر محنت و مشقت ندارد جس کو دیکھو بدن پر بوٹی نہیں اور بوٹی ہو تو کہاں سے ہو؟ بے چارے کو کبھی کُھل کر بھوک نہیں لگتی اور مارے ہوکے کے کچھ بے اشتہا کھا لیتا ہے تو ہضم نہیں ہوتا۔ اور جو ہم میں پہلوان کہلاتے ہیں۔ سینہ اُبھرا ہوا ہے، قبضے چڑھے ہیں، دیکھنے کو موٹے تازے، داؤ پیچ بھی خوب رواں، مگر اصلی بل بوتا اُن میں بھی نہیں، اِس پر ایک حکایت یاد آئی ہے کہ جن دنوں قلعہ آباد تھا تو سلاطین کو سوائے اوقات گزاری کے اور کوئی کام نہ تھا۔ نکمّے بیٹھے بیٹھے اُن کو ایسے ہی مشغلے سوجھتے تھے کہ ستار بجا رہے ہیں، یا بٹیریں لڑا رہے ہیں، یا شطرنج کھیل رہے ہیں، یا اِس کی دُھن ہے کہ کوئی ایسے قسم کا کھانا پکوائیے کہ کوئی پہچان نہ سکے۔ چنانچہ

ایک صاحبِ عالم کو پہلوانوں کی کُشتی دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ بہت
سے پہلوانوں کے راتب بندھے تھے اور اُنھوں نے ایسی ایسی جوڑیں
تیار کی تھیں کہ رجواڑوں میں جا جا کر کُشتیاں مارتے تھے۔ ایک مصاحب
کو یہ سوجھی کہ اِن دنوں ولایتی میوہ فروش آئے ہوئے ہیں کسی ولایتی
کو ایک پہلوان سے لڑوایا جائے۔ صاحبِ عالم اس ایجاد کو سُن کر پھڑک
گئے اور فرمایا "بھائی واللہ تخت کی قسم ہے۔ کیا بات پیدا کی ہے۔
معمولی کُشتیاں دیکھتے دیکھتے جی اُکتا گیا، ولایتی کی کُشتی میں مزہ تو خوب
آئے گا۔ دیکھیں وہ پیچ کا کیا توڑ کرتا ہے۔ داروغہ جی دنیا اِن کو ایک
دوشالہ۔ اور بھائی تُم ہی اِس کُشتی کا اہتمام بھی کرنا اور مَیں حضور میں
بھی عرض کرونگا۔ سرفراز فرمائیں گے۔"

مصاحب ۔ پیر و مرشد سرفراز فرمانا کیسا بہت محظوظ ہوں گے،
اور خانہ زاد نے جو جو کچھ عرض کیا ہے حرف حرف اُس کی تصدیق
ہو جائے گی۔ سرکار کو تو معلوم ہے کہ جناب عالیہ کے آپ خاصہ کی
خدمت غلام کی خالہ جان کو ہے۔ وہ کل بھی کہتی تھیں کہ جناب بیگم صاحب
بیٹھی تاش کھیل رہی تھیں۔ دیکھتے کیا ہیں کہ حضور والا تشریف لئے
چلے آرہے ہیں۔ جناب عالیہ کے ساتھ تخلیہ ہوا تو خالہ جان نے اپنے
کانوں حضور کو سرکار کا نام لے کر فرماتے سُنا کہ ساری ادائیں اورنگ زیب
کی سی ہیں۔ سپاہیانہ مزاج واقع ہوا ہے۔ اور شوق بھی ہیں تو اِس قسم
کے کہ اگر موقع ملا تو یہ لڑکا انگریزوں سے مُلک آبائی اُگلوا کر رہیگا۔"
اِتنا کہنا تھا کہ صاحبِ عالم نے بڑے دنگل کی تیاری کا حکم دیا اور مصاحبوں
کی بن آئی۔ نہیں معلوم ظالموں نے کیا تدبیر کی کہ ایک اکھڑ

وحشی ولایتی کو کچھ دیکر شاہی پہلوان کے ساتھ لڑنے کو راضی کر لیا۔ ولایتی کو ہم نے بھی دیکھا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ مارے دہشت کے نظر نہیں ٹھیرتی تھی۔ آدمی کاہے کو تھا ایک دیو کا دیو تھا۔ بالوں کی لٹیں کندھوں تک لٹکتی ہوئیں۔ میلے کثیف کپڑے چار چار پانچ پانچ گز سے مَست دُنبے کی سی بو، ایسی سخت کہ ناک نہ دی جائے۔ پیٹھ پر ہینگ کا مشکیزہ، اِدھر جوتیوں سے اور اُدھر مشکیزے سے چپڑ چپڑ کی آواز چلی آئے۔ خونخوار آنکھیں، ڈراونی صورت، لوگ جو اُس کو بہلا پھسلا کر لائے تھے۔ اُس کے گِرداگرد ایسے معلوم ہوں جیسے بڑے آدمی کے آگے بچّے۔ اور یہاں اکھاڑے میں پہلوان پڑے جھوم رہے تھے۔ کوئی ڈنڑ پیل رہا ہے اور کوئی تین سوا تین من کی جوڑی کے رومالی ہاتھ اس خوبصورتی اور صفائی سے ہلا رہا ہے کہ سارے تماشائیوں کی ٹکٹکی اُس پر بندھی ہے۔ کوئی لیزم کی کثرت کر رہا ہے، کوئی بنیٹھی کے کرتب دکھا رہا ہے۔ اِتنے میں غُل ہوا کہ وہ پٹھان آیا۔ جوں اُس کو لاکر اکھاڑے کے پاس کھڑا کیا اُس کا پھیلاؤ دیکھ کر پہلوانوں کا رنگ فق ہوا۔ اب کسی کی ہمّت نہیں پڑتی کہ موت کے مُونھ میں جائے۔ اور ولایتی ہے کہ زمین میں آلتی پالتی مارے ہینگ کے مشکیزے کا گاؤ تکیہ بنائے نظر حیرت و تعجب سے سب کو بیٹھا دیکھ رہا ہے۔ اور اِن پہلوانوں کو سمجھتا ہے کہ نٹوں کا تماشا کر رہے ہیں۔ اکھاڑے کا اُستاد اگرچہ تھا تو عمر سے اُترا ہوا مگر اُس کا بدن ایسا مرتّب تھا اور اُس کو ایسے ایسے داؤ گھات یاد تھے کہ یکایک کوئی اُس سے لڑنے کی ہامی نہیں بھرتا تھا۔ مگر وہ خوب جانتا تھا۔

ع - فربہی چیزے دگر آماس چیزے دیگرست

اُس نے چپکے سے صاحبِ عالم کے پاس جاکر عرض کیا کہ آج تک آپ کے اکھاڑے نے کسی سے نیچا نہیں دیکھا اور اُستاد کی برکت سے ہمارے یہاں کے پٹھے بھی اپنے وقت کے رستم و اسفندیار ہیں، لیکن سرکار راجرس چاقو کو قسائی کے مُگدرے سے بھڑاتے ہیں - ساری عمر کا ہم نے سرکار کا نمک کھایا - حُکم کی تعمیل میں مجال عذر نہیں، پچھڑیں گے تو نہیں مگر اِس کے ہاڑ تو ملاحظہ کیجئے کہ کلائی دونوں ہاتھوں میں سمانی مشکل ہے - سرکار کو جان ہی لینی منظور ہے تو بسم اللہ - اس کا دبوچا ہوا آدمی پھٹکا بھی تو نہیں کھانے کا - اونٹ کی پکڑ کو اس کی پکڑ سے کیا نسبت " صاحبِ عالم سمجھے تو سہی مگر سارے میں غُل مچوا چکے تھے کس طرح کُشتی کو ملتوی کردیتے - بارے لوگوں نے ولایتی سے کہا کہ آغا اِن لوگوں میں سے جس کے ساتھ تمھارا جی چاہے کُشتی لڑو "

آغا - ہم سب کے ساتھ لڑے گا "

اب تو پہلوانوں کے دم میں دم آیا کہ خیر ایک کی وار دو دو - اُستاد اور شاگرد سارے کا سارا اکھاڑا اکیلے کو لپٹ پڑا - جو جو داؤ پیچ یاد تھے سبھی نے تو چلائے، آغا ہیں کہ قطب از جا نمی جُنبد - لوہے کی لاٹ کی طرح گڑے ہوئے کھڑے ہیں - اِن لوگوں نے نادانی یہ کی کہ آغا سے گتھ گئے - اُس نے موقع پا ایک کو تو اس بغل میں دابا اور دوسرے کو دوسری بغل میں - اِس نے تو اپنے نزدیک آہستہ ہی سے دابا یا تھا - مگر اُن میں کا ایک تو آج تک کوب لئے پھرتا ہے، اور دوسرا مُدّتوں خون تھوکتا رہا - اب سُنا اچھا تو ہو گیا ہے مگر جاڑے کے دِنوں میں مارے پسلیوں

کے درد کے بے چارے سے سانس نہیں لیا جاتا۔ خیر بنی آدم میں یہ ولایتی پٹھان تو اور ہی نسل کے ہیں اور اُن کی سی بات حاصل کرنی تو مشکل بلکہ محال ہے مگر اس کے عقلی دلائل موجود ہیں کہ اگر ہم اپنے طرز تمدّن میں صفائی کے قاعدوں کی پوری پوری رعایت کریں اور جسمانی ریاضت کی عادت ڈالیں تو آئندہ کی نسلیں بہت بہتر ہو سکتی ہیں۔ یہ سچ ہے کہ ہم لوگ گرم مُلک کے رہنے والے ٹھہرے۔ ہم کو خُدا نے محنت کے لئے پیدا نہیں کیا اور نہ ہم سے محنت کا تحمّل ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر شاقّہ محنت نہ ہو تو جس قدر برداشت کی جا سکتی ہے وہ بھی سودا کی ایک دوا ہے۔ اور نہ پھر ہلدی لگے نہ پھٹکری۔ اور علی گڈھ کالج میں جو لڑکوں سے محنت لی جاتی ہے تو خدا نخواستہ کچھ پتّھر تھوڑا ہی ڈھلوائے جاتے، یا لکڑیاں تھوڑا ہی چروائی جاتی ہیں۔ یہی کودپھاند دوڑ دھوپ، جس میں اُن کے اعضا چُست و چالاک رہیں۔ جس کو عادت نہیں اُس کو شروع میں ذری سی محنت بھی ناگوار گزرتی ہے لیکن آہستہ آہستہ ایک حد اعتدال تک عادت ڈالی جائے تو آرام سے زیادہ اُس میں راحت ملتی ہے، جس کو یقین نہ ہو ہماری خاطر سے زیادہ نہیں ایک چلّہ اس صلاح پر عمل کر کے دیکھے۔ کچھ فائدہ معلوم نہ ہو تبھی اُلاہنا دینا۔ لیکن لوگوں نے اس کو کچھ ایسا عیب سمجھ رکھا ہے کہ جہاں تک ہو سکتا ہے کوئی ہل کر اپنے ہاتھ سے پانی نہیں پینا چاہتا ہے۔ اور طالب علموں کے حق میں تو ایسی سختی ہے کہ گویا پڑھنے اور کھیلنے میں بیر ہے اور اتنا نہیں سمجھتے کہ جس کے بدن میں توانائی نہیں اُس کے دماغ میں طاقت نہیں، دل میں قوّت نہیں، عقل

میں تیزی نہیں، ذہن میں رسائی نہیں۔ کبھی دیکھا ہے روگی ماں باپ کی اولاد چونچال تن درست؟ کہیں سُنا ہے مُرجھائی ہوئی ٹہنی کے پتّے ہرے بھرے شاداب؟ غرض سیّد صادق نے کھیل بھی کھیلے تھے مگر وہی کھیل جن سے مقصود تھی ریاضت اور تفریح اور وہ بھی قاعدے سے، اپنے ہم جماعتوں کے ساتھ۔ اُستادوں کے ساتھ، سرکاری عہدہ داروں کے ساتھ اس کو نہ یہاں کے کھیل آتے تھے اور نہ وہ ایسے جلسوں کو پسند کر سکتا تھا۔ پس حقیقت میں نہ وہ ہندوستانی سوسائٹی کے قابل تھا اور وہ ہندوستانی سوسائٹی اُس کے لائق۔ اُس کی طبیعت ڈھونڈھتی تھی وہی کالج کی صحبتیں، کہ پڑھنا ہے تو، اور باتیں ہیں تو، اور کھیل ہے تو تمام وقت کسی نہ کسی شغل میں مصروف ہے، اور شغل بھی مفید اور دل چسپ۔ تعلیم کی تعلیم اور تفریح کی تفریح۔ ہندوستانیوں میں اگر ایسے مذاق ہوتے تو یہ روز بد ہی کیوں پیش آتا۔ سیّد صادق کو معلوم تھا کہ طالب العلمی کے بعد ہندوستانی سوسائٹی کو اوڑھنا بچھونا بنانا پڑے گا اور اِسی غرض سے اُس نے خانہ داری کا تعلّق پیدا کیا تھا، مگر یہ ایک تعلّق سوسائٹی کا کام تو نہیں دے سکتا بلکہ اس کے ہوتے سوسائٹی کی ضرورت بڑھتی جاتی ہے۔ پس چار و ناچار اُس کو لوگوں سے ملنا پڑتا تھا۔ آدمی کہاں تک کتاب دیکھے اور کب تک عورتوں کی طرح گھر کی چار دیواری میں بند رہے۔ دلّی جیسے شہر میں سیّد صادق کو معدودے چند اپنے ہم خیال بھی کیوں نہیں مل سکتے تھے۔ آخر برسوں سے انگریزی تعلیم ہو رہی ہے اور یہ تو ممکن ہی نہیں کہ آدمی مشن اسکول میں نہ سہی کہیں بھی انگریزی پڑھے اور اُس کے خیالات بالکل ویسے کے ویسے ہی رہیں جیسے فی زمانتا

عام مسلمانوں کے ہیں - ہاں اِتنا فرق ضرور ہے کہ بعض اپنے خیالات
کو ظاہر نہیں کرتے یا اُن کو ظاہر کرنے کا موقع نہیں ملتا اور بعض بھڑبھڑیا
ہوتے ہیں کہ جو اُن کے دل میں ہے وہی اُن کی زبان پر ہے - لیکن
اتفاق سے سیّد صادق کو آتے کے ساتھ اُن ہی لوگوں سے سابقہ پڑا
جن کو اُس کے سے خیالات چھو بھی نہیں گئے تھے - یہ تو کیونکر کہیں کہ
سیّد صادق کو ہندوستانی سوسائٹی کا حال معلوم نہ تھا - وہ ہندوستانی
سوسائٹی میں پیدا ہوا - ہندوستانی سوسائٹی میں اُس نے پرورش
پائی اور وہ بھی ہندوستانیوں میں کا ایک ہندوستانی تھا مگر اُس نے
ہوش سنبھالا علی گڈھ کالج میں - پس سوسائٹی کے متعلق اس کی معلومات
بیشتر کتابی تھی کہ وہ اخبار میں، کتابوں میں، ہندوستانیوں کے حالات
پڑھتا رہتا تھا: اب جو لوگوں سے ملا جُلا تو جانا کہ جو کچھ جانتا تھا اُس کو واقعات
سے اِتنی بھی تو نسبت نہیں جتنی چھٹانک کو من سے - اُس کے
خواب و خیال میں بھی نہ تھا کہ مسلمانوں نے مذہب کا یہ حال کر رکھا
ہے کہ اُس میں اور دنیا میں اس طرح کا بیر ہے کہ دونوں جمع ہو ہی نہیں
سکتے - خصوصاً انگریزی عملداری میں - خُدا نے تو بندوں کی مصلحت
اِس میں سمجھی کہ انگریزوں کو وقت کا بادشاہ کر کے دُنیاوی عزّت اور
دُنیاوی دولت کی کُنجیاں اُن کے حوالے کر دیں کہ، جس کو چاہیں
دیں اور جس کو چاہیں نہ دیں - اور مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ باوجودیکہ
نصاریٰ اہلِ کتاب بھی ہیں - اِن کے ساتھ کھانا پینا، عیسائی مذہب
کی عورتوں سے نکاح کرنا، کہ دُنیا میں میل جول اور دوستی ملاقات
کے یہی طریقے ہیں - قرآن میں اِن سب باتوں کی اجازت صاف

صاف موجود ہے - نصاریٰ کی مدح بھی ہے اور یہ بھی اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ امن اور انصاف اور آسائش اور آزادی، غرض ہر طرح کی راحت جیسی اِن کی عملداری میں ہے نہ کبھی ہوئی اور نہ اب کسی دوسری عملداری میں ہے - باوجود اِن سب باتوں کے مسلمان ہیں کہ اِن کے سائے سے بھاگتے ہیں - اِن کی زبان سے نفرت، اِن کے کلام سے نفرت، اِن کی وضع سے نفرت، اِن کی طرزِ روش سے نفرت - جس کا ضروری نتیجہ یہ ہے کہ مسلمان روز بروز مفلس اور ذلیل ہوتے چلے جاتے ہیں - جتنے ذریعے معاش کے دُنیا میں ہیں اور ہو سکتے ہیں سبھی میں تو مسلمان دوسری قوموں سے ہیٹے ہیں - کیا نوکری، کیا تجارت کیا زمینداری، کیا دستکاری، کیا کچھ، کیا کچھ - اور جو دو چار نے اس ظلم کو سمجھا ہے اور اب پچتاتے اور اپنی دُنیاوی حالت درست کرنی چاہتے ہیں اُن کو اپنے ہی بھائی بند چین نہیں لینے دیتے کہ دُنیا کے پیچھے دین کو چھوڑ بیٹھے - عاقبت خراب کی، اِن کا پانی پینا روا نہیں - اِن سے رشتہ ناتا کرنا درست نہیں - اور جو لوگ اس طرح مُونہہ بھر بھر کے دوسروں کو بُرا کہتے ہیں، وہ اگر اپنے نفس کا احتساب کریں تو پائیں گے کہ اِن ہی کے خیال کے مطابق دوسروں کی آنکھ میں ناخنہ ہے تو اِن کی اپنی آنکھ میں ٹینٹ - دوسروں کو خارش ہے تو اِن کو کوڑھ - دوسروں کو خفقان ہے تو اِن کو جنون، اور جنون بھی مطبق - مگر خُدا نے دلوں پر مُہر لگا دی ہے - اِن کو دوسروں کے عیب دیکھنے سے فرصت نہیں کہ اپنے عیوب پر نظر کریں، اپنی نجات سے ایسے مطمئن ہیں کہ عشرہ مبشّرہ کو بھی ایسا اطمینان نصیب نہ ہوا ہوگا کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ باوجود بشارت کے بھی

وہ لوگ مرتے دم تک خُدا کی بے نیازی سے ڈرتے ہی رہے۔ اور اُن کو شاید کبھی بھول کر بھی خیال نہیں آتا کہ ہم کو بھی خُدا کے یہاں چل کر کچھ جواب دہی کرنی ہے۔ اصل میں تو کبر یا حسد یا طمع دنیا یا حُبِّ جاہ یا اِسی طرح کی کوئی اور خباثت باعث ہوتی ہے۔ اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا حیلہ بنا رکھا ہے۔ گویا تمام بندگانِ خُدا کے اعمال کی باز پُرس اِن سے ہوتی ہے اور یہ خود مرفوع القلم ہیں نفسی نفسی کی پستی سے نکل مارے شیخی کے اُمّتی اُمّتی کی معراج پر جا دھمکے اور یہ نہ سمجھے کہ یہاں سے پاؤں پھسلا تو پھر اسفل السافلین سے وَرے کہیں آدمی کا ٹھکانا ہی نہیں۔ اور اگر خدا نے دل ہی ایسا بنایا ہے کہ پیغمبری نہیں، محتسبی کی خدمت نہیں؟ مسلمان بھائی کی غلطی دیکھی نہیں جاتی تو خشونت کیوں؟ اور دل آزاری کس لئے، اور صاف صاف بات تو یہ ہے کہ جب اس کو پیشہ ٹھہرالیں اور معاش کے لئے اِسی پر دھرنا دے کر بیٹھیں تو بدگمانی نہ ہوتی ہو تو ہو دوسروں پر اثر ڈالنے کے لئے ضرور ہے۔ خلوص اور شائبۂ غرض کے ہوتے اوّل تو خلوص ہو ہی کیوں، اور ہو تو آدمی فرشتہ ہے، ورنہ نیکی برباد گُنہ لازم۔ غرض مذہب بھی عجب تماشے کی چیز ہے۔ اس کی عینک آنکھوں سے لگا لو تو دوسروں کے تِنّس لٹّھے اور شہتیر دکھائی دینے لگیں اور اپنے پہاڑ اوّل تو دکھائی ہی نہیں دیں گے۔ اور دکھائی دیں گے بھی تو رائی یا خشخاش۔ یا بہت غور سے دیکھو تو جیسے تِل۔ کبر اور خود پسندی کو اگر درخت فرض کریں تو مذہب سے بہتر اس کے لئے کوئی کھاد نہیں۔ اِدھر ڈالا اور اُدھر بھان متی کے درخت کی طرح پتّے پھول پھل سب کچھ تیار موجود، مذہب ایجاد تو ہوا

بدی کی بیخ کنی کے لئے، افسوس ہے کہ اُس کو بدی کا پردہ دار بنایا جائے تو اِس کے یہ معنی ہوں گے کہ پولیس چوروں کا تھا نگی۔ مگر انسان کی سرشت ہی اس طرح کی واقع ہوئی ہے کہ وہ اپنی بدی سے نہیں چوکتا۔ یہاں تک کہ مذہب میں بھی۔ مگر ایک دن آئے گا کہ اُس کی ساری شرارتیں اس پر اور جن کو اپنے زُعم میں دھوکا دے رہا ہے اُن پر ظاہر ہوں گی۔ یُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَمَا یَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا یَشْعُرُوْنَ [1]۔ آدمی بھی ایک طرح کا سربند لفافہ ہے۔ اور خدا نے اُس کو ایسی مضبوطی سے بند کیا ہے کہ دوسرے تو اُس کے اندر کا حال کیا جان سکتے ہیں، یہ خود بھی اپنے دل کے کونے کُھدروں سے اچھی طرح واقف نہیں۔ مرے پیچھے یہ لفافہ کھولا جائیگا۔ اور اُس وقت معلوم ہوگا کہ خط میں کیا لکھا ہے۔ اب تو جس کا جی چاہے لفافے کو خوشنما بنا کر لوگوں کو گرویدہ کر لے مگر یہ لفافہ ہے کے دن کا۔ گٹھری کے میلے ہوتے دیر بھی لگتی ہے اور یہ تو آج قبر میں رکھا اور تیسرے دن بھانڈا پھوٹا۔

(نذیر احمد)

---

[1] اپنے نزدیک اللہ کو اور مسلمانوں کو دھوکا دیتے ہیں اور سوائے اپنے کسی کو دھوکا نہیں دیتے اور اتنی بات بھی نہیں سمجھتے۔



مرزا عبدالرحیم خانخاناں

(بچپن)

سنہ ۹۶۴ھ میں بیرم خاں کا بڑھاپا اقبال کی جوانی میں لہلہا رہا تھا۔ ہیموں کی مہم مار لی تھی، اکبر شکار کھیلتے لاہور کو چلے آتے تھے۔ جو نغمۂ بلبل کے سُروں میں کسی نے آواز دی کہ بڑھاپے کے باغ میں رنگین پھول مبارک ہو۔ فتح کی خوشی میں یہ خوش خبری نیک شگون معلوم ہوئی۔ اس لئے بادشاہ نے جشن کیا۔ وزیر نے خزانے لٹائے اور اپنے بیگانے کو انعام و اکرام سے مالا مال کر دیا۔ بیرم خاں کو تو عالم جانتا ہے۔ ماں کا خاندان بھی معلوم کر لو کہ جمال خاں میواتی کی بیٹی، حسن خاں میواتی کی بھتیجی تھی۔ بڑی بہن بادشاہ کے محل میں تھی۔ چھوٹی وزیر کے حرم سرا میں۔ خالو بادشاہ نے خود عبدالرحیم نام رکھا۔ مبارک مولود کی ولادت خاص اُسی شہر لاہور میں ہوئی۔

یہ پھول قریب تین سال کے ناز و نعمت کی ہوا میں اقبال کے شبنم سے شاداب تھا۔ دفعتہً خزاں کی نحوست ایسی بگولا بن کر لپٹی کہ اُس کے گلشن کو جڑ سے اکھیڑ کر پھینک دیا اور گھاس پھوس کی طرح مدت تک رواں دواں کرتی رہی۔ کوئی نہ جانتا تھا کہ اس کا ٹھکانا بھی کہیں لگے گا یا نہیں۔ ہم کاغذوں کے دیکھنے والے تر...

کھاتے ہیں۔ واے برحال اُس کے رشتہ داروں اور ہوا خواہ نمک خواروں کے، جب اُس کی اور اپنی حالت کو یاد کرتے ہوں گے تو چھاتی پر سانپ لوٹ جاتے ہوں گے کہ کیا تھا اور کیا ہوگیا۔ مگر حق یہ ہے کہ ایسے ہی اونچے سے گرتے ہیں۔ جب اس قدر اونچے نیچے ہیں کہ دیکھنے والے تعجّب کرکے کہتے ہیں "یہ تارا کہاں سے نکل آیا ہے"

خُدا تر نوالہ دے، یا سوکھا ٹکڑا، باپ کا ہاتھ بچّوں کے رزق کا چمچہ، بلکہ اُن کی قسمت کا پیمانہ ہوتا ہے۔ جب بیرم خاں کے اقبال نے مُنہ پھیرا اور اکبر رقیبوں کی باتوں میں آکر دہلی میں آن بیٹھا، بیرم خاں آگرہ میں رہ گئے۔ یہیں سے نحوست کا آغاز سمجھنا چاہیئے۔ حال یہ تھا کہ رفیق ساتھ چھوڑ چھوڑ کر دہلی چلے جاتے ہیں۔ عرضیاں جاتی ہیں تو اُلٹے جواب آتے ہیں۔ عرض معروض کے لئے وکیل پہنچائے تو بند دربار کے طَور بے طَور۔ خبر آتی ہے تو وحشت ناک۔ بچّہ معصوم اِن رازوں کو نہ سمجھتا ہوگا مگر اتنا تو ضرور دیکھتا ہوگا کہ باپ کی مجلس میں رونق نہیں۔ وہ اُمرا اور درباریوں کی بھیڑ بھاڑ کیا ہوگئی؟ باپ کِس فکر میں ہے کہ میری طرف دیکھتا نہیں؟

بیرم خاں بے چارہ کیا کرے کبھی بنگالہ کا ارادہ کرتا ہے کبھی گجرات کا کہ حج کو چلا جائے۔ اِدھر رستہ نہیں پاتا۔ راجپوتانہ کا رُخ کرتا ہے۔ چند روز اِدھر اُدھر پھرتا ہے آخر پنجاب کو آتا ہے۔ کچّا ساتھ، اپنے حال کو سنبھالے کہ عیال و اطفال کو۔ آخر حرم سرا اور جواہر خانہ، توشہ خانہ وغیرہ بہت سے لوازمات و اسباب کو بھٹنڈے میں چھوڑا اور آپ پنجاب میں آیا۔ بھٹنڈے کا حاکم، اپنا نمک پروردہ، خاک اُٹھایا ہوا

تھا، ہاتھوں کا پالا ہوا، چھوٹے سے بڑا کرکے حکومت تک پہنچایا ہوا،
اُس نے مال و عیال کو ضبط کرکے روانہ دربار کر دیا۔ دہلی میں آکر
سب قید، اسباب خزانہ میں داخل، تین چار برس کا بچہ۔ روز کی
پریشانی، اور بے سروسامانی، اور گھر والوں کی سرگردانی، روز نئے
شہر نئے جنگل دیکھ کر حیران ہوتا ہوگا کہ یہ کیا عالم ہے اور ہم کہاں ہیں؟
میری ہوا خوری کی سواریوں اور سب کی دلداریوں میں کیوں فرق آگیا ہے۔
جو لوگ ہاتھوں کی جگہ آنکھوں پر لیتے تھے وہ کیا ہوگئے؟

اس حالت کی تصویر سے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں کہ باپ دربار
سے رخصت ہوکر حج کو چلا گیا۔ گجرات پٹن پر ڈیرے ہیں، ابھی سورج
جھلکتا ہے۔ شام قریب ہے۔ خیال یہ کہ اب خانخاناں آتا ہے، خبر
آئی کہ وہ تو مارا گیا، اُس کے مرتے ہی فوج میں تلاطم مچ گیا، پل کے
پل میں گھر بار افغانوں نے لوٹ لیا۔ کوئی گٹھری لئے جاتا ہے۔
کوئی صندوقچہ، کسی نے مسند گھسیٹ لی۔ کوئی بچھونا لے چلا، اُس
بے کس مردے کے کپڑے تک اُتار لئے۔ اُس بے جان کو کفن
کون دے؟ کہ اپنی جان ہی کا ہوش نہیں۔ وہ تین برس کی جان کیا
کرتا ہوگا؟ سہم کر رہ جاتا ہوگا۔ ماں کی گود میں دبک جاتا ہوگا۔ ڈرتا
ہوگا۔ اناّ کے پاس چھپ جاتا ہوگا۔ افسوس وہ بیچاریاں کہاں
چھپا لیں؟ کہ آپ ہی چھپنے کی جگہ نہیں۔ الٰہی تیری پناہ! عجب وقت ہوگا۔
شام غریباں اُس شام کو کہتے ہیں۔ رات قیامت کی رات گزری ہوئی دن ہوا
تو روز محشر، محمد امین دیوانہ اور زنبور وغیرہ لشکروں کے لڑانے والے
تھے۔ اس وقت کچھ بن نہ آئی تھی۔ پھر بھی ہزار رحمت کہ اُٹھ لئے

قافلہ کو سمیٹا ہے اور احمد آباد کو اُڑے جاتے ہیں۔ موقع پاتے ہیں، تو پلٹ کر ایک ہاتھ مار جاتے ہیں۔

اس وقت پاشکستہ عورتوں کو، جن میں سلیمہ سلطان بیگم اور یہ تین برس کا بچہ بھی شامل ہے، لے نکلنا غنیمت ہے۔ لٹیرے اب بھی دست بردار نہیں ہوئے۔ پیچھے پیچھے لوٹتے مارتے چلے آتے ہیں۔ معصوم بچہ سہما ہوا اِدھر اُدھر دیکھتا ہے اور رہ جاتا ہے۔ کون دلاسا دے؟ اور دے تو ہوتا کیا ہے؟ الٰہی وہ وقت تو دشمن ہی کو نصیب کیجو۔

ان مصیبت زدوں نے لڑتے مرتے احمد آباد میں جاکر دم لیا۔ کئی دنوں میں گئے ہوئے حواس ٹھکانے آئے۔ صلاح ہوئی کہ دربار کے سوا پناہ نہیں ہے۔ پھر چلنا چاہئے۔ چنانچہ چار مہینے کے بعد ضروری سامان بہم پہنچا کر روانہ ہوئے۔ یہاں بھی خبر پہنچ گئی تھی۔ چغتائی دربار دلی اور اکبری عفو و کرم کے دریا میں لہر آئی۔ اُن کے لئے فرمان بھیجا۔ و خانخاناں کے مرنے کا رنج والم اور اُن کی تباہی کا افسوس تھا۔ ساتھ ہی بڑے دلاسے اور دلداری کے ساتھ لکھا تھا کہ عبدالرحیم کو تسلی دو اور بڑی خبرداری و ہوشیاری سے لے کر دربار میں حاضر ہو۔ یہ اطمینان کا تعویذ انھیں خانپور میں ملا۔ بڑا سہارا ہو گیا۔ ہمت بندھ گئی اور حضور میں پہنچے۔

اِس لٹے قافلے کے واسطے وہ وقت عجیب مایوسی اور حیرانی کا عالم ہو گا، جبکہ بابا زنبور سب تباہی زدوں کو لے کر آگرہ پہنچے ہوں گے۔ عورتوں کو محل میں آتارا ہو گا۔ اُس یتیم بچے کو جس کا باپ ایک دن دربار کا مالک تھا، بادشاہ کے سامنے لا کر چھوڑ دیا ہو گا۔ اندوہ شکستہ پائی

عورتوں کے دل دُھکڑ دُھکڑ، باہر اُس کے قدیمی نمک خوار دُعائیں کرتے ہونگے کہ الٰہی باپ کی خدمتوں کو پیش نظر لائیو۔ آخری وقت کی باتوں کو دل سے بھلائیو۔ اس معصوم کے اور ہمارے حال پر مہربان رہیں۔ الٰہی سارا دربار دشمنوں سے بھرا ہے، اس بن باپ کے بچّے کا کوئی نہیں۔ ہماری زندگی اور آئندہ بہبودی کا سہارا کون ہے؟ اگر ہے تو اسی بچّے کی جان ہے، تو ہی اِسے پروان اور تو ہی اس بیل کو منڈھے چڑھائیگا۔

چغتائی سلسلہ میں اِن چند بادشاہوں کا حال خطابخشی کے معاملہ میں قابل تعریف ہے۔ دشمن بھی سامنے آتا تھا تو آنکھ جھپک جاتی تھی بلکہ اِس کی جگہ خود شرمندہ ہو جاتے تھے۔ خطا کا ذکر نہ تھا۔ بھلا یہ تو بچّہ معصوم تھا وہ بھی بیرم کا بیٹا۔ جس وقت سامنے لائے اکبر کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ گود میں اُٹھالیا۔ اُس کے نوکروں کے لئے وظیفے اور تنخواہیں بیش قرار مقرر کیں، اور کہا کہ اس کے سامنے کوئی خان بابا کا ذکر نہ کرو۔ بچّہ ہے دل کُڑھے گا۔ بابا زنبور نے رو کر کہا کہ حضور یہ بار بار پوچھتے ہیں۔ راتوں کو چونک اُٹھتے ہیں، کہ کہاں گئے؟ اب تک کیوں نہیں آئے۔ اکبر نے کہا "کہہ دیا کرو حج کو گئے ہیں خانۂ خُدا میں پہنچ گئے۔ بچّہ ہے باتوں میں بہلا لیا کرو۔ دیکھو اسے ہر طرح خوش رکھو، اِسے یہ نہ معلوم ہو کہ خان بابا سر پر نہیں۔ بابا زنبور۔ یہ ہمارا بیٹا ہے، اِسے ہمارے پیش نظر رکھا کرو"۔

۹۶۹ھ ہجری میں یہ واجب الرحم بچّہ دربار اکبری میں پہنچا تھا۔ اِس کے باپ کے جانی دشمن اب ارکانِ دولت تھے۔ وہ یا اُن کے

خوشامدی ہر وقت حضور میں رہتے تھے۔ اکثر ایسے تذکرے کرتے تھے
جن سے بیرم خاں کی باتیں اکبر کو یاد آئیں، اور اس طرف سے کھٹک
جائے۔ اکثر ان میں سے کھلم کھلا سمجھاتے تھے۔ لیکن اکبر کی نیک نیتی
اور اس لڑکے کا اقبال تھا، کچھ بھی نہ ہوتا تھا۔ بلکہ غیروں کے دل
میں ان باتوں سے رحم پیدا ہوتا تھا۔ اکبر اُسے مرزا خاں کہا کرتا تھا۔
کہ ابتدائی ذکر میں اُسے اہل تاریخ اکثر مرزا خان ہی لکھتے ہیں۔

ہونہار لڑکا اکبری سایہ میں پرورش پانے لگا، اور بڑا ہوکر ایسا
نکلا کہ مورخ اُس کی لیاقت علمی کی گواہی دیتے ہیں بلکہ علمیت سے
زیادہ تیزیِ فکر اور قوت حافظہ کی تعریف لکھتے ہیں۔ علوم و فنون
کی کیفیت اور اثنائے تحصیل اور حد تحصیل کی شرح کسی نے نہیں کھولی۔
قرینہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے ابتدا سے عمر کو امیرزادوں کی طرح
کھیل کود کر برباد نہیں کیا۔ چونکہ جب بڑا ہوا تو علم کا قدردان تھا۔ اہل تصنیف
اور شعرا کو عزیز رکھتا تھا۔ خود بھی شاعر تھا۔ زبان عربی سے واقف تھا، اور
بے تکلف بولتا تھا۔ زبان ترکی اور فارسی جو اس کے باپ دادا کی میراث
تھی، اُسے جانے نہ دیا۔ حاضر جواب، لطیفہ گو، بذلہ سنج بُلبُل ہزار داستان
تھا۔ سنسکرت میں بھی اچھی لیاقت حاصل کی تھی۔ فن جنگ میں اعلیٰ درجہ
کی قابلیت رکھتا تھا۔

اس کے باپ کے چند وفادار جان نثار ساتھ تھے۔ جو محبت کی
زنجیروں سے جکڑے ہوئے تھے اور اپنی قسمتوں کو اس ہونہار اقبال
کے ہاتھ بیچے بیٹھے تھے۔ اِس اُمّید پر کہ اس کے ہاں مینھ برسے گا
تو ہمارے گھر میں بھی پرنالے گریں گے۔ حرم سرا میں کچھ

شریف زادیاں اور پرستاریں تھیں جو وفاداری کے ساتھ بےکسی
اور بے بسی کی چادروں میں لپٹی بیٹھی تھیں۔ حسرت و ارمان، اُمّید و
نااُمیدی، اُن کے خیالوں میں ایک طلسمات بناتی تھی، ایک بگاڑتی
تھی۔ بادشاہی دربار خُدائی عجائب خانہ تھا۔ امیر اور سردار کہ وہاں سے جواہر
کی پُتلیاں بن کر نکلتے تھے۔ اُس کے رفیق دیکھتے تھے اور رَہ جاتے تھے۔
دل میں کہتے تھے، ایک دن اس کا باپ جس کو چاہتا تھا، اُسے جواہرات
اور موتیوں میں چھپا دیتا تھا۔ کاش بیٹا ویسے انعاموں میں بھی شامل
ہو جائے۔ اُس میں سب قدرت ہے۔ وہ چاہے تو پھر وہی تماشا
دکھائے۔ دن، رات، صُبح، شام، آدھی رات آسمان کی طرف
ہاتھ تھے، اور خُدا کی طرف دھیان تھے۔ دل میں آمین آمین کہہ رہے تھے۔

دربارِ اکبری۔ آزاد

سچ اور جھوٹ کا رزم نامہ

"اُردو سے جو محبّت کرتا ہے اُسے اس کی بے مائگی کا احساس
ضرور ہوتا ہے جسے اُس سے لگاؤ ہوتا ہے وہ یہی چاہتا ہے کہ اُس کی
زبان جتنی زیادہ ترقّی کرے اچھا ہے۔ اُردو پر جان دینے والوں
اور اُسے بلندی اور ترقّی کی شاہراہوں پر لگانے والوں میں محمد حسین آزاد
کا ایک بڑا حصّہ ہے۔ اُنھوں نے اُردو میں جہاں بیسوں اعلیٰ معیار کی
تنقیدی، ادبی، اور درسی کتابیں لکھیں وہاں اُنھیں یہ بھی خیال
پیدا ہوا کہ مغرب کے بلند اور گہرے علوم کے جواہرات سے اُردو نثر

کے خزانے کو سجائیں اور اس طرح سجائیں کہ آنکھیں اور دل دونوں کو
لذّت حاصل ہو۔ مضامین بھی بلند اور سبق آموز ہوں اور طرزِ بیان بھی
شیریں اور دل لبھانے والا، اس نیت سے انھوں نے بہت سے
مضامین تمثیل کے پیرائے میں لکھے۔ جو ظاہراً تو رنگین تشبیہوں اور دلفریب
استعاروں سے سجے ہوئے معلوم ہوتے ہیں، لیکن ان کے اندر بلند اخلاقی
نکات حل کئے گئے ہیں۔ اُن کے یہ مضامین دو کتابوں کی شکل میں ایک جگہ
شائع ہو چکے ہیں۔ نیرنگ خیال حصّہ اوّل، اور نیرنگ خیال حصّہ دوم۔
اِن مضامین میں شاعرانہ دلفریبیاں بھی ہیں اور ناصحانہ نکات بھی ۔
کام کی باتیں بھی ہیں اور دل بہلانے کا سامان بھی، دل کے سرور
کا سرمایہ بھی ہے اور دماغ کی بلندی کے لئے ایک تازیانہ بھی۔
سچ اور جھوٹ کا رزم نامہ انھیں مضامین میں سے ایک ہے "

عہد قدیم کے مورّخ لکھتے ہیں کہ اگلے زمانے میں فارس کے
شرفاء اپنے بچّوں کے لئے تین باتوں کی تعلیم میں بڑی کوشش کرتے
تھے۔ شہ سواری۔ تیر اندازی اور راست بازی۔ شہ سواری اور تیر اندازی
تو بے شک سہل آ جاتی ہوگی مگر کیا اچھی بات ہوتی اگر ہمیں معلوم ہو جاتا
کہ راست بازی کِن کِن طریقوں سے سکھاتے تھے اور کون سی سپر
تھی کہ جب دروغ دیوزاد آکر اُن کے دلوں پر شہنہ جادو مارتا تھا۔
تو یہ اُس چوٹ سے اس کی اوٹ میں بچ جاتے تھے۔

اس میں شک نہیں کہ دُنیا بُری جگہ ہے، چند روزہ عمر میں بہت سی
باتیں پیش آتی ہیں، جو اُس مُشتِ خاک کو اُس دیوِ آتش زاد کی اطاعت
کے لئے مجبور کرتی ہیں۔ انسان سے اکثر ایسا جُرم ہو جاتا ہے کہ اگر قبولے

تو مرنا پڑتا ہے، ناچار مکرنا پڑتا ہے۔ کبھی ابلہ فریبی کرکے جاہلوں
کو پھنساتا ہے، جب لقمۂ رزق پاتا ہے۔ اس کے علاوہ بہت
مزے دُنیا کے ہیں کہ مکرودغا اُن کی چاٹ لگاتی ہے، اور جزوی جزوی
خطائیں ہو جاتی ہیں جن سے مکرتے بن آتی ہے۔ غرض بہت کم انسان
ہوں گے جن میں یہ حوصلہ و استقلال ہو کہ راستی کے راستہ میں
ہردم ثابت قدم ہی رہیں۔

یہ بھی یاد رہے کہ انسان کے سچ بولنے کے لئے سُننے والے
بھی ضرور ہیں۔ کیونکہ خوشامد جس کی دُکان میں آج موتی برس رہے
ہیں۔ اس سے زیادہ جھوٹ کیا ہوگا اور کون ہے جو اس قید کا زنجیری
نہیں؟ ڈرپوک بے چارا ڈر کا مارا خوشامد کرتا ہے، تابعدار اُمید کا
بھوکا آقا کو خوش کرکے پیٹ بھرتا ہے۔ دوست محبّت کا بندہ ہے،
اپنے دوست کے دل میں اسی سے گھر کرتا ہے۔ بہت سے ایسے بھی ہیں
کہ نہ غلام ہیں نہ ڈرپوک۔ اُنھیں باتوں باتوں ہی میں خوش کردینے کا
شوق ہے۔ اِس طرح جب جلسوں میں گدھوں کے دعوے بُل ڈاگ
کی آواز سے کئی میدان آگے نکل جاتے ہیں، اُن میں وہ لوگ بھی ہوتے
ہیں، جنھیں کچھ اُمید، کچھ ڈر، کچھ مروّت سے غرض چاروناچار،
کبھی اِن کے ساتھ، کبھی اُن کے ساتھ، کبھی پیچھے پیچھے دوڑنا
پڑتا ہے۔ آج کل تو یہ حال ہے کہ جھوٹ کی عملداری دور دور تک
پھیل گئی ہے، بلکہ جن صاحب تمیزوں کو قوّت عقلی جھوٹ بولنے دیتی
اور خود اس مُردار سے متنفر ہیں، وہ بھی اِسی کے حامی ہوکر اوروں کے
اخلاق خراب کرتے ہیں۔

سچ کا عجیب حال ہے کہ اتنا تو اچھا ہے مگر پھر بھی لوگ اسے ہر وقت اچھا نہیں سمجھتے۔ چنانچہ جب کسی شئے پر دل آجاتا ہے اور سچ اس کے برخلاف ہوتا ہے تو اس وقت سچ سے زیادہ کوئی بُرا ہی نہیں معلوم ہوتا۔ اصل یہ ہے کہ حضرت انسان کو حقیقت اور واقفیت سے کچھ غرض نہیں، جس چیز کو جی نہیں چاہتا اُس کا جاننا بھی نہیں چاہتے۔ جو بات پسند نہیں آتی اُس کا ذکر بھی نہیں سنتے۔ اِس کان سنتے ہیں اُس کان نکال دیتے ہیں۔

حکیموں نے جھوٹ سے متنفر ہونے کی بہت سی تدبیریں نکالی ہیں۔ جس طرح بچوں کو کڑوی دوا مٹھائی میں ملا کر کھلاتے ہیں، اُسی طرح انواع و اقسام کے رنگوں میں اُس کی نصیحتیں ہیں، تاکہ لوگ اسے ہنستے کھیلتے چھوڑ دیں۔

واضح ہو کہ ملکۂ صداقت زمانی، سلطان آسمانی، کی بیٹی تھی جو کہ ملکہ دانش خاتون، کے پیٹ سے پیدا ہوئی تھی۔ جب ملکہ موصوفہ نے ہوش سنبھالا تو اوّل تعلیم و تربیت، کے سپرد ہوئی۔ جب انھوں نے اس کی پرورش میں اپنا حق ادا کر لیا تو باپ کے دربار میں سلام کو حاضر ہوئی۔ اِسے نیکی و نیک ذاتی کے ساتھ خوبیوں اور محبوبیوں کے زیور سے آراستہ دیکھ کر سب نے صدق دل سے تعریف کی۔ عزت دوام، کا تاج مرصّع سر پر رکھا گیا، اور حکم ہوا کہ جاؤ اولاد آدم میں اپنا نور پھیلاؤ۔ عالم سفلی، میں دروغ دیوزاد، ایک سفلہ نابکار تھا کہ حمق تیرہ دماغ، اُس کا باپ تھا اور ہوس ہوا پرست، اُس کی ماں تھی۔ اگرچہ اُسے دربار میں آنے کی اجازت نہ تھی، مگر جب

کسی تفریح کی صحبت میں 'تمسخر اور ظرافت' کے بھانڈ آیا کرتے تھے تو اِن کی سنگت میں وہ بھی آجاتا تھا۔ اتفاقاً اُس دن وہ بھی آیا ہوا تھا اور بادشاہ کو ایسا خوش کیا تھا کہ اُسے ملبوس خاص کا خلعت مِل گیا تھا۔ یہ منافق دل میں 'سلطان آسمانی' سے سخت عداوت رکھتا تھا۔ 'ملکہ' کی قدر و منزلت دیکھ کر اُسے حسد کی آگ نے بھڑکایا۔ چنانچہ وہاں سے چُپ چُپاتے نکلا اور 'ملکہ' کے عمل میں خلل ڈالنے کو ساتھ ساتھ روانہ ہوا۔ جب یہ دو دعویدار نئے مُلک اور نئی رعیّت کے تسخیر کرنے کو اُٹھے تو چونکہ بزرگان آسمانی کو ان کی دشمنی کی بنیاد ابتدا سے معلوم تھی، سب کی آنکھیں اِدھر لگ گئیں کہ دیکھیں اِن کی لڑائی کا انجام کیا ہو۔

'سچ' کے زور و طاقت کو کون نہیں جانتا؟ چنانچہ 'ملکہ صداقت' کو بھی حقیقت کے دعوے تھے۔ اُٹھی، اور اپنے زور میں بھری ہوئی اُٹھی۔ اِسی واسطے بلند اُٹھی۔ اکیلی آئی، اور کسی کی مدد ساتھ نہ لائی۔ ہاں آگے آگے، 'فتح و اقبال'، نور کا غبار اُڑاتے آتے تھے، اور پیچھے پیچھے 'ادراک' پر پرواز تھا۔ مگر صاف معلوم ہوتا تھا کہ تابع ہے، شریک نہیں۔ 'ملکہ' کی شان شاہانہ تھی اور دبدبہ خسروانہ تھا۔ اگرچہ آہستہ آہستہ آتی تھی، مگر استقلال رکاب پکڑے تھا، اور جو قدم اُٹھتا تھا، دس قدم آگے پڑتا نظر آتا تھا۔ ساتھ اس کے جب ایک دفعہ جم جاتا تھا تو انسان کیا فرشتہ سے بھی نہ ہٹ سکتا تھا۔

'دروغ دیوزاد' بہروپ بدلنے میں طاق تھا۔ 'ملکہ' کی ہر بات کی نقل کرتا تھا، اور نئے نئے سوانگ بھرتا تھا، تو بھی وضع اُس کی گھبرائی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ 'دُنیا کی ہوا و ہوس' ہزاروں رسالے

اور پلٹنیں لئے اُس کے ساتھ تھیں اور چونکہ یہ اُن کی مدد کا محتاج تھا،
اِسی اَلیچ کا مارا کمزور، تابعداروں کی طرح اُن کا حکم اُٹھاتا تھا۔ ساری
حرکتیں اُس کی بے معنی تھیں اور کام بھی اُلٹ پلٹ، بے اوسان تھے
کیونکہ اُستقلال اِدھر نہ تھا، اپنی شعبدہ بازی اور نیرنگ سازی
سے فتحیاب تو جلد ہو جاتا تھا مگر تھم نہ سکتا تھا۔ ہوا وہوس اُس کے
یار وفادار تھے اور کچھ تھے تو وہی سنبھالے رہتے تھے۔

کبھی کبھی ایسا بھی ہو جاتا تھا کہ دونوں کا آمنا سامنا ہو کر سخت
لڑائی آپڑتی تھی۔ اُس وقت دُروغ دیوزاد، اپنی دھوم دھام بڑھانے
کے لئے سر پہ بادل کا دُھواں دھار بگڑ لپیٹ لیتا تھا۔ لاف وگزاف، کو
حکم دیتا کہ شیخی ونمود، کے ساتھ آگے جا کر غُل مچانا شروع کر دو، ساتھ ہی
دغا کو اشارہ کر دیتا تھا کہ گھات لگا کر بیٹھ جاؤ۔ دائیں ہاتھ میں طراری،
کی تلوار، بائیں میں بے حیائی کی ڈھال ہوتی تھی، غلط نما، تیروں کا
ترکش آویزاں ہوتا تھا۔ ہوا وہوس، دائیں بائیں دوڑتے پھرتے
تھے۔ دل کی ہٹ دھرمی، بات کی پچ، پیچھے سے زور لگاتے تھے۔
غرض کبھی مقابلہ کرتا تھا۔ تو ان زوروں کے بھروسے پر کرتا تھا۔ اور
باوجود اس کے ہمیشہ یہی چاہتا تھا کہ دُور دُور سے لڑائی ہو۔ میدان میں
آتے ہی تیروں کی بوچھار کر دیتا تھا۔ مگر وہ بھی بادِ ہوائی، اٹکل پچو،
بے ٹھکانے ہوتے تھے، خود ایک جگہ پر نہ ٹھہرتا تھا۔ دم بہ دم جگہ بدلتا
تھا، کیونکہ حق کی کمان سے جب تیر نظر اس کی طرف سر ہوتا تھا، تو جھٹ
تاڑ جاتا تھا۔ ملکہ، کے ہاتھ میں اگرچہ باپ کی کڑک بجلی کی تلوار نہ تھی مگر
تو بھی چہرہ ہیبت ناک تھا اور رُعب خُداداد، کا خود سر پر دھرا تھا۔ جب

معرکہ مار کر' ملکہ' فتح یاب ہوتی تھی تو یہ شکست نصیب اپنے تیروں کا ترکش پھینک 'بے حیائی' کی ڈھال مُنہ پر لے 'ہوا و ہوس' کی بھیڑ میں جاکر چھپ جاتا تھا۔ نشان لشکر گر پڑتا تھا اور لوگ پھریرا پکڑے زمین پر گھسیٹتے پھرتے تھے۔

'ملکہ صداقت زمانی' کبھی کبھی زخمی بھی ہوتی تھی، مگر سانچ کو آنچ نہیں۔ زخم جلد بھر آتے تھے، اور جھوٹا نابکار جب زخم کھاتا تھا تو ایسے سڑتے تھے کہ اوروں میں بھی وبا پھیلا دیتے تھے، مگر ذرا انگور بندھے اور پھر میدان میں آن کودا۔

'دروغ دیوزاد' نے تھوڑے ہی تجربے میں معلوم کر لیا تھا کہ بڑائی اور دانائی کا پردہ اِسی میں ہے کہ ایک جگہ نہ ٹھہروں، اِس لئے 'دھوکہ بازی' اور 'شبہہ کاری' کو حکم دیا کہ ہمارے چلنے پھرنے کے لئے ایک سڑک تیار کرو، مگر اس طرح کے اینچ پینچ اور ہیر پھیر دے کر بناؤ کہ 'شاہراہِ صداقت' جو خطِ مستقیم میں ہے اُس سے کہیں نہ ٹکرائے۔ چنانچہ جب اس نابکار پر کوئی حملہ کرتا تھا تو اِسی رستے سے، جدھر چاہتا تھا نکل جاتا تھا اور جدھر سے چاہتا تھا، پھر آن موجود ہوتا تھا۔

اِن رستوں سے اُس نے ساری دُنیا پر حملے کرنے شروع کر دئے۔ اور بادشاہت اپنی تمام عالم میں پھیلا کر' دروغ شاہ' دیوزاد کا لقب اختیار کیا۔ جہاں جہاں فتح پاتا تھا 'ہوا و ہوس' کو اپنا نائب چھوڑتا اور آپ فوراً کھسک جاتا۔ وہ اس فرمان روائی سے بہت خوش ہوتے

---

[1] مثل مشہور ہے "جھوٹ کے پاؤں کہاں"

تھے، اور جب ملکہ کا لشکر آتا تھا تو بڑی گھاتوں سے مقابلے کرتے تھے۔ جھوٹ قسموں کی ایک لمبی زنجیر بنائی تھی، سب اپنی کمریں اُس میں جکڑ لیتے تھے کہ ہرگز ایک دوسرے کا ساتھ نہ چھوڑیں گے۔ مگر سچ کے سامنے جھوٹ کے پاؤں کہاں؟ لڑتے تھے، اور متابعت کر کے ہٹتے تھے۔ پھر اِدھر ملکہ نے مُنہ پھیرا اُدھر باغی ہو گئے۔ ملکہ جب آسمان سے نازل ہوئی تھی تو سمجھتی تھی کہ بنی آدم میرے آنے سے خوش ہوں گے، جو بات سُنیں گے، اُسے مانیں گے، اور حکومت میری تمام عالم میں پھیل کر مستقل ہو جائے گی۔ مگر یہاں دیکھا کہ گزارہ بھی مشکل ہے، لوگ ہٹ دھرمی کے بندے ہیں اور ہوا و ہوس، کے غلام ہیں۔ اس میں شک بھی نہیں کہ ملکہ کی حکومت آگے بڑھتی تھی مگر بہت تھوڑی تھوڑی۔ اس پر بھی یہ دشواری تھی، ذرا اس طرف سے ہٹی اور پھر بد عملی ہو گئی، کیونکہ ہوا و ہوس، جھٹ بغاوت کا نقارہ بجا، دشمن کے زیر علم جا موجود ہوتے تھے، ہرچند "ملکہ صداقت زمانی" اِن باتوں سے کچھ دبتی نہ تھی، کیونکہ اس کا ذرا کسی کے بس کا نہ تھا، مگر جب بار بار ایسے پاجی کمینے کو اپنے مقابلہ پر دیکھتی تھی اور اس میں سوائے مکر و فریب اور کمزوری بے ہمتّی کے اصالت و شجاعت کے نام نہ پاتی تھی تو گھٹتی تھی، اور دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتی تھی۔ جب سب طرح سے نا اُمید ہوئی تو غصہ ہو کر اپنے باپ "سُلطان آسمانی" کو لکھا کہ "مجھے اپنے پاس بُلا لیجئے۔ دُنیا کے لوگ اس شیطان کے تابع ہو کر جن بلاؤں میں خوش ہیں اُنھیں میں رہا کریں۔ اپنے کئے کی سزا آپ پالیں گے" "سلطان آسمانی" اگرچہ اِس عرضی کو پڑھ کر بہت خفا ہوا، مگر پھر بھی کوتاہ اندیشوں کے حال پر ترس کھایا اور سمجھا کہ اگر "سچ" کا قدم

دُنیا سے اُٹھا تو جہان اندھیرا، اور تمام عالم تہ و بالا ہو جائے گا چنانچہ اس خیال سے اس کی عرض نامنظور کی۔ساتھ اس کے یہ بھی گوارا نہ ہوا کہ میرے جگر کا ٹکڑا جھوٹے بداصلوں کے ہاتھوں یوں مصیبت میں گرفتار رہے۔اُسی وقت عالم بالا کے پاک نہادوں کو جمع کر کے ایک انجمن منعقد کی۔اُس میں دو امر تنقیح طلب قرار پائے۔

(۱) کیا سبب ہے کہ ملکہ کی کارروائی اور فرمانروائی دُنیا میں ہردل عزیز نہیں ؟

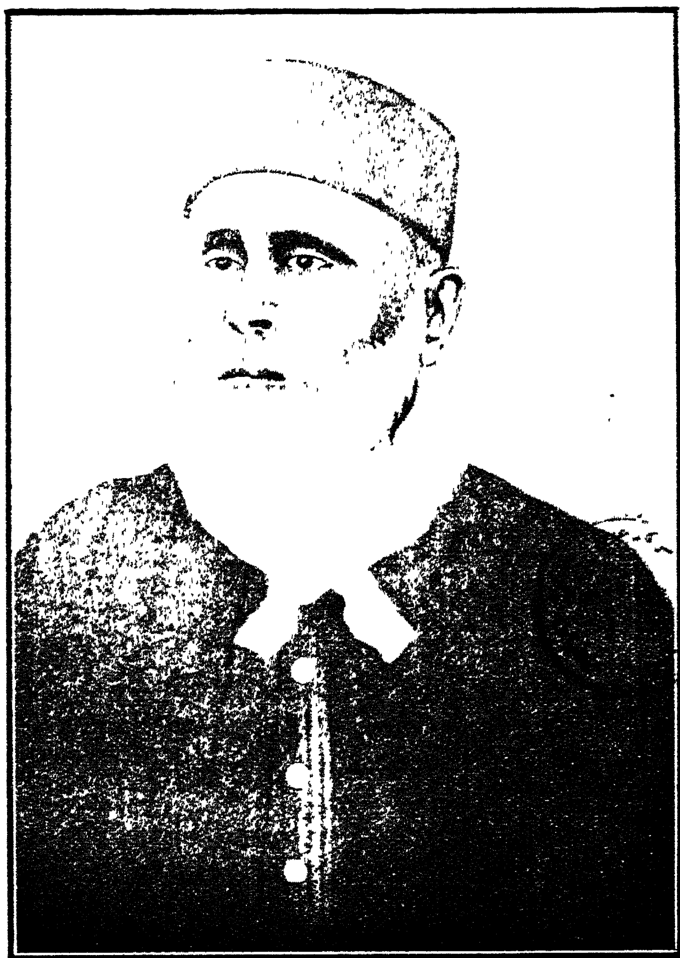
(۲) کیا تدبیر ہے جس سے اُس کے آئینِ حکومت کو جلد اہلِ عالم میں رسائی ہو، اور اُسے بھی ان تکلیفوں سے رہائی ہو؟

کمیٹی میں یہ بات کھُلی کہ درحقیقت ملکہ کی طبیعت میں ذرا سختی ہے اور کارروائی میں تلخی ہے صدرِ انجمن نے اتفاق رائے کر کے اس قدر زیادہ کہا کہ ملکہ کے دماغ میں اپنی حقیقت کے دعووں کا دھواں اس قدر بھرا ہے کہ وہ ہمیشہ ریل گاڑی کی طرح سیدھے خط میں چل کر کامیابی چاہتی ہے جس کا زور طبیعتوں کو سخت، اور دھواں آنکھوں کو کڑوا معلوم ہوتا ہے بعض اوقات لوگوں کو اُس کی راستی سے نقصان اُٹھانے پڑتے ہیں، کبھی ایسے فساد اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں جن کا سنبھالنا مشکل ہو جاتا ہے۔اور یہ زمانہ ایسا ہے کہ دور اندیشی اور صلاحِ وقت کے بغیر کام نہیں چلتا۔پس اُسے چاہئے کہ جس طرح ہو سکے اپنی تلخی اور سختی کی اصلاح کرے۔جب تک یہ نہ ہوگا لوگ اُس کی حکومت کو رغبت سے قبول نہ کریں گے، کیونکہ دیو دروغ، کی حکومت کا ڈھنگ بالکل اُس کے برخلاف ہے۔اوّل تو اُس میں فارغ البالی بہت ہے اور جو لوگ اُس کی رعایا میں داخل ہو جاتے ہیں اُنھیں سوائے

عیش و آرام کے دُنیا کی کسی بات سے خبر نہیں ہوتی۔ دوسرے وہ خود بہروپیا ہے۔ جو صورت سب کو بھائے وہی روپ بھر لیتا ہے اور اوروں کی مرضی کا جامہ پہنے رہتا ہے۔" غرض اہل انجمن نے صلاح کر کے ملکہ کے طرز لباس بدلنے کی تجویز کی۔ چنانچہ ایک ویسا ہی ڈھیلا ڈھالا جامہ تیار کیا جیسا کہ جھوٹ پہنا کرتا تھا، اور وہ پہن کر لوگوں کو جُل دیا کرتا تھا۔ اس جامہ کا مصلحت زمانہ، نام ہوا۔ چنانچہ اس خلعت کو زیب بدن کر کے ملکہ پھر ملک گیری کو اُٹھی۔ جس ملک میں پہنچتی اور آگے کو رستہ مانگتی۔ ہوا و ہوس، حاکم وہاں کے، اُسے ' دروغ شاہ دیوزاد ' سمجھ کر آتے اور شہر کی کنجیاں نذر گزرانتے۔ اِدھر اس کا دخل ہوا اُدھر ادراک ' آیا اور جھٹ وہ جامہ اُتار لیا۔ جامہ کے اُترتے ہی اُس کی اصلی روشنی اور ذاتی حُسن و جمال پھر چمک کر نکل آیا۔

چنانچہ اب یہی وقت آگیا ہے۔ یعنی جھوٹ اپنی سیاہی کو ایسا رنگ آمیزی کر کے پھیلاتا ہے کہ سچ کی روشنی کو لوگ اپنی آنکھوں کے لئے مُضر سمجھنے لگے ہیں۔ اگر سچ کہیں پہنچ کر اپنا نور پھیلانا چاہتا ہے تو پہلے جھوٹ سے کچھ زرق برق کپڑے مانگ تانگ کر لاتا ہے۔ جب تبدیل لباس کر کے وہاں جا پہنچتا ہے تو وہ لفافہ اُتار کر پھینک دیتا ہے، پھر اپنا اصلی نور پھیلاتا ہے کہ 'جھوٹ' کی قلعی کھُل جاتی ہے۔

محمد حسین آزاد



مولانا الطاف حسین حالي پانی پتی

تجارت کا اثر عقل اور اخلاق پر

[حالیؔ اُردو میں ایک بلند پایہ نقّاد اور جدید اُردو شاعری کے
ایک بہت بڑے پیش رو کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ اُن کی نظم
اور نثر کی متعدّد مشہور تصانیف کے علاوہ اُن کے وہ مضامین بھی
بے حد قابلِ قدر ہیں جو اُنھوں نے وقتاً فوقتاً مختلف رسالوں اور
اخباروں کے لئے لکھے۔ کچھ عرصہ ہوا مولانا وحید الدین سلیمؔ مرحوم
نے اُن کے چند مضامین ایک جگہ جمع کرکے چھپوا دئے تھے، لیکن
اب انجمن ترقی اُردو کی طرف سے اُن کے ادبی۔ تنقیدی۔ اصلاحی
اور دوسرے مضامین کے دو مجموعے شائع ہوئے ہیں جن میں اُن کے
قریب قریب سب مضامین موجود ہیں۔ یہ مضمون پہلے حصّے میں شامل
ہے اور اصل میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میگزین میں شائع ہو چکا
ہے۔ اس کے چند درمیانی حصّے اس جگہ حذف کر دئے گئے ہیں]

جس طرح بڑے بڑے کامیاب تاجر نوکری کو نہایت حقارت
کی نظر سے دیکھتے ہیں، اور اُس کو ایک ادنیٰ درجے کی غلامی اور آزادی
کی برباد کرنے والی سمجھتے ہیں، اُسی طرح وہ لوگ جنھوں نے
علم و فضل یا مناصب و خدمات کی وجہ سے امتیاز حاصل کیا ہے۔ بیوپار
اور دوکانداری کو قوائے ذہنی اور عقل و اخلاق کے حق میں نہایت
مضر بتاتے ہیں۔ مگر حق یہ ہے کہ تجارت میں ہمیشہ وہی لوگ کامیاب
ہوئے ہیں اور ہوتے ہیں جن کے اخلاق درست اور عقل سلیم
ہوتی ہے۔ ایک لائق مصنّف لکھتا ہے:۔

"تجارت کے برابر کوئی چیز انسان کے اخلاق کی کسوٹی نہیں ہے۔
ایک عالم جو محض کتابوں کے مطالعہ اور فلسفیانہ استدلال و احتجاج
میں رات دن مصروف رہتا ہے، وہ خود نہیں جانتا کہ میں کیا چیز ہوں۔
اگر وہ اپنی حقیقت سے آگاہ ہوتا اور اپنی عقل اور اخلاق کی آزمائش
کرنی چاہتا ہے تو اُس کو چاہئے کہ بازار میں قدم رنجہ کرے، تب
اُس کو بہت جلد معلوم ہو جائے گا کہ وہ دانشمند اور نیک آدمی
ہے یا احمق اور شریر النفس۔ اُس کی کامیابی اور ناکامی خود اُس کو
اپنی حقیقت سے خبردار کر دے گی"

پس جو قوم تجارت سے کچھ تعلق نہیں رکھتی اُس کے کسی فرد
کی نسبت قطعی طور پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ دانشمند یا نیک نہاد ہے
یا احمق اور بد نہاد۔

اگرچہ تاجر ہمیشہ مذہب یا کانشنس کی ہدایت سے اپنے اخلاق
کی اصلاح نہیں کرتا بلکہ وہ اپنی کامیابی اسی میں سمجھتا ہے کہ اُس کی
دیانتداری، خوش معاملگی، اور راست بازی پر لوگوں کو اعتماد
ہو۔ لیکن جیسا کہ خصائل انسانی کا خاصہ ہے، رفتہ رفتہ یہ
خصلتیں جو اُس نے بہ ضرورت اختیار کی تھیں، اُس کی طبیعت
ثانی بن جاتی ہیں۔

یہ کہنا کہ تجارت قوائے عقلیہ کے حق میں مُضر ہے واقع کے
بالکل خلاف ہے۔ جس قدر تاجر کو اپنی عقل و تدبیر سے
کام لینے کی ضرورت ہوتی ہے، ایسی اور کسی پیشے والے
کو نہیں ہوتی۔

conscience ضمیر

[illegible]

نوکری پیشہ کو اپنی نوکری پر قائم رہنے یا ترقی کرنے کے لئے صرف اپنے معمولی فرائض ادا کرنے کی ضرورت ہے، اور کسان کی جو کامیابی فقط اُس کی محنت، بخت و اتفاق پر موقوف ہے، مگر تاجر کو باوجود اُن تمام فرائض کے جو ایک سچے تاجر کو ادا کرنے ضرور ہیں ہر وقت عقل سے مشورہ لینے اور ایک شطرنج باز کی طرح نت نئی چال چلنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ ہر وقت زمانے کے تیور دیکھتا اور پبلک کے دل ٹٹولتا رہتا ہے۔

ایک وقت اُس کو قرض لے کر کام چلانا بہت مفید پڑتا ہے مگر دوسرے وقت، قرضے کی بدولت اُس کو نقصان عظیم اُٹھانا پڑتا ہے۔ اُس کو اپنے گاہکوں کی نسبت فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ کن کو نقد سودا دینا چاہئے اور کن کو اُدھار پر؟

کبھی نہایت قلیل فائدے پر بلکہ برابر سرابر مال فروخت کر ڈالنا اُس کے حق میں مفید ہوتا ہے اور کبھی اُس کے فروخت کرنے میں جس قدر زیادہ دیر ہوتی جاتی ہے اُسی قدر اُس کی قیمت بڑھتی جاتی ہے۔

اکثر اوقات اُس کو فائدہ کثیر کے لالچ میں راست بازی کے خلاف عمل درآمد کرنے کی ترغیب ہوتی ہے، مگر اُسی کے ساتھ اِس بات کا بھی خوف دامنگیر ہوتا ہے کہ اگر یہ راز کھُل گیا تو پھر اعتبار نہ رہے گا۔

غرض کہ اس قسم کی بے شمار حالتیں جن میں انسان متردّد ہوتا ہے کہ کونسی حالت اختیار کی جائے، تاجر کو قدم قدم پر پیش

آتی ہیں ۔ اور اُس کو عقل و تدبیر سے کام لینے اور کامل غور و فکر کرنے پر مجبور کرتی ہیں اور اس طرح تاجر کی عقل معاش روز بروز جلا پاتی جاتی ہے۔

نوکری پیشہ یا کاشتکار کو اس قسم کے مرحلے بہت کم پیش آتے ہیں۔ یہ لوگ معمولی قواعد کی شارع عام پر آنکھیں بند کئے چلے جاتے ہیں۔ نوکری پیشہ اگر اپنے فرائض دیانت اور محنت کے ساتھ انجام دیتا ہے تو اُس کو اس بات کا مطلق اندیشہ نہیں کہ میری وجہ معین میں کچھ کمی ہو جائے گی۔

کاشتکار کی کامیابی زیادہ تر آسمانی مدد پر منحصر ہے، جس میں انسانی عقل و تدبیر کو کچھ دخل نہیں۔

اس لئے پہلا عدم ضرورت کے سبب اور دوسرا عدم قدرت کے سبب عقل اور تدبیر سے بہت کم کام لیتا ہے۔

مگر تاجر خوب جانتا ہے کہ ذرا چال چوکا اور مصیبت میں گرفتار ہوا۔ اس وجہ سے اُس کو نہایت پھونک پھونک کر قدم رکھنا پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو قوم تجارت سے کچھ تعلق نہیں رکھتی اور نوکری کے سوا کسی اور ذریعہ سے معاش پیدا نہیں کرتی، چند نسلوں کے بعد اُن میں تدبیر معاش کا مادّہ باقی نہیں رہتا۔ کیونکہ جس طرح کسی عضو کے معطل و بیکار رکھنے سے اُس کی قوت زائل ہو جاتی ہے اور اُس میں سکت باقی نہیں رہتی، اسی طرح قوائے ذہنیہ سے جب کچھ کام نہیں لیا جاتا تو بالکل از کار رفتہ ہو جاتے ہیں۔ اگرچہ یہ ممکن ہے کہ اس قوم میں مستثنیٰ مثالیں ایسے اشخاص کی پائی جائیں جو اعلیٰ درجہ

کی عقلِ معاش رکھتے ہوں۔ لیکن ایسے مستثنیات سے قاعدہ کلّیہ نہیں ٹوٹ سکتا۔

جس طرح تجارت سے عقل معاش ترقی پاتی ہے اُسی طرح عمدہ اخلاق اور نیک خصلتیں صرف تجارت ہی کے ذریعے سے تمام قوم میں شائع ہوتی ہیں۔ جُزرسی اور کفایت شعاری، جس کے بغیر کسی خاندان بلکہ کسی قوم کا وقار دُنیا میں نہیں رہ سکتا، صرف تجارت ہی کی بدولت تمام قوم میں سرایت کرتی ہے۔ اگرچہ ممکن ہے کہ ہر ایک قوم میں خواہ وہ قوم تجارت پیشہ ہو اور خواہ نوکری پیشہ، کچھ افراد جُزرسی اور کفایت شعاری کے ساتھ موصوف پائے جائیں، لیکن ہمارے نزدیک کوئی قوم عام طور پر جزورس اور کفایت شعار نہیں ہوسکتی جب تک کہ عام طور پر اُس میں تجارت شائع نہ ہو۔

تجارت کے اصول جن کی پابندی کرنی تاجر کو لازم ہوتی ہے۔ خود بخود اُس کو جزورس اور کفایت شعار بنادیتے ہیں۔ ایک مہاجن کی نقل مشہور ہے کہ اُس کا بیٹا آوارہ اور بدچلن ہوگیا تھا۔ اُس نے باپ کی بہت سی دولت اُس کی زندگی ہی میں اُڑادی۔ ہرچند باپ ملامت اور نصیحت کرتا تھا مگر اُس کے کان پر جوں بھی نہ رینگتی تھی۔ آخر جب مہاجن مرنے لگا تو اُس نے بیٹے کو وصیت کی کہ "جو کچھ مال و دولت میں چھوڑتا ہوں اُس کے خرچ کرنے نہ کرنے کا تجھ کو اختیار ہے۔ کیونکہ تیرے سوا میرا کوئی وارث نہیں جس کو یہ مال و دولت دے جاؤں۔ لیکن ایک نصیحت کرتا ہوں، اُس کو کبھی نہ بھولنا۔ اور وہ یہ ہے کہ ایک سے لے کر ہزار تک جو کچھ خرچ کرے ، اور جو کچھ خرچ کے بعد

باقی رہا کرے، اُس کو ہر روز بہی میں لکھ لیا کیجو[1] اور ہمیشہ آج کا حساب کل اور کل کا حساب پرسوں دیکھتا رہیو[1]۔" بیٹے نے ایسا ہی کیا اور چند ہی روز میں جب اُس نے دیکھا کہ سرمایہ روز بروز گھٹتا جاتا ہے تو دفعتہً اُس کی آنکھیں کھُل سی گئیں، اور اپنے گھر کو سنبھال لیا۔

جس طرح تجارت سے جزرسی اور کفایت شعاری کی بنیاد تمام قوم میں پڑتی ہے، اُسی طرح تحمّل، بُردباری، نرمی اور موافقت بغیر تجارت کے کسی قوم کی قومی خصلت نہیں بنتی۔ جس طرح سلطنت اور حکومت کا میلان ظلم اور تشدّد، اور غرور و نخوت کی جانب ہوتا ہے اُسی طرح تجارت کا اقتضا یہ ہے کہ وہ تند مزاجوں کو دھیما، مغروروں کو خاکسار، سخت کلاموں کو شیریں زبان اور عیّاروں کو منکسر المزاج بناتی ہے۔ تاجر کی ضرورتیں ایسی ہیں کہ جب تک تحمّل و بُردباری اور شیریں زبانی اختیار نہ کرے ہرگز اپنے پیشے میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔

ایک مصنف لکھتا ہے کہ دُنیا میں سب سے زیادہ خوش اخلاق اور شیریں زبان یہودی لوگ ہیں۔ نہ فرانسیسی، نہ اٹلی والے، اور نہ جرمن اور یہی وجہ ہے کہ دُنیا میں کوئی قوم یہودیوں کے برابر دولتمند نہیں یہ اِسی سبب سے جو قومیں تجارت پیشہ ہوتی ہیں ایک مدّت کے بعد اُن کی نسلیں فطرۃً اُن خصلتوں پر مجبول پیدا ہوتی ہیں۔ کیونکہ اولاد کے جسمانی اور نفسانی قویٰ اپنے آبا و اجداد کے جسمانی اور نفسانی قویٰ کے تابع ہوتے ہیں۔ جس طرح قوی اور تنومند ماں باپ کی اولاد تنومند ہوتی ہے، اُسی طرح متحمّل و بُردبار ماں باپ کی اولاد مستثنیٰ صورتوں کے سوا ضرور ہے متحمّل اور بُردبار پیدا ہو۔

[1] لکھنؤ میں کرنا اور رہنا لکھا اور بولا جاتا ہے

راست بازی اور خوش معاملگی بھی تجارت کی کامیابی کے لئے نہایت ضروری ہے۔ کیونکہ جو تاجر راست باز اور خوش معاملہ نہیں ہوتا اُس کی ساکھ شہر یا ملک میں کبھی نہیں بندھ سکتی۔ اگر وہ فریب یا بد معاملگی سے کبھی کامیاب بھی ہو جاتا ہے تو بہت جلد اُس کا خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے۔ اس لئے تاجر کو مجبوراً راست باز اور خوش معاملہ بننا پڑتا ہے۔ ہم ہمیشہ بازاروں میں اپنی آنکھ سے دیکھتے ہیں کہ جو دوکاندار گاہکوں کو دھوکا نہیں دیتے، اور اپنا مال سب کے ہاتھ ایک ہی نرخ پر بیچتے ہیں، وہ چند روز میں اپنے ہم پیشوں سے سبقت لے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ اُن کی کامیابی دیکھ کر اوروں کو بھی وہی طریقہ اختیار کرنا پڑتا ہے اور اس طرح ممکن ہے کہ رفتہ رفتہ بازار میں راست بازی پھیل جائے۔

اگرچہ اس بات سے انکار نہیں ہو سکتا کہ دُنیا میں ابھی تک راست باز تاجروں کی تعداد بمقابلہ جَو فروش گندم نماؤں کے بہت کم ہے، لیکن اس سے تجارت کے پاک دامن پر کوئی دھبہ نہیں لگتا۔ جس طرح علم کا خاصّہ ہے کہ وہ براہ راست نیکی کی راہ سجھاتا ہے، لیکن باوجود اس کے بہت سے اہلِ علم اپنی بداعمالیوں سے علم کو بدنام کرتے ہیں۔ اِسی طرح اگرچہ تجارت براہ راست اَنسٹی (دیانتداری) اور دیانت داری کی تعلیم دیتی ہے لیکن نالائق تاجر چند روزہ منفعت کے لئے بددیانتی اور فریب اختیار کرکے تجارت کی پائیدار برکتوں سے محروم رہتے ہیں۔

ایک دانشمند امریکن مصنّف اپنے ملک کے تاجروں کو اس

طرح نصیحت کرتا ہے۔

"جس قدر تمھاری تجارت میں راست بازی اور خوش معاملگی زیادہ ہوگی اُسی قدر تمھارا کام جلد ترقی کرے گا۔ تجارت کی ذات میں بھلائی اور نیکی کے سوا کچھ نہیں ہے، مگر انسان نے اپنی بدی سے اُس کو بُرا بنا دیا ہے۔ اور اپنی خیانت اور بددیانتی سے اُس کے پاک دامن پر داغ لگایا ہے۔ اگر تُم تجارت میں کامیاب ہونا چاہتے ہو تو تمام مکر و فریب چھوڑ دو اور سانپ کی چال نہ چلو، جو کمینہ پن سے بجائے پاؤں کے چلنے کے پیٹ کے بل چلتا ہے۔ بلکہ ایسا کرو کہ تمھاری دوکانیں، گودام اور منڈیاں عزّت اور دیانت داری کے مندر ہوں اور اپنی منڈیوں کے دروازوں پر کندہ کرا دو کہ جو کوئی اِس احاطہ میں داخل ہوگا اُس کو اماں دی جائے گی۔"

اصل یہ ہے کہ جب تک کسی ملک کی تجارت وہاں کے تعلیم یافتہ گروہ کے ہاتھ میں نہیں آتی، بلکہ جاہلوں اور نالائقوں کے پنجے میں پھنسی رہتی ہے، تب تک تجارت کی کامیابی کا بھید عام نظروں سے مخفی رہتا ہے۔ اکثر نفع یا نقصان کو امورات تقدیری میں شمار کرتے ہیں، جن میں انسان کی عقل و تدبیر کچھ کام نہیں دے سکتی (حالانکہ وہ تدبیر سے ایک دم غافل نہیں رہتے) بعضے چالاکی اور عیّاری کو بیوپار کے لوازمات سے جانتے ہیں۔ لیکن فی الحقیقت تاجر کی کامیابی کا مدار زیادہ تر اُس کی راست بازی اور خوش معاملگی پر ہوتا ہے۔ جس پر پورا پورا یقین بغیر تعلیم اور تربیت کے حاصل نہیں ہو سکتا۔ ایک مصنّف لکھتا ہے کہ:-

"تجارت کی کامیابی کے لئے زیادہ ضرورت صرف علم کی ہے۔ نہ کہ تجربہ کی۔ کیونکہ تجربہ علم حاصل کرنے کے متعدد ذرائع میں سے ایک ذریعہ ہے۔ عاقل اپنی عقل اور علم سے سبق لیتے ہیں اور کم عقل تجربہ سے۔ مگر نہایت بیوقوف ضرورت سے اور چوپائے نیچر سے۔"

اسی مصنف کا قول ہے:۔

"وہ وقت قریب ہے جب کہ تجارت ہر قسم کے ذہنی اور عقلی پیشوں سے مقابلہ کر سکے گی۔ زمانہ آئندہ کا تاجر ضرور دانشمند اور لائق شخص ہوگا جو مصنوعی اور قدرتی چیزوں کا زمین پر تقسیم کرنے والا ہوگا۔ اب وہ اتفاقات روز بروز کم ہوتے جاتے ہیں اور قریب ہے کہ بالکل معدوم ہو جائیں، جن سے ایک نالائق تاجر، جو بارہا غلطیاں کرتا ہے، مدّت دراز تک دوالہ نکلنے سے محفوظ رہ سکے۔"

اصلی جرأت اور دلیری بھی، جیسی تجارت کی بدولت انسان میں پیدا ہوتی ہے ایسی کسی اور پیشہ کے ذریعہ سے نہیں ہوتی۔ شاید وہ لوگ جو تجارت اور دلیری میں منافات سمجھتے ہیں، اس بات کو سن کر متعجب ہوں۔ مگر ان کو یاد رکھنا چاہئے کہ دلیری یا بزدلی کسی خاص فرقے کے ساتھ خصوصیت نہیں رکھتی۔ ممکن ہے کہ ایک سپاہی یا سپہ سالار نہایت بزدل ہو اور ایک بیوپاری بہت بڑا بہادر ہو۔ جس طرح بہادروں کو میدان جنگ میں دلیری اور شجاعت کے کام

کرنے پڑتے ہیں۔ اُسی طرح ہر شخص کو اپنی روزانہ زندگی میں اکثر موقعوں پر دلیری سے کام کرنا پڑتا ہے۔

کبھی راستی اور ایمانداری سے کام کرنے میں طرح طرح کے خطرے ہوتے ہیں۔ کبھی حرص اور طمع انسان کی نیت ڈانواں ڈول کر دیتی ہے۔

اکثر دوسروں کا سہارا چھوڑ کر اپنے دست و بازو پر بھروسا کرتے ہوئے جی ہچکچاتا ہے۔ اکثر اوقات ارادوں میں تزلزل واقع ہوجاتا ہے۔ صریح ایک کام کو مفید جانتے ہیں مگر چونکہ کبھی اس کو نہیں کیا اُس میں ہاتھ نہیں ڈالتے۔ بعض اوقات اپنے فرائض کاہلی سے یا کسی لحاظ سے یا کسی کے خوف سے پورے کرتے دشوار معلوم ہوتے ہیں۔

غرض کہ اسی قسم کے بے شمار مواقع ہیں جہاں دلیری کی ضرورت ہوتی ہے۔ پس جو شخص ایسے موقعوں پر دلیری اور جرأت ظاہر کرتا ہے اور خوف یا مروّت یا دل کی کمزوری پر غالب آجاتا ہے، اُس کی دلیری اور جرأت فی الحقیقت میدان جنگ کی دلیری اور شجاعت سے بدرجہا زیادہ تعریف کے لائق ہے اور اس قسم کے مواقع جیسے کہ تاجر کو پیش آتے ہیں، دنیا میں کسی شخص کو پیش نہیں آتے۔ وہ لاکھوں من غلہ ایسے اتفاقات کے بھروسے پر جو اُس کے اختیار سے باہر ہیں، بے دھڑک خرید کر کوٹھے اور کھتیاں بھر لیتا ہے، لاکھوں کی ہنڈی بدتا ہے اور نقد روپیہ بائع کی جھولی میں ڈال کر محض اُمید کے سہارے بیٹھ رہتا ہے۔ وہ ایک ایسے شخص کے اعتبار پر جس کو کبھی اُس نے آنکھ سے نہیں دیکھا، اور جو اُس سے سات سمندر پار رہتا ہے۔ مال سے بھرا ہوا جہازوں کا بیڑا سمندر میں چھوڑ کر تسلّی اور اطمینان سے پاؤں پھیلا کر

ملاء بھی طرح لکھنؤ میں مصدر کی تانیث صحیح ہوا... نہیں اسی طرح اس کی جمع بھی استعمال نہیں ہوتی دلّی والے مصدر کو بھی ضرورت کے لحاظ سے واحد و جمع لاتے ہیں۔ لکھنؤ والے اس جگہ لکھتے ہیں۔ کام کرنا پڑتے ہیں

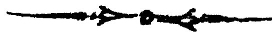
سو رہتا ہے۔

ایک مصنف لکھتا ہے کہ "ایک دور دراز ملک کا سوداگر، جو اپنے دوسرے ہم پیشہ بھائی پر صرف خط وکتابت کے ذریعہ سے اعتماد کرتا ہے اور اپنی دولت کا بھرا ہوا جہازوں کا بیڑا سمندر کی موجوں کے حوالے کر کے بےفکر ہو جاتا ہے، کوئی وجہ نہیں کہ وہ اس اعلیٰ درجے کی انسانی خوبی پر نازاں نہ ہو"

جو قومیں صرف اس بنا پر کہ اُن کے آبا و اجداد، بڑے تلوار کے دھنی، جنگجو اور سپاہی تھے، اپنے تئیں بہادر اور شجاع خیال کرتی ہیں، اُن کے لئے اپنی آزمائش کا اِس سے بہتر کوئی موقع نہیں کہ وہ تجارت کے میدان میں آئیں۔ اُن کو بہت جلد معلوم ہو جائے گا کہ وہ فی الواقع دلیر اور جری ہیں یا بُزدل اور ڈرپوک۔

الغرض تجارت کی کامیابی کے لئے جس کا مدار تاجر کے مقبول اور معتمدِ خاص وعام ہونے پر ہے، نہایت ضرور ہے کہ تاجر علاوہ عاقل اور مدبّر ہونے کے عمدہ اخلاق اور عمدہ خصلتوں سے آراستہ ہو اور اس لئے تجارت کو انسان کا معلّم اور اتالیق کہا جائے تو کچھ بیجا نہیں۔

(خواجہ الطاف حسین حالی)



رائے کی آزادی

خود مختار سلطنتوں میں کوئی شے رائے کی آزادی اور خاصکر بادشاہوں کے چال چلن پر آزادانہ رائے دینے سے زیادہ خطرناک نہیں ہوتی ۔ مگر شیخ نے جس کے وقت میں ہر بادشاہ حاکم علی الاطلاق تھا اس فرض کو پورا پورا ادا کیا ۔ سلاطین عہد کے اخلاق عیب اور اُن کی بد خصلتیں جس طرح اُس نے بیان کی ہیں آزاد سلطنتوں میں بھی اِس سے زیادہ لکھنی مشکل ہیں ۔ مگر اُس نے ایسے لطیف پیرایوں میں اُن پر چوٹیں کی ہیں کہ کسی کو اُس پر گرفت کا موقع نہیں ملا ۔ اکثر سلاطین سلف کی حکایتوں کے ضمن میں موجودہ بادشاہوں کے چال چلن پر اُس نے تعریضیں کی ہیں کہیں مدحیہ قصائد میں اوّل مدح و ستائش کی تھوڑی سی چاٹ دے کر نصیحت و پند کا دفتر کھولا ہے اور اُن کو ظلم اور تعدّی کے بُرے نتائج سے مُتنبّہ کیا ہے اور طرح طرح سے رعیّت کے حقوق جتائے ہیں اور اُن کی بے اعتدالیاں ظاہر کی ہیں ۔ اتابک جو علماء کا مخالف اور مشائخ و زُہّاد کا حد سے زیادہ معتقد تھا اُس کی تنبیہ کے واسطے گلستاں اور بوستاں میں اُس نے بہت سی حکایتیں لکھی ہیں ۔ مثلاً گلستاں کی ایک حکایت میں کسی درویش کا حال لکھا ہے جو کہ جنگل میں رہتا تھا اور درختوں کے پتّے کھاتا تھا ۔ ایک بادشاہ اُس کی زیارت کو گیا اور اُس کو شہر میں لے آیا اور ایک عمدہ بُستانسرا میں اُتارا ۔ چند روز جو اچھے اچھے کھانے کھانے کو اور نفیس کپڑے پہننے کو

اور خوبصورت لونڈیاں خدمت کرنے کو ملیں اور ہر طرح کی آرام و آسائش پائی تو شاہ صاحب نے خوب رنگ و روغن نکالا۔ ہیئت و صورت بالکل بدل گئی۔ ایک دن بادشاہ قدمبوسی کے لئے حاضر ہوا اور کہا جس قدر کہ مجھ کو علما اور زہاد سے محبت ہے ایسی اور کسی گروہ سے نہیں۔ فیلسوف وزیر نے عرض کیا۔ "حضور! شرط دوستی یہ ہے کہ دونوں کے ساتھ بھلائی کی جائے اور اس لئے علما کو روپیہ دینا چاہیئے تاکہ اطمینان سے درس اور تصنیف میں مصروف رہیں اور زاہدوں کو کچھ نہ دینا چاہیئے تاکہ وہ اپنے زُہد پر قائم رہیں۔

ایک اور اس سے زیادہ لطیف اور چبھتی ہوئی حکایت اِسی باب میں لکھی ہے جو بالکل اتابک ابوبکر کی حالت کے مناسب ہے۔ یعنی ایک بادشاہ کو سخت مہم پیش آئی۔ اُس نے منت مانی کہ اگر اُس میں کامیابی ہوگی تو اِس قدر روپیہ زاہدوں کی نذر کرونگا۔ جب اُس کی مُراد پوری ہوگئی تو اپنے عہد کے موافق روپیوں کی تھیلی غلام کو دی کہ زاہدوں کو جا کر دے آئے۔ غلام بہت ہوشیار اور زیرک تھا۔ سارے دن اِدھر اُدھر پھرا اور شام کو تھیلی ہاتھ میں لئے جیسا گیا تھا ویسا ہی چلا آیا اور عرض کیا۔ "حضور! ہر چند ڈھونڈا مگر کوئی زاہد نہیں ملا۔" بادشاہ نے کہا۔ "تو کیا بکتا ہے۔ میرے نزدیک اس شہر میں چار سو زاہد سے کم نہ ہونگے۔" کہا "حضور جو زاہد ہیں وہ لیتے نہیں اور جو لیتے ہیں وہ زاہد نہیں۔" بادشاہ یہ بات سُن کر ہنس پڑا اور فرمایا کہ جتنی مجھ کو درویشوں اور خُدا پرستوں سے عقیدت ہے اُسی قدر اِس مردود کو اُن سے عداوت ہے مگر کہتا سب سچ ہے۔ اِسی طرح کی اور بہت سی حکایتیں گلستاں اور بوستاں میں موجود ہیں۔ گلستاں

کی ایک حکایت میں جو کہ جدالِ سعدی کے نام سے مشہور ہے، اُس نے نہایت خوبصورتی سے سلاطینِ عہد اور مشائخ روزگار کے عیب اور برائیاں بیان کی ہیں۔ اِس حکایت میں اُس نے اپنا اور ایک درویش کا غالباً فرضی مناظرہ لکھا ہے، جس میں مخالف کو درویشوں کا اور اپنے کو امیروں اور بادشاہوں کا طرفدار اور مدّاح قرار دیا ہے۔ مخالف بار بار درویشوں کی تعریف اور دولتمندوں کی مذمت کرتا ہے اور شیخ ہر دفعہ اُس کی تردید میں درویشوں کے عیب اور امیروں کی خوبیاں بیان کرتا ہے۔ مگر جیسی مضبوط دلیلیں اپنے دعوے پر قائم کرتا ہے ویسی ہی مضبوط دلیلیں خصم کی طرف سے لکھتا ہے۔ اور اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک فرضی مناظرہ ہے جو محض درویشوں اور تونگروں کی تنبیہ اور اصلاح کے لئے لکھا گیا ہے۔

بادشاہوں کے جور و ظلم اور بے باکی و سفّاکی دیکھتے دیکھتے شیخ کے دل میں فی الواقع بنی نوع کی خیر خواہی کا سچّا جوش پیدا ہو گیا تھا جس کو کوئی خوف اور اندیشہ روک نہ سکتا تھا۔ ایک بار جب کہ وہ حج کر کے تبریز میں پہنچا اور وہاں کے علما اور صُلحا سے ملاقات کی اُس نے یہ ارادہ کیا کہ خواجہ شمس الدین جوینی صاحب دیوان اور اس کا چھوٹا بھائی خواجہ علاء الدین جوینی جو کہ سلطان اباقا خاں[1] کے معتمد وزیر تھے اور شیخ کے ساتھ خاص ارادت رکھتے تھے، اُن سے بھی ملاقات کرے۔ ایک روز اُن سے ملنے کا ارادہ کر کے چلا۔ راہ میں دیکھا کہ اباقا خاں کی سواری آتی ہے اور اُس کے دونوں وزیر اُس کے ہمراہ سوار ہیں۔ شیخ نے چاہا کہ وہاں سے کترا کر نکل جائے۔ مگر دونوں بھائیوں نے اُس کو پہچان لیا اور

---

[1] ہلاکو خاں کا بیٹا جو اُس کے بعد بادشاہ ہوا۔

فوراً گھوڑوں سے اُتر کر شیخ کی طرف آئے اور نہایت تعظیم اور ادب سے
شیخ کو سلام کیا اور اُس کے ہاتھ اور پاؤں پر بوسے دیئے۔ بادشاہ نے
یہ حال دیکھا حاضرین سے کہنے لگا کہ شمسؔ الدین نے کبھی ہماری تعظیم
بھی اس راہرو آدمی کے برابر نہیں کی۔ یہ کون شخص ہے؟ جب دونوں
بھائی شیخ سے مل کر واپس آئے تو اباقاخاں نے خواجہ شمس الدین سے
پوچھا کہ یہ کون شخص تھا جس کی تم نے اس قدر تعظیم کی۔ صاحب دیوان
نے عرض کیا۔ حضور یہ ہمارا شیخ ہے۔ حضور نے سُنا ہوگا شیخ سعدی اِسی
کا نام ہے اور اس کا کلام ایک عالم میں مشہور و معروف ہے"۔ اباقاخاں
نے کہا۔ اس سے ہم کو بھی ملواؤ۔" چنانچہ دونوں بھائی ایک روز شیخ
کی خدمت میں گئے اور اُس کو بادشاہ کے حضور میں لائے۔ کسی قدر صحبت
کے بعد جب شیخ چلنے لگا تو بادشاہ نے کہا کہ مجھ کو کچھ نصیحت کرو۔ شیخ
نے کہا دُنیا سے آخرت میں کوئی چیز ساتھ نہ جائے گی۔ مگر نیکی یا بدی۔
اب تم کو اختیار ہے جو منظور ہو سو لیجاؤ۔

(حیات سعدی حالی)

علم و عمل

یہاں علم سے ہماری مراد مجرّد علم ہے جو عمل سے بالکل خالی ہو۔
اور عمل سے مراد محض عمل ہے جس میں علم کو کچھ دخل نہ ہو۔ اب ہم دیکھتے
ہیں کہ دنیا کی کل علم سے چلتی ہے یا عمل سے۔

اگر ہم کو یہ دریافت کرنا ہو کہ چراغ کی بتّی کا اشتعال آکسیجن سے قائم
رہتا ہے یا ہائڈروجن سے یا دونوں سے تو ہم کو چاہیئے کہ ایک دفعہ بتّی کو
محض آکسیجن میں اور دوسری دفعہ محض ہائڈروجن میں رکھ کر دیکھیں۔

اگر دونوں میں بجھ جائے تو سمجھنا چاہئے کہ ہوا کے دونوں جزوں کو اُس کے اشتعال میں دخل ہے اور اگر ہائڈروجن میں بجھ جائے اور آکسیجن میں نہ بجھے تو جاننا چاہئے کہ اُس کے اشتعال کا باعث محض آکسیجن ہے نہ کہ ہائڈروجن۔

اِسی طرح اگر ہم یہ دیکھنا چاہیں کہ دُنیا کی کل علم سے چلتی ہے یا عمل سے، تو ہم کو چاہئے کہ اوّل ایک ایسا مُلک فرض کریں جس میں اہلِ علم و اہلِ نظر کے سوا کوئی کام کرنے والا اور ہاتھ پاؤں ہلانے والا نہ ہو، اور پھر دیکھیں کہ وہ ملک کے دن آباد رہتا ہے۔ پھر ایک دوسرا مُلک فرض کریں جس میں اَن پڑھ محنتی مزدوروں کے سوا اہلِ علم کا نام و نشان نہ ہو، اور پھر دیکھیں کہ وہ مُلک آباد رہتا ہے یا نہیں۔

اِسی لئے ہم اوّل ایک ایسا خطّہ فرض کرتے ہیں جس کے باشندے جغرافی عالم، فلسفی، ریاضی داں، مصنّف، اور یٹر، شاعر اور کیا اور کیا ہیں۔ مگر اُن میں کوئی خُدا کا بندہ ایسا نظر نہیں آتا جو اِن واجب التعظیم اپاہجوں کے کھانے، پہننے، اوڑھنے، رہنے سہنے، لکھنے پڑھنے وغیرہ کا سامان مہیّا کرے۔ اوّل تو کسی مُلک میں بغیر کارکن جماعتوں کے ایسی آبادی کا وجود میں آنا ہی ناممکن ہے، لیکن اگر بفرضِ محال کسی خطّہ میں ایسی ناشدنی کالونی چند روز کے لئے آباد ہو جائے تو اُس کا انجام کیا ہوگا؟ ممکن ہے کہ بعض کو مطالعہ کے ذوق شوق میں ایک آدھ روز بھوک پیاس نہ لگے، بعض کو کسی مشکل مسئلہ کے حل ہو جانے کی خوشی میں ایک دو روز کھانے کی کچھ پروا نہ رہے اور بعض کو کسی مضمون کی دُھن میں کچھ دیر تک خورد و نوش کا مطلق خیال نہ آئے۔

مگر بہت جلد وہ آپ کو ایک ایسی مخلوق پائیں گے جو بھوکی ہے مگر کوئی اُس کا رزاق نہیں، تنگی ہے مگر کوئی اُس کا ستار نہیں، حاجت مند ہے مگر کوئی اُس کا قاضی الحاجات نہیں۔ اب یا تو اُنھیں خود اپنے اعلیٰ اور اشرف ہاتھوں سے وہ تمام حقیر اور ذلیل کام سرانجام کرنے پڑیں گے جو عوام کالانعام کو کرنے چاہئیں اور یا فوراً اس ملک سے ہجرت کرکے کسی ایسے خطہ میں جاکر رہنا پڑے گا جہاں اُن کے لئے فرمانبردار بندے یا بندہ پرور خدا موجود ہوں۔ دونوں حالتوں میں نتیجہ یہ نکلے گا کہ دُنیا کی کل محض علم سے نہیں چل سکتی۔

اِس کے بعد ہم ایک دوسرا مُلک فرض کرتے ہیں جس کے تمام باشندے اَن پڑھ اور بے علم مگر سب پرلے درجہ کے محنتی، جفاکش اور اپنی ضروریاتِ زندگی کے مہیا کرنے میں سرگرم ہیں۔ گو اُنھوں نے زراعت یا تجارت یا صنعت و دستکاری کے اصول کتابوں میں نہیں پڑھے مگر وہ اپنی تمام ضروریات جن پر انسان کی زندگی موقوف ہے مہیا کرتے ہیں۔ قدرتی خواہشیں اور نیچرل ضرورتیں اُن کو جس طرح سکھائی گئیں اور متواتر تجربوں سے جس قدر اُن کی سمجھ بوجھ بڑھتی گئی وہ اپنے تمام کام برابر سرانجام کرتے رہے۔ بونا، جوتنا، بیج بیوپار، صنعت اور دستکاری غرض کہ تمام اہم اور ضروری کام رفتہ رفتہ بقدر ضرورت انجام دینے لگے۔ اب اِن کی کوئی ضرورت بند نہیں رہتی اور کوئی کام اٹکا نہیں رہتا۔ ایک اناج پیدا کرکے لاتا ہے، دوسرا پیستا ہے، تیسرا پکاتا ہے اور تینوں مل کر کھاتے ہیں۔ ایک روئی پیدا کرتا ہے، دوسرا کاتتا ہے، تیسرا بُنتا ہے، چوتھا سیتا ہے اور چاروں مل کر پہنتے ہیں۔

اُن کو چوری یا ڈکیتی کا مطلق خوف نہیں، کیونکہ اُن کے پاس اپنے ہاتھ پاؤں کی محنت کے سوا کوئی دولت نہیں۔ اُن کو غنیم کے حملے کا کچھ ڈر نہیں، کیونکہ وہ اپنے ہاتھ پاؤں سے چوکس اور غنیم کے مقابلے کے لئے مستعد اور تیار ہیں۔ اُن میں کوئی بدکار اور بدچلن نہیں، کیونکہ اُن کو اپنے کام دھندوں میں بدکاری اور بدچلنی کی فرصت نہیں۔ اُن میں کوئی روگی اور بیمار نہیں کیونکہ اُن میں کوئی طبیب اور ڈاکٹر نہیں ۔ اُن میں کوئی مذہبی تکرار نہیں، کیونکہ اُن میں کوئی واعظ یا مُلّا نہیں۔ اُن میں کوئی پولٹیکل اختلاف نہیں، کیونکہ وہ سب کنسرویٹو ہیں۔ کوئی اُن میں روشن خیال لبرل نہیں۔ اُن میں کوئی عدالتی جھگڑا نہیں، کیونکہ اُن میں کوئی وکیل اور بیرسٹر نہیں۔ اُن میں اس کے سوا کوئی عیب نہیں کہ وہ سولائزڈ نہیں ۔ اور اس سے صاف ظاہر ہے کہ دُنیا کی کل عمل سے چلتی ہے نہ کہ علم سے۔

اب فرض کرو کہ اس ملک کے باشندوں کا میل جول کسی ایسے مُلک والوں سے ہوا جن کے تمام کام علمی اصول پر مبنی ہیں۔ اُنھوں نے زراعت، تجارت، صنعت و دستکاری اور تمام جنگی اور ملکی مُہمات میں علم ہی کو اپنا رہبر بنایا ہے۔ کیا معمار اور کیا بڑھئی، کیا لوہار اور کیا کمہار کیا درزی اور کیا کفش دوز، غرضکہ تمام پیشہ ور محض علم کی ہدایت سے اپنے اپنے کام سرانجام کرتے ہیں۔ اُن کے میل جول اور لین دین نے اس مُلک کے غریب باشندوں کو سخت نقصان پہنچایا۔ اُن کی تجارت نے اُن کے اخراجاتِ زندگی حد سے زیادہ بڑھا دیئے۔ اُن کی صنعت سے اِن کی صنعت ماند ہو گئی۔ اُن کی دستکاری نے اِن کی دستکاری کو

اِنڈ کر دیا۔ مگر ایک مدّت تک اُن کو اس بات کی مطلق خبر نہ ہوئی کہ ہمارے پیشہ ور کیوں بیکار ہو گئے، ہماری کمائیوں میں برکت کیوں نہیں رہی، ہمارے اخراجات روز بروز کیوں بڑھتے جاتے ہیں اور ہماری آمدنی ہمارے اخراجات کو کیوں مکتفی نہیں ہوتی؟ لیکن اس غیر قوم سے جوں جوں میل جول بڑھتا گیا اُن کو اِن کی اور اِن کو اُن کی زبان سیکھنے کی ضرورت زیادہ ہوتی گئی۔ اُنھوں نے اوّل اُن کی زبان سیکھی پھر رفتہ رفتہ اُن کے علم بھی سیکھنے لگے۔ جن علموں کے ذریعہ سے اُنھوں نے ہر فن میں ترقی کی تھی وہ علم بھی اُنھوں نے حاصل کئے، مگر کتابی علم کے سوا کوئی عملی فائدہ اُن کے علموں سے نہ اُٹھایا۔ وہ علم کو عمل کی غرض سے سیکھتے تھے۔ اور اِنھوں نے علم کو محض علم کے واسطے سیکھا۔ وہ اِس نتیجہ پر پہنچ چکے تھے کہ علم آدمی کے لئے بنا ہے مگر یہ بمشکل ابھی یہیں تک پہنچے تھے کہ آدمی علم کے لئے بنا ہے۔ وہ علم سے خود بھی لذّت اور فائدہ اُٹھاتے تھے اور اپنے مُلک اور قوم کو بھی لذّت اور فائدہ پہنچاتے تھے۔ اِنھوں نے گونگے کی طرح گڑ کھایا اور کسی نے نہ جانا کہ کھٹا ہے یا میٹھا۔ وہ دُنیا کی مختلف زبانیں اس لئے سیکھتے تھے کہ تمام عالم میں پھرتے تھے، غیر مُلکوں کے آدمیوں سے مِلتے تھے، مختلف قوموں کے علوم و فنون سے آگاہی حاصل کرتے تھے۔ اور اُن کو اپنی زبان میں نقل کرتے تھے۔ اِنھوں نے بھی اُن کی دیکھا دیکھی غیر مُلکوں کی زبانیں اور غیر قوموں کی بولیاں سیکھیں مگر نہ اس لئے کہ غیر ملکوں میں سفر کریں اور غیر قوموں کے علوم و فنون اپنی زبان میں نقل کریں بلکہ اس لئے کہ طوطے کی طرح کہیں "حق اللہ پاک ذات اللہ"

بول اُٹھیں اور کہیں "ست گورو دت داتا" وہ لمپ روشن کرنے کے لئے، میز لکھنے کے لئے، کرسی بیٹھنے کے لئے، گھنٹہ وقت دیکھنے کے لئے، فرش بچھانے کے لئے خریدتے تھے۔ انھوں نے بھی اُن کی ریس سے یہ سب چیزیں فراہم توکیں مگر نہ لمپ کو جلایا نہ میز پر لکھا، نہ کرسی پر بیٹھے، نہ گھنٹے میں وقت دیکھا، نہ فرش بچھایا۔ بلکہ کباڑی کی طرح سارا گھر اسباب سے بھر لیا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی حالت پہلے سے بھی بدتر ہوگئی۔ علم کے ذوق شوق میں انھوں نے ہاتھ پاؤں ہلانے بالکل چھوڑ دئے اور علم کا ادب اِن کو دُنیا کے ذلیل کاموں میں ہاتھ ڈالنے سے مانع ہوا۔ اب تاوقتیکہ وہ علم کو عمل کی غرض سے نہ پڑھیں اور اُس سے عملی فائدے نہ اُٹھائیں، ممکن نہیں کہ اِن کی حالت درست ہو۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ دُنیا کی کل علم سے نہیں چلتی بلکہ عمل سے چلتی ہے۔ اِس تمثیل سے ہمارا یہ مطلب نہیں کہ ہم کو علم کی ضرورت نہیں۔ نہیں، بلکہ ہم کو اس وقت علم کی نہایت ضرورت ہے، اور ایسی ضرورت ہے جیسے پیاسے کو ٹھنڈے پانی کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن جس طرح ٹھنڈے پانی کی کُلّیاں کرنے سے پیاس نہیں بُجھتی بلکہ اور زیادہ آگ بھڑکتی ہے اُسی طرح سطحیوں کی مانند کتابوں کے الفاظ اور علموں کی اصطلاحیں یاد کرنے سے اور طوطے کی طرح علمی مسائل اور قواعد ازبر کرنے سے کوئی شخص آپ کو اور مُلک کو کوئی اصلی فائدہ نہیں پہنچا سکتا بلکہ اندیشہ ہے کہ ایسے لوگ مُلک کے حق میں مضر ثابت نہ ہوں۔ جس علم کی ہم کو ضرورت ہے وہ علم ہے جو ہماری ساکن اور پژمردہ قوموں کو متحرک اور شگفتہ و شاداب کرے، نہ وہ علم جو ہمارے متحرک اور شگفتہ قوموں کو بھی ساکن اور پژمردہ کردے۔ ایسے علم سے بے علمی سو درجہ بہتر ہے۔ بقول شخصے "بخشو بی بلّی چوہا لنڈورا ہی جیئے گا۔"

(حالیؔ)

سرسیّد مرحوم اور اُردو لٹریچر

سرسیّد کے جس قدر کارنامے ہیں اگرچہ رفارمیشن اور اصلاح کی حیثیت ہر جگہ نظر آتی ہے، لیکن جو چیزیں خصوصیت کے ساتھ اُن کی اصلاح کی بدولت ذرّہ سے آفتاب بن گئیں، اُن میں سے ایک اُردو لٹریچر بھی ہے۔ سرسیّد ہی کی بدولت اُردو اِس قابل ہوئی۔ عشق و عاشقی کے دائرہ سے نکل کر مُلکی، سیاسی، اخلاقی، تاریخی، ہر قسم کے مضامین اس زور اور اثر، وسعت و جامعیت، سادگی اور صفائی سے ادا کر سکتی ہے کہ خود اُس کے اُستاد، یعنی فارسی زبان کو آج تک یہ بات نصیب نہیں مُلک میں آج بڑے بڑے انشا پرداز موجود ہیں جو اپنے اپنے مخصوص دائرہ مضمون کے حکمراں ہیں لیکن ان میں سے ایک شخص بھی نہیں جو سرسیّد کے بارِ احسان سے گردن اُٹھا سکتا ہو۔ بعض بالکل اُن کے دامنِ تربیت میں پلے ہیں، بعضوں نے دور سے فیض اُٹھایا ہے، بعض نے مدعیانہ اپنا الگ راستہ نکالا ہے، تاہم سرسیّد کی فیض پذیری سے بالکل آزاد کیونکر رہ سکتے تھے۔

سرسیّد کی جس زمانہ میں نشو و نما ہوئی، دلّی میں اہل کمال کا مجمع تھا اور امراء اور رؤسا سے لے کر ادنیٰ طبقہ تک میں علمی ذوق پھیلا ہوا تھا۔ سرسیّد جس سوسائٹی کے ممبر تھے اُس کے بڑے ارکان

مفتی صدرالدین خاں آزردہ، مرزا غالب اور مولانا صہبائی تھے۔
اِن میں سے ہر شخص تصنیف و تالیف کا مالک تھا اور اِنھیں بزرگوں
کی صحبت کا اثر تھا کہ سرسید نے ابتدا ہی میں جو مشغلہ علمی اختیار کیا
وہ تصنیف و تالیف کا مشغلہ تھا۔

اوّل وہ رواج عام کے اقتضا سے شاعری کے میدان میں آئے،
آہی تخلص اختیار کیا اور اُردو میں ایک چھوٹی سی مثنوی لکھی جس کا
ایک مصرعہ اِنھیں کی زبانی سُنا ہوا مجھے یاد ہے۔ ع

نام میرا تھا کام اُن کا تھا

لیکن حقیقت یہ ہے کہ اُن کو شاعری سے مناسبت نہ تھی، اس لئے
وہ بہت جلد اس کوچہ سے نکل آئے اور نثر کی طرف توجہ کی۔ چونکہ حقائق
اور واقعات کی طرف ابتدا سے میلان تھا، اس لئے دلّی کی عمارتوں
اور یادگاروں کی تحقیقات شروع کی اور نہایت محنت و کوشش
سے اس کام کو انجام دے کر ١٨٤٧ء میں ایک مبسوط کتاب لکھی جو آثار الصنادید
کے نام سے مشہور ہے۔

اُس وقت اگرچہ سرسیّد کے سامنے اُردو نثر کے بعض بعض
عمدہ نمونے موجود تھے، خصوصاً میر امّن صاحب کی چہار درویش جو
١٨٠٢ء میں تالیف ہوئی تھی، اور جس کی سادگی، صفائی اور واقعہ طرازی
آج بھی موجودہ تصنیفات کی برابری کا دعویٰ کر سکتی ہے۔ اس کے
ساتھ مضمون جو اختیار کیا گیا تھا، یعنی عمارات اور آئینہ کی تاریخ
وہ تکلف اور آورد سے اِبا کرتا تھا، تاہم 'آثار الصنادید' میں اکثر
بیدل اور ظہوری کا رنگ نظر آتا ہے۔

ہ غالب اُس عہد کے مشہور نقاد اور عالم تھے۔ مولانا امام بخش صہبائی اُسی عہد کے مشہور شاعر اور نقاد و نثار۔

ہ فارسی کے دو مشہور شاعر جن کی نثر ادبی حیثیت سے مشہور ہے۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ سرسید کی رات دن کی صحبت مولانا امام بخش صہبائی سے رہتی تھی اور مولانائے موصوف بیدل کے ایسے دلدادہ تھے کہ اُن کا کلمہ پڑھتے تھے اور جو کچھ لکھتے اُسی طرز میں لکھتے تھے۔

سرسید نے مجھ سے خود بیان کیا کہ "آثار الصنادید" کے بعض بعض مقامات بالکل مولانا امام بخش صہبائی کے لکھے ہوئے ہیں، جو انھوں نے میری طرف سے اور میرے نام سے لکھ دئے تھے۔

بہرحال اِس کتاب میں جہاں انشا پردازی کا زور دکھایا ہے، اُس کا نمونہ یہ ہے۔

"اِن حضرت کی طبع رسا شکل رابع سے پہلے اس سے نتیجہ حاصل کرتی ہے کہ بدیہی الانتاج سے ارباب فہم وذکا، اور ناخنِ فکر عقدۂ لاینحل کو پہلے اِس سے واکرتا ہے کہ گرہ حباب کو انگشت موج دریا، معنی فہمی اس درجہ کہ راست و درست سمجھ لیا کہ زبانِ سوسن نے کیا کہا، اور رمز شناسی اس مرتبہ کی کہ واقعی معلوم ہوگیا کہ نگاہِ نرگس نے کیا اشارہ کیا، اگر اِن کی رائے روشن، معجز نما ہو تو نقطۂ موہوم کو انگشت سے تقسیم کرے، اور جزو لایتجزّای کو دو نیم"

اگرچہ اس سے بہت پہلے، یعنی ۱۸۳۶ء میں مولوی محمد حسین آزاد کے والد بزرگوار مولوی محمد باقر نے اُردو اخبار کے نام سے اُردو کا ایک پرچہ نکالا تھا، اور خود سرسید نے ایک پرچہ جاری کیا تھا جس کا نام سید الاخبار تھا۔ اور دونوں کی زبان ضرورت کے اقتضا سے زیادہ اور صاف ہوتی تھی۔ تاہم اُس وقت تک یہ زبان علمی زبان

نہیں سمجھی جاتی تھی، اس لئے جب کوئی شخص علمی حیثیت سے کچھ لکھتا تھا تو اُسی فارسی نُما طرز میں لکھتا تھا۔ سرسید نے بھی اِسی وجہ سے "آثار الصنادید" میں جہاں انشا پردازی سے کام لیا، اِسی طرز کو برتا۔

"آثار الصنادید" جس زمانہ میں نکلی اُس کے تھوڑے ہی دنوں کے بعد تقریباً ۱۸۵۰ء میں دلّی کے مشہور شاعر، مرزا غالب نے اُردو کی طرف توجہ کی۔ یعنی مکاتبات وغیرہ اُردو میں لکھنے شروع کئے، اور چونکہ وہ جس طرف متوجہ ہوتے تھے، اپنا کوچہ الگ نکال کر رہتے تھے، اس لئے اُنھوں نے تمام ہم عصروں کے برخلاف مکاتبہ کو مکالمہ کر دیا۔[1] مکاتبات میں وہ بالکل اس طرح ادائے مطلب کرتے تھے جیسے دو آدمی آمنے سامنے بیٹھے باتیں کر رہے ہیں۔ اس کے ساتھ بہت سے خطوط میں انسانی جذبات مثلاً رنج و غم، مسرّت و خوشی، حسرت وبیکسی کو نہایت خوبی سے ادا کیا ہے۔ اکثر جگہ واقعات کو اس بے ساختگی سے ظاہر کیا ہے کہ واقعہ کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ اس لحاظ سے یہ کہنا بیجا نہیں کہ اُردو انشا پردازی کا آج جو انداز ہے، اور جس کے مجدّد اور امام سرسیّد مرحوم تھے، اس کا سنگ بنیاد دراصل مرزا غالب نے رکھا تھا۔

سرسیّد کو مرزا سے جو تعلّق تھا وہ ظاہر ہے[2]۔ اس لئے کچھ شبہ نہیں ہو سکتا کہ سرسیّد ضرور مرزا کی طرز سے مستفید ہوئے۔

---

[1] خود غالب نے مرزا حاتم علی مہر کو ایک خط میں لکھا ہے "مرزا صاحب میں نے وہ انداز تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا ہے۔ ہزار کوس سے بزبان قلم باتیں کیا کرو، ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو۔" [2] اُن کی صحبتوں میں بیٹھنے کا تعلّق۔

اِسی زمانہ میں ہندوستان کے ہر حصّہ میں کثرت سے اُردو اخبارات جاری ہوگئے،اور اُردو انشا پردازی کو روز بروز ترقی ہوتی گئی، اخبارات کو ہر قسم کے اخلاقی، تمدّنی، مُلکی، مذہبی، تاریخی مسائل سے کام پڑتا تھا، اس لئے ہر قسم کے مضامین لکھے گئے، تاہم انشا پردازی کا کوئی خاص اِسٹائل معیّن نہیں ہوا تھا۔ اس کے علاوہ جو کچھ تھا ابتدائی حالت میں تھا۔

۱۲۸۷ھ ہجری میں جس کو آج کم و بیش ۲۷ برس ہوئے۔ سرسیّد نے قوم کی حالت کی اصلاح کے لئے تہذیب الاخلاق کا پرچہ نکالا، اور اُردو انشا پردازی کو اس رُتبہ پر پہنچا دیا، جس کے آگے اب ایک قدم بڑھنا بھی ممکن نہیں۔ سرسیّد نے اُردو میں جو باتیں پیدا کیں اُس کو وہ مختصراً "تہذیب الاخلاق" میں خود ایک مقام پر لکھتے ہیں، اُن کی خاص عبارت یہ ہے:۔

"جہاں تک ہم سے ہو سکا ہم نے اُردو زبان کی علم و ادب کی ترقی میں، اپنے اِن ناچیز پرچوں کے ذریعہ سے کوشش کی، مضمون کے ادا کا ایک سیدھا اور صاف طریقہ اختیار کیا۔ رنگین عبارت سے جو تشبیہات اور استعارات خیالی سے بھری ہوئی ہے، اور جس کی شوکت صرف لفظوں ہی لفظوں میں رہتی ہے اور دل پر اس کا کچھ اثر نہیں ہوتا، پرہیز کیا۔ اس میں کوشش کی جو کچھ لطف ہو مضمون کے ادا میں ہو۔ جو اپنے دل میں ہو وہی دوسرے کے دل میں پڑے، تاکہ دل سے نکلے اور دل میں بیٹھے۔"

سلہ یہ مضمون ۱۸۹۶ء میں اورینٹل کالج میگزین میں شائع ہوا تھا۔

اس آرٹیکل میں سرسیّد نے انشا پردازی کے اور بہت سے اصول بتائے ہیں، جن کو اس موقع پر اختصار کی وجہ سے قلم انداز کرتے ہیں۔

سرسیّد کی انشا پردازی کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ ہر قسم کے مختلف مضامین پر کچھ نہ کچھ، بلکہ بہت کچھ لکھا ہے۔ اور جس مضمون کو لکھا ہے اس درجہ پر پہنچا دیا ہے کہ اُس سے بڑھ کر ناممکن ہے۔ فارسی اُردو میں بڑے بڑے شعرا اور نثّار گذرے ہیں، لیکن ان میں ایک بھی ایسا نہ تھا جو تمام قسم کے مضامین کا حق ادا کر سکتا۔

فردوسی[۵۱] بزم میں رہ جاتا ہے۔ سعدی[۵۲] رزم کے مردِ میدان ہیں۔ نظامی[۵۳] رزم بزم دونوں کے اُستاد ہیں۔ لیکن اخلاق کے کوچہ سے آشنا نہیں۔ ظہوری[۵۴] صرف مدحیہ نثر لکھ سکتا ہے۔ برخلاف اس کے سرسیّد نے اخلاق، معاشرت، پالٹکس، مناظرِ قدرت وغیرہ وغیرہ سب پر لکھا ہے، اور جو کچھ لکھا ہے لاجواب لکھا ہے۔ مثال کے طور پر بعض بعض مضامین کے جستہ جستہ فقرے نقل کرتے ہیں۔ اُمید کی خوشی، پر ایک مضمون لکھا ہے، جس میں اُمید کو مخاطب کیا ہے اس کے چند فقرے یہ ہیں۔

"دیکھ نادان، بے بس بچّہ گہوارہ میں سوتا ہے۔ اُس کی مصیبت زدہ ماں اپنے دھندے میں لگی ہوئی ہے، اور اُس گہوارہ کی ڈوری بھی ہلاتی جاتی ہے، ہات کام میں اور دل بچّہ میں ہے، اور زبان سے اُس کو

---

[۵۱] فارسی کا مشہور شاعر اور شاہنامہ کا مصنّف۔ رزمیہ شاعری کا سب سے مشہور اور کامل الفن اُستاد۔
[۵۲] اخلاقی شاعری کے مردِ میدان، فارس کے مشہور شاعر اور گلستاں اور بوستاں کے ہر دلعزیز مصنّف۔ [۵۳] نظامی گنجوی فارسی کا مشہور مثنوی گو۔ یوسف زلیخا اور سکندر نامہ کا مصنّف، رزمیہ اور بزمیہ شاعری پر یکساں طور پر قدرت رکھنے والا۔ [۵۴] ابراہیم عادل شاہ کے دربار کا مشہور فارسی شاعر اور فارسی نثر کی شہرۂ آفاق کتاب، سہ نثر ظہوری کا مصنّف۔

یوں لوری دیتی ہے، سورہ، میرے بچّے سورہ، اے اپنے باپ کی مورت، اور میرے دل کی ٹھنڈک سورہ اے میرے دل کی کونپل سورہ، تجھ پر کبھی خزاں نہ آئے، تیری ٹہنی میں کبھی کوئی خار نہ پھوٹے، کوئی کٹھن گھڑی تجھ کو نہ آئے۔ سورہ میرے بچّے سورہ، میری آنکھوں کے نور اور میرے دل کے سرور، میرے بچّے سورہ، تیرا مکھڑا چاند سے بھی زیادہ روشن ہوگا، تیری خصلت تیرے باپ سے بھی اچھی ہوگی، تیری شہرت، تیری لیاقت، تیری محبت جو تو ہم سے کریگا ہمارے دل کو تسلی دیں گی۔ سورہ میرے بچّے سورہ، سورہ میرے بالے سورہ"

"یہ اُمید کی خوشیاں ماں کو اُس وقت تھیں جب کہ بچّہ غوں غاں بھی نہیں کر سکتا تھا، مگر جب وہ ذرا اور بڑا ہوا اور معصوم ہنسی سے ماں کے دل کو شاد کرنے لگا، اور اماں اماں کہنا سیکھا، اُس کی پیاری آواز ادھورے لفظوں میں اُس کی ماں کے کان میں پہنچنے لگی، آنسوؤں سے اپنی ماں کی آتش محبّت کے بھڑکانے کے قابل ہوا، پھر مکتب سے اُس کو سروکار پڑا، رات کو ماں کے سامنے دن کا پڑھا ہوا سبق غمزدہ دل سے سُنانے لگا۔ اور جب کہ وہ تاروں کی چھاؤں میں اُٹھ کر، منہ ہاتھ دھو کر اپنے ماں باپ کے ساتھ صبح کی نماز میں کھڑا ہونے لگا اور اپنے بے گناہ دل، بے گناہ زبان سے، بے ریا خیال سے، خُدا کا نام پکارنے لگا، تو اُمید کی خوشیاں اور کس قدر زیادہ ہو گئیں۔ اور پیاری اُمید تو ہی ہے جو مہد سے لحد تک ہمارے ساتھ ہے"۔

"وہ دلاور سپاہی لڑائی کے میدان میں کھڑا ہے، کوچ پر کوچ کرتے کرتے تھک گیا ہے۔ لڑائی کے میدان میں جبکہ بہادروں کی

صفیں چُپ چاپ کھڑی ہوتی ہیں، اور لڑائی کا میدان ایک سنسان
کا عالم ہوتا ہے، دلوں میں عجیب قسم کی خوف ملی ہوئی جرأت ہوتی ہے۔
اور جب کہ لڑائی کا وقت آتا ہے، اور وہ آنکھ اُٹھا کر نہایت بہادری
سے بالکل بے خوف ہو کر، لڑائی کے میدان کو دیکھتا ہے، اور جبکہ بجلی
سی چمکنے والی تلواریں اور سنگینیں اُس کی نظر کے سامنے ہوتی ہیں، اور
بادل کی سی کڑکنے والی، اور آتشیں پہاڑ کی سی آگ برسانے والی توپوں
کی آواز سُنتا ہے، اور جبکہ اپنے ساتھی کو خون میں لتھڑا ہوا زمین پر
پڑا ہوا دیکھتا ہے، تو اے بہادروں کی قوت بازو! اور اے بہادروں کی ماں!
تیرے ہی سبب سے فتحمندی کا خیال اُس کے دل کو تقویت دیتا ہے۔
اُس کا کان نقارہ میں سے تیرے ہی نغمہ کی آواز سنتا ہے"

تم دیکھ سکتے ہو کہ اِن چند سطروں میں کس طرح نیچر کی تصویر کھینچی ہے اور اس میں کس قدر درد واثر پیدا کیا ہے۔

پالٹکس کا راستہ اس سے بالکل الگ ہے۔

پنجاب میں جب یونیورسٹی قائم ہو رہی تھی جس میں اورینٹل تعلیم پر بہت زور دیا گیا تھا، سرسیّد کو یہ خیال پیدا ہوا کہ اس سے پالٹکس کی بنا پر ہم کو اعلیٰ تعلیم سے روکنا مقصود ہے۔ اُس وقت سرسیّد نے پے در پے تین آرٹکل لکھے۔ اِن تینوں آرٹکلوں نے یونیورسٹی کے بانیوں کو اس قدر گھبرا دیا کہ خاص اِن آرٹکلوں کے جواب میں سیکڑوں مضامین لکھے گئے اور اُن کا مجموعہ یکجا کر کے ایک مستقل کتاب طیّار کی۔ افسوس ہے کہ اختصار کی وجہ سے ہم اُن آرٹکلوں کا کوئی حصّہ نقل نہیں کر سکتے۔

سرسیّد نے انشاپردازی کی ترقّی کے جو طریقے ایجاد کئے اُن میں ایک

یہ تھا کہ بہت سے اعلیٰ درجہ کے انگریزی مضامین کو اُردو زبان کا قالب پہنایا۔ لیکن ترجمہ کے ذریعہ سے نہیں۔ کیونکہ یہ طریقہ اب تک بے سود ثابت ہوا ہے، بلکہ اس طرح کہ انگریزی کے خیالات اُردو میں، اُردو کی خصوصیات کے ساتھ ادا کئے۔ اُمید کی خوشی کا مضمون جس کے ہم نے بعض فقرات اوپر نقل کئے در اصل ایک انگریزی مضمون سے ماخوذ ہے۔ انگریزی میں اڈیسن اور اسٹیل بڑے مضمون نگار گذرے ہیں۔ سرسیّد نے اُن کے متعدّد مضامین اپنی زبان میں ادا کئے۔

سرسیّد کی انشاپردازی کا بڑا کمال اُس موقع پر معلوم ہوتا ہے جب وہ کسی علمی مسئلہ پر بحث کرتے ہیں۔ اُردو زبان چونکہ کسی علمی زبان کی حیثیت سے کام میں نہیں لائی گئی۔ اس میں علمی اصطلاحات، علمی الفاظ اور علمی تلمیحات بہت کم ہیں، اِس لئے اگر کسی علمی مسئلہ کو اُردو میں لکھنا چاہو تو الفاظ مساعدت نہیں کرتے۔ لیکن سرسیّد نے مشکل سے مشکل مسائل کو اِس وضاحت، صفائی اور دل آویزی سے ادا کیا ہے کہ پڑھنے والا جانتا ہے کہ وہ کوئی دلچسپ قصّہ پڑھ رہا ہے۔

پروفیسر رینان نے جو فرانس کا ایک بڑا مشہور مصنّف گذرا ہے، اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ عربی زبان میں یہ صلاحیت نہیں کہ وہ فلسفی مسائل کو ادا کر سکے،، رینان جن مسائل کے اد کرنے کے لئے عربی زبان کو ناقابل سمجھتا ہے (گو یہ اُس کا خیال محض ہے) سرسیّد نے اُردو جیسی کم مایہ زبان میں وہ مسائل ادا کر دئے ہیں۔

سرسید نے فلسفہ الٰہیات پر جو کچھ اپنی مختلف تحریروں میں لکھا ہے وہ فلسفہ کے اعلیٰ درجہ کے مسائل ہیں۔

زمانہ جانتا ہے کہ مجھ کو سرسیّد کے مذہبی مسائل سے اختلاف تھا اور مَیں اِن کے بہت سے عقائد و خیالات کو بالکل غلط سمجھتا تھا، تاہم اِس سے مجھ کو کبھی انکار نہ ہوسکا کہ اُن مسائل کو سرسیّد نے جس طرح اُردو زبان میں ادا کیا ہے، کوئی اور شخص کبھی نہیں کرسکتا۔

سرسیّد کی تحریروں میں جا بجا ظرافت اور شوخی بھی ہوتی ہے۔ لیکن نہایت تہذیب اور لطافت کے ساتھ۔ مولوی علی بخش خاں صاحب مرحوم جو سرسید کے رد میں رسالے لکھا کرتے تھے، حرمین شریف گئے، اور وہاں سے سرسیّد کی تکفیر کا فتویٰ لائے۔ اُس پر سرسید ایک موقع پر 'تہذیب الاخلاق' میں لکھتے ہیں:-

"جو صاحب ہماری تکفیر کے فتوے لینے کو مکّہ معظمہ تشریف لے گئے تھے اور ہمارے ہی کفر کی بدولت اُن کو حج اکبر نصیب ہوا، اُن کے لائے ہوئے فتاوے کے دیکھنے کے ہم بھی مشتاق ہیں۔"

بہ بیں کرامتِ بتخانہ مرا اے شیخ   کہ چوں خراب شود خانۂ خدا گردد

سُبحان اللہ ہمارا کفر بھی کیا کفر ہے کہ کسی کو حاجی اور کسی کو باحجی۔ کسی کو کافر اور کسی کو مسلمان بناتا ہے۔

باراں کہ در لطافتِ طبعش خلاف نیست   در باغ لالہ روید و در شورہ بوم خس

تہذیب الاخلاق جب بند ہوا، تو سرسید نے خاتمہ پر جو مضمون لکھا ہے اُس کے ابتدائی فقرے یہ ہیں:-

"سوتوں کو جھنجھوڑتے ہیں کہ جاگ اُٹھیں، اگر اُٹھ کھڑے ہوئے تو

مطلب پورا ہو گیا۔ اگر نیند میں اُٹھانے سے کچھ بڑبڑائے، کچھ جھنجھلائے اِدھر بات جھٹک دیا، اُدھر پیر جھٹک دیا، اور اینڈے پڑے سوتے رہے تو بھی توقع ہوئی کہ تھوڑی دیر بعد جاگ اٹھیں گے۔ شاید ہمارے بھائیوں کی اِس آخیر یہ تک نوبت آگئی ہے۔ اگر یہ خیال ٹھیک ہو تو ہم کو بھی زیادہ نہ چھیڑنا چاہئے۔ بچے اُٹھاتے وقت کہہ اُٹھتے ہیں کہ ہم کو اُٹھائے جاؤ گے تو ہم اور پڑے رہیں گے۔ تم ٹھہر جاؤ ہم آپ ہی اُٹھ کھڑے ہوں گے۔ بچہ کڑوی دوا پیتے وقت بسورکر ماں سے کہتا ہے کہ بی! بی مت کہے جاؤ کہ شاباش بیٹا! پی لے پی لے۔ تم چُپ رہو میں آپ ہی پی لونگا۔ بھائیو! اب ہم بھی نہیں کہتے کہ اُٹھو۔ پی لو۔ پی لو۔

حقیقت یہ ہے کہ سرسیّد نے اُردو انشا پردازی پر جو اثر ڈالا ہے اُس کی تفصیل کے لئے دو چار صفحے کافی نہیں ہو سکتے۔ یہ کام درحقیقت مولانا حالی کا ہے، وہ لکھیں گے اور خوب لکھیں گے۔ بلکہ یہ کہنا چاہئے لکھ چکے ہیں اور خوب لکھا ہوگا۔[1] میں کالج کی طرف سے مجبور کیا گیا تھا کہ اس وقت جب کہ تمام مُلک میں سرسیّد کا آوازۂ ماتم گونج رہا ہے[2] اور ہر شخص اُن کے کارناموں کے سُننے کا شائق ہے، کچھ نہ کچھ مختصر طور پر لکھنا چاہئے۔ میں نے اس کی تعمیل کی۔ ورنہ میں مولانا حالی کی مقبوضہ سرزمین میں مداخلت کا کوئی حق نہیں رکھتا۔ اور اس شعر کا مصداق بننا نہیں چاہتا۔

بھلا تردد بیجا سے اس میں کیا حاصل ÷ اُٹھا چکے ہیں زمیندار جن زمینوں کو[3] (شبلی)

---

[1] حالی نے سرسیّد کی ایک مبسوط سوانح عمری، حیات جاوید، کے نام سے لکھی ہے۔ اُسکی طرف اشارہ ہے۔ [2] سرسیّد کا انتقال ۱۸۹۸ء میں ہوا اور اُسی سال یہ مضمون بھی لکھا گیا۔ [3] یہ شعر انیس کے ایک سلام کا ہے جو اُنھوں نے مرزا دبیر پر چوٹ کرنے کے خیال سے کہا تھا۔

اُردو ہندی

۱۹۱۲ء میں الہ آباد گورنمنٹ نے ایک ورنیکولر اسکیم کمیٹی قائم کی تھی جس کا مقصد یہ تھا کہ اسکولوں اور کالجوں میں دیسی زبان کا کورس ایسی زبان میں مرتّب کیا جائے جو اُردو ہندی دونوں زبانوں میں ایک ہی عبارت و الفاظ کے ساتھ پڑھا جاسکے، نیز اُردو کے کورس میں بھاشا لٹریچر بھی ضروری قرار دیا جائے۔

مسٹر برن چیف سکریٹری نے اس کے متعلق ایک اسکیم مرتّب کی۔ مولانائے مرحوم اس کیمٹی کے ممبر تھے، اس اسکیم کے متعلق اُنھوں نے جو خیالات ظاہر کئے تھے وہ حسب ذیل تحریر ہے۔

مسٹر برن نے اپنی یادداشت میں جو تجویزیں پیش کی ہیں، اُن میں اصلی اور مہتم بالشان مسائل دفعہ ۳ و ۴ ہیں۔ ان دفعات کا ورنیکولر پر نہایت وسیع اور دیرپا اثر پڑ سکتا ہے، اس لئے ہم کو نہایت غور اور توجہ سے اُن پر نظر ڈالنی چاہیئے۔

دفعات ۳ و ۴ کا ماحصل یہ ہے:

اُردو زبان اور ہندی زبان، دراصل ایک ہی زبانیں ہیں، کیونکہ اُن کی گرامر متحد ہے، اور جن دو زبانوں کی گرامر متحد ہوتی ہے وہ زبانیں دراصل ایک ہی ہوتی ہیں، اس بنا پر ورنیکولر کورس ایسی مشترک زبان میں بننا چاہیئے کہ صرف رسم خط (کیرکٹر) کے فرق سے وہ اُردو اور ہندی دونوں بن جائے۔

لیکن ہندی زبان کی ایک یہ خصوصیت ہے کہ اُس کی نظم و نثر کی گرامر مختلف ہے۔ اس لئے ہندی نظم کی گرامر کی واقفیت اور مہارت کے لئے رامائن تلسی داس، کورس میں داخل ہونی چاہئے، ہندوؤں کے لئے وہ لازمی کر دی جائے اور مسلمانوں کے لئے بھی اُس کا پڑھنا مناسب ہوگا۔

اِس تجویز پر بحث کرنے کے لئے ہم کو پہلے یہ فیصلہ کرلینا چاہئے کہ ہندی کے لفظ سے مسٹر برن کی کیا مراد ہے ؟ ہندی دو قسم کی ہے۔ ایک جو دیہات میں بولی جاتی ہے اور گنوار بولتے ہیں، دوسری جو شہر میں تعلیم یافتہ ہندو روز مرّہ استعمال کرتے ہیں

پہلی قسم کی ہندی تو کسی طرح کورس کی صلاحیت نہیں رکھتی، جس کے دلائل حسب ذیل ہیں :۔

(۱) یہ ہندی ہر ضلع کی الگ ہے، اور ان میں باہم اس قدر اختلاف ہے کہ ایک ضلع کا آدمی دوسرے ضلع کی ہندی کو مشکل سے سمجھ سکتا ہے، اس لئے یہ فیصلہ کرنا ناممکن ہوگا کہ کس ضلع کے دیہات کی زبان کورس میں داخل کی جائے،

(۲) دیہات اور گنواروں کی زبان کسی مُلک میں داخل نصاب نہیں کی جاتی اور نہ وہ کبھی علمی زبان قرار پاتی ہے۔ انگلستان میں دیہات کی انگریزی، کسی نصاب تعلیم میں داخل نہیں ہے، ایران اور عرب وغیرہ کا بھی یہی حال ہے۔

(۳) یہ زبان معمولی روزمرّہ کے مطالب کے ادا کرنے کے لئے کافی ہوسکتی ہے، لیکن وہ کوئی علمی زبان نہیں بن سکتی ہے حالانکہ ورنیکولر کو

اس حد تک ترقی دینا مقصود ہے کہ کالج کلاسوں میں اخیر تک اس کا سلسلہ قائم رہے۔

اب جو کچھ بحث ہو سکتی ہے وہ دوسری قسم کی ہندی کے متعلق ہو سکتی ہے۔

اس میں شبہہ نہیں کہ شہروں میں عموماً ہندو جو زبان بولتے ہیں، وہ اور اُردو زبان، ایک ہی زبانیں ہیں، یعنی ان کے افعال اور اکثر مفرد الفاظ اور گرامر ایک ہی ہیں، فرق یہ ہے کہ عام ہندو جو بالکل تعلیم یافتہ نہیں ہوتے، یا جو پنڈت بھاشا اور سنسکرت میں زیادہ دخل رکھتے ہیں، وہ فارسی عربی الفاظ کے بجائے، زیادہ تر برج بھاشا یا سنسکرت کے الفاظ استعمال کرتے ہیں، لیکن عام تعلیم یافتہ ہندو جو ہندوستانی زبان میں مضامین اور آرٹیکل اور رسالے لکھتے ہیں اُن کی اُردو اور مسلمانوں کی اُردو میں مطلق فرق نہیں ہوتا، متعدد علمی میگزین جن کے مالک و اڈیٹر ہندو ہیں، مثلاً "زمانہ کان پور، ادیب الہ آباد، زبان دہلی" ان میں ہندو انشا پرداز جو مضامین لکھتے ہیں، اُن کی زبان اور اعلیٰ درجہ کے مسلمان انشا پردازوں کی زبان میں کچھ فرق نہیں ہوتا۔ وہ عموماً عربی اور فارسی علمی الفاظ کثرت سے استعمال کرتے ہیں، کیونکہ علمی خیالات کے لئے معمولی ہندی کے الفاظ کافی نہیں ہو سکتے اور سنسکرت کے الفاظ کی نسبت وہ جانتے ہیں، کہ اگر استعمال کئے جائیں تو سمجھنے والوں کی تعداد تھوڑی رہ جائے گی۔

مسٹر برن کی غالباً یہ مراد ہوگی کہ ان دونوں زبانوں کا ایک ہی نصاب بننا چاہیئے، اِس کی مثال بھی موجود ہے، کیونکہ پرائمری اسکولوں میں پانچویں درجہ تک جو کورس پڑھایا جاتا ہے اور جس میں سے جنرل

ریڈر اس سلسلہ کی اخیر کتاب ہے، دونوں زبانوں کے کورس میں داخل ہے۔
لیکن اس کے متعلق حسب ذیل امور قابل لحاظ ہیں۔
اس قسم کی مشترک زبان صرف اس حد تک کے لٹریچر کے لئے کافی ہوسکتی ہے، جو نہایت معمولی مطالب اور خیالات کے ادا کرنے کے لئے کافی ہو، جیسے کہ جنرل ریڈر کی زبان ہے، لیکن جب کہ یہ مقصود ہے کہ ورنیکولر کا سلسلہ کالج کے اخیر کلاسوں تک قائم رہے تو ایسے نصاب کے بنانے کی ضرورت ہوگی، جس میں ہر طرح کے علمی مضامین اور علمی خیالات ادا کئے جائیں، اس حالت میں ان مضامین اور خیالات اور اصطلاحات کے ادا کرنے کے لئے عام روزمرّہ کے الفاظ کافی نہ ہوں گے بلکہ کسی علمی زبان سے مستعار لینے پڑیں گے، یہ علمی زبان، عربی یا سنسکرت ہوگی اور یہاں سخت کشمکش پیدا ہوگی، مسلمان ہرگز اس بات پر رضامند نہ ہوں گے کہ بجائے اُن عربی الفاظ کے جن کو ہر تعلیم یافتہ مسلمان نہایت آسانی سے فوراً سمجھ سکتا ہے، سنسکرت کے الفاظ سیکھیں جو اُن کے لئے بالکل گوش ناآشنا ہیں، ہندو بھی اگرچہ اُن الفاظ سے درحقیقت گوش آشنا نہیں ہوں گے، لیکن وہ بطور ایثار کے اس محنت کو برداشت کریں گے، بہرحال جنرل ریڈر، مروّجہ حال سے آگے چل کر صاف فیصلہ کردینا ہوگا کہ ہندی اور اُردو کے الگ الگ ہوجائیں، ورنہ اِن دونوں زبانوں کے مخلوط کرنے سے حسب ذیل نقصانات ہوں گے۔

(۱) ہمیشہ ایک کشمکش رہے گی۔ نصاب بنانے میں ہندو اور مسلمان دونوں اپنی اپنی قومی زبان یعنی عربی اور سنسکرت کی

طرفداری کریں گے، اور کبھی کوئی اور کبھی کوئی فریق کامیاب ہوگا۔

(۲) دونوں سے ملکر ایک نئی زبان پیدا ہوگی، جو نہ اُردو ہوگی نہ ہندی، اُردو اور ہندی دونوں زبانوں کو اس حد تک ترقی دینا چاہئے کہ وہ علمی زبانیں بن جائیں اور اُن میں ہر قسم کے خیالات اور مضامین ادا کئے جا سکیں، اور یہ اُسی وقت ہو سکتا ہے جب دونوں کو علیحدہ علیحدہ آزادی کے ساتھ ترقی کا موقع دیا جائے اور ایک دوسرے کی راہ میں حائل نہ ہو۔

ہم کو اس بات پر بھی سب سے زیادہ نظر رکھنی چاہئے کہ زبان کو اس حد تک ترقی دینا چاہئے کہ اس کی تصنیفات ہمارے صوبہ تک محدود نہ رہیں، بلکہ ہندوستان کے تمام تعلیم یافتہ لوگوں میں رواج پا سکیں۔ یہ امر بالکل بدیہی ہے کہ ہندوستان کے تمام تعلیم یافتہ مسلمانوں کی زبان اُردو ہے۔ پنجاب، بنگال، مدراس، بمبئی کے قابل اور لائق مسلمان جو تصنیفات انگریزی زبان کے علاوہ کرتے ہیں، وہ اُردو میں ہوتی ہیں اور یہ وہی اُردو ہے جو سنسکرت الفاظ سے بالکل خالی ہے۔ اس لئے اگر اس زبان کو سنسکرت الفاظ ملاکر ہندی اور اُردو کی ایک زبان بنائی جائے گی تو ایک زبان جو تمام ہندوستان کی اور کم از کم یہ کہ تمام مسلمانوں کی لینگوا فرانکا ہے گھٹ کر ایک صوبہ بلکہ ایک ضلع کی زبان رہ جائے گی۔

اب میں مسٹر برن کی اس منطق کی طرف متوجہ ہوتا ہوں جو ان کی تمام تجویزوں کا سنگ بنیاد ہے؛ یعنی یہ کہ ہندی اور اُردو کی گرامر ایک ہیں۔

دو زبانوں کی گرامر کے متحد ہونے سے صرف یہ ثابت ہو سکتا ہے کہ دونوں ایک ہی خاندان کی زبان ہیں، یا ایک دوسرے سے نکلی ہیں، سیرین زبانوں میں گرامر کے اعتبار سے ایک عام اتحاد پایا جاتا ہے اور یہ اتحاد بعض زبانوں میں بہت زیادہ ہوتا ہے، تاہم وہ زبانیں مختلف رہتی ہیں، اور اُن سے مشترک کورس نہیں تیار ہو سکتا۔ عبری زبان کی جو گرامر آج کل بیروت میں شائع ہوئی ہے، اور جو ایک قدیم مستند تصنیف ہے، وہ عربی کے نہایت قریب ہے اور اس اتحاد سے کسی طرح کم نہیں جس قدر کہ ہندی اور اُردو میں اتحاد ہے، تاہم عبری اور عربی زبان کا کوئی مشترک کورس نہیں بن سکتا۔

اس کے علاوہ اگر دو زبانوں کی گرامر ایک ہو، لیکن الفاظ بالکل مختلف ہوں تو اُن کو ایک زبان نہیں کہہ سکتے مشرقی ہندوستان کی زبانوں کی گرامر تقریباً بالکل متحد ہے، باوجود اس کے نہ وہ ایک زبانیں کہی جا سکتی ہیں نہ اُن کا کوئی مشترک کورس بن سکتا ہے۔

مسٹر پرن کا یہ دعویٰ اور سخت حیرت انگیز ہے کہ ہندی کی نظم کی ایک یہ خصوصیت ہے کہ اس کی گرامر نثر کی گرامر سے مختلف ہے۔ نظم و نثر میں گرامر کا ایک خفیف فرق تمام زبانوں میں اس لحاظ سے ہوتا ہے کہ نظم میں وزن کی ضرورت سے الفاظ آگے پیچھے کر دئے جاتے ہیں۔ لیکن اس کے لئے علٰحدہ گرامر بنانے کی ضرورت نہیں ہوتی، متعلم خود سمجھ لیتا ہے کہ وزن کی ضرورت نے یہ تغیر کر دیا ہے، ہندی زبان کی نظم کی گرامر نثر سے مختلف ہو گی تو اسی قدر ہو گی اس سے زیادہ اختلاف کی کوئی

وجہ نہیں ہو سکتی۔

نظم کی گرامر کے مختلف ہونے سے جو استدلال کیا گیا ہے اُس میں سخت منطقی مغالطہ ہے۔

رامائن کی گرامر مختلف ہے، لیکن اس کی یہ وجہ ہے کہ آج سے تین سو برس پہلے کی زبان ہے۔ اس زمانہ کی اگر کوئی نثر ملے گی تو آج کی نثر کی گرامر سے اُسی قدر مختلف ہو گی جس قدر کہ نظم کی گرامر مختلف ہے۔

رامائن کی زبان آج کل کی ہندی نہیں ہے، اس لئے اس کا کورس میں داخل کرنا اگر اس لحاظ سے ہے کہ زبان کی وسیع واقفیت کے لئے اس کی ابتدائی حالت اور عہد بعہد کی تبدیلیوں سے واقفیت ضروری ہے تو یہ رائے بالکل بجا ہے، لیکن اس غرض کے لئے دو امر کا لحاظ ضروری ہے۔

ایک یہ کہ ایسا کورس اسکول کے لئے موزوں نہیں، بلکہ کالج کلاسوں میں داخل ہونا چاہیئے جس طرح کہ قدیم انگریزی زبان کی کوئی کتاب انٹرنس تک داخل نہیں ہے۔

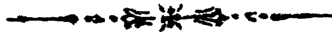
دوسرے یہ کہ اس قسم کا کورس خالص ہندی زبان کے لئے ہونا چاہیئے جو صرف اُن لوگوں کے لئے بنایا جائے جو ہندی بھاشا اور سنسکرت کی تحصیل کرنا چاہتے ہیں، ایسا کورس عام ورنیکولر کے لئے بالکل موزوں نہیں ہو سکتا۔

اخیر میں میں نہایت زور سے کہتا ہوں کہ نہایت ابتدائی درجوں تک ایک سادہ زبان جو عربی اور سنسکرت دونوں سے قریباً آزاد ہو اختیار کی جا سکتی ہے لیکن ہائر کلاسوں کے لئے اُردو اور

ہندی زبانوں کو بالکل الگ الگ قائم کرنا چاہئے اور اسی صورت میں دونوں اعلیٰ درجہ تک ترقی کرسکتی ہیں۔

گراموں کے معمولی اشتراک سے دونوں زبانوں کو ایک قرار دینا اور اُس کی بناپر اخیر درجہ تک ایک نصاب بنانا سخت غلطی ہے، جس سے دونوں زبانیں برباد ہو جائیں گی۔

(شبلی نعمانی)



آٹھوں کا میلہ

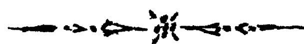
[سرشار کی سب سے مشہور تصنیف اُن کا "فسانۂ آزاد" ہے۔
اس کتاب میں شروع سے آخر تک لکھنؤ کی سوسائٹی کے مختلف
مرقّعے اِس طرح پیش کیے گئے ہیں کہ فسانۂ آزاد کا ہیرو آزاد ہر جگہ
جاتا ہے اور اُن چیزوں کو دیکھ کر جو اثر قبول کرتا ہے اُس کا بیان مصنّف
نے کر دیا ہے۔ "آٹھوں کا میلہ" اِسی کتاب کا ایک حصہ ہے]

وہاں سے جو میاں آزاد تیر کی طرح رواں ہوئے تو راہ میں دیکھا کہ
کئی مسافر لدے پھندے جا رہے ہیں۔ کیوں بھئی اس وقت کہاں ؟ لکھنؤ۔
لکھنؤ۔ یہ کیوں ؟ کیوں کیا! آٹھوں کا میلہ ہے یا نہیں ؟ اس دھوم دھڑکے
کا میلہ دیکھا نہ سُنا۔ ہاں ! تو اب ہم بھی چلتے ہیں۔ محرم الحرام اور
بہار بسنت کے تو خوب مزے اُڑائے اب چلتے ہیں میلہ بھی دیکھ لیں
کیا جانے پھر ہاتھی چھوٹے گھوڑا چھوٹے۔ یہ کہہ کر میاں آزاد بھی لکھنؤ
چلے۔ نور کے تڑکے داخل۔ سبحان اللہ کیا صبح ہے۔ عارفانِ حق پرست
کے دل کی طرح نورانی اور باطن میں اہلِ تصوّف کے مثل مہبطِ فیضِ ربّانی۔
جدھر دیکھو تجلّی اور نور۔ جدھر جاؤ لطف اور سرور۔ سلطانِ خاوری کے
تاجِ زرّیں کی چمک اور اشعۂ زرنگار سے ذرّوں کی جھلک نمودار۔
در و دیوار سے آیۂ وجعلنا الشمس ضیاء آشکار۔ سہ شنبہ کا دن جس کی
شان میں فصحا نے کہا ہے کہ مکتب خانہا را رونقِ بازار از دست
و اطفالِ دبستان سبق آموز او۔ الف ابجد زبانان است و نقطۂ اولین

پرکالپردوراں) دیکھتے کیا ہیں کہ صبح ہی سے میلے کا رنگ جما ہے۔ نخل بہار کی نشو و نما ہے۔ غت کے غت ٹھٹ کے ٹھٹ۔ شہدے لٹے۔ لوڑے لچّے۔ گرہ کٹ۔ جیب کترے۔ چرسیے۔ مدکیے۔ گنجڑے۔ بھنگیڑے۔ شریف و نجیب، زیرک و لبیب سب جوق جوق اُمنڈے آتے ہیں۔ تامدان ہوادار۔ رہوار بادرفتار۔ فنس زرنگار۔ ٹٹو گھوڑا سب خراماں خراماں پوتدمے آ رہے ہیں۔ بگھی پر بگھی ٹوٹی پڑتی ہے۔ گاڑی سے گاڑی لڑتی ہے۔ رنگیلوں چھیل چھبیلوں کی بن آئی۔ گاڑھی بوٹی چڑھائی۔ بن ٹھن کے چھیلا بن کے میلہ دیکھنے چلے۔ بالوں میں حنا کے تیل چھوڑے۔ کیچل بسنٹ کا دھانی رومال اوڑھے۔ دو انگل مانگ کھولے۔ بانڈری تولے۔ پٹیاں جمائے گھڑی لگائے۔ ڈاڑھی چڑھائے۔ گلے میں گلوبند۔ شربتی کا انگرکھا تن کا زیب، پاؤں میں مخملی جوتی، کاشانی یا سوتی قہقہے اُڑاتے آنکھیں لڑاتے جا رہے ہیں۔ اِدھر اُدھر نظارہ بازی کر کے مسکرا رہے ہیں۔ فنس پر ماہرو گھٹے سے بیٹھی ہیں مگر بندہ ہوبچو کا شور بلند سا قنوں کا بازار گرم کسی نے دو کش پیئے ٹکا ہتھیایا۔ سا قنوں کی دوکانیں دھواں دھار۔ تنبولیوں کے بیڑے تڑے دار۔ کان میلیے کی سرگوشی حجام کی رونمائی۔ برف والے کی سرد مہری۔ سنکرنوں کی ہانک آنب کے مچے کی کمر کھے ہیں۔ کابل کا میوہ رس بھری تاجے گلابیاں شہتوت۔ لوٹ لو، ہرے بھرے پونٹ، کسی طرف سرمستی شیشہ کنگھی دیا سلائی کی ڈبیا ہے۔ تختی پھولا نالکا کا باغ میلے کا چشم و چراغ سبز گلبیت راسے کا تالا ہے یہ اروں میں انتخاب لاکھوں میں لاجواب ہے۔

جو سلسبیل و کوثر کو شرمائے نسیم دیکھے تو پانی پانی ہو جائے عجیب لطف وسما ہے، ہزار ہا تماشائی تالاب کے ارد گرد بستر جمائے کوئی دری کوئی زین پوش بچھائے بیٹھا میلہ دیکھ رہا ہے۔ کوئی جہانیانِ جہاں گشت چکر لگا رہا ہے، کوئی ہوا کھاتا ہے۔ ایک فنس پر ایک جوان رعنا ڈھوہ کا ڈھوہ پچیس برس کا سن چلنے پھرنے کے دن لدا ہوا جا رہا ہے۔ کوئی ٹٹو کو ٹخ ٹخ کرتا آ رہا ہے۔ اُمرا کے لڑکے زیور سے گو ندنی کی طرح لدے مٹھائی خریدنے میں مصروف ہیں مگر خدمتگار دیکھ بھال رہا ہے کہ کوئی دست چالاک ہاتھوں ہاتھ پاؤں کے گھونگھرو نہ اُڑا لے۔ عورتیں الگ زیور سے متجلّی گھونگھٹ کاڑھے دبکی چلی جاتی ہیں کہ کوئی چوہے دتّیاں نہ موس لیجائے۔ تخت رواں آتے ہیں، سوانگ کرتب دکھاتے ہیں۔ شعبدہ باز سوانگ لاتے ہیں۔ کوئی دہکتا انگارا کھا گیا۔ کوئی لوہے کے چنے کر کرا کے چبا گیا۔ براہمن ڈول لئے گشت لگاتے ہیں، سقّے اور بھشتی کٹورے کھنکھناتے ہیں، سہ پہر تک خوب جگمگا رہا چراغ روشن ہوئے اور یار لوگ کھسکے۔ کسی نے متّی کا بلوا لیا۔ کسی نے روح کا لنگور راستے میں ایک ریلا آیا تو کھلو نے چکنا چور۔ ایک نے غل مچایا کہ وہ ہاتھی آیا، بھیڑ چھٹ گئی اور ڈراتے ہوئے، چلے گئے۔ مگر بگڑے دل اپنی جگہ سے نہ ٹلے، شربتی انگرکھا چاہے ان گاؤ زوریوں میں چڑ سے نکل جائے مگر ممکن کیا کہ بل جائے اس بھیڑ بھاڑ میں پولیس کا انتظام خوب رہا۔ چوٹٹے اُچکّے جاکر پچھتائے۔ بھلے مانس مزے سے گھر آئے۔

(سرشار)



آصف الدولہ

مولانا شرر نے ایک کتاب "گذشتہ لکھنؤ" کے نام سے لکھی ہے، جس میں لکھنؤ کی سلطنت والوں کے مختلف بادشاہوں اور وہاں کی سوسائٹی کی مختلف باتوں کا مفصّل ذکر کیا ہے۔ نیچے کے دونوں سبق اِسی کتاب کے حِصّے ہیں۔

آصف الدولہ نے مسندِ حکومت پر قدم رکھتے ہی ماں سے ناراض ہو کے لکھنؤ کی راہ لی۔ اور یہی وہ زمانہ ہے جب سے دربار اودھ کی قوت فرماں روائی گھٹنے اور لکھنؤ کی ظاہری رونق بڑھنے لگی۔ بکسر کا میدان جیتنے کے بعد انگریزوں نے دربار اودھ میں دخل دہی کے بہت سے حقوق حاصل کر لئے تھے۔ جن کی بنا پر یہاں فوجی ترقیوں کی روک ٹوک کی جاتی اور ہمیشہ غائر نظر سے اِس بات کی نگرانی کی جاتی کہ حکومت اودھ کو پھر ایسی قوت نہ حاصل ہونے پائے کہ اس کی فوجیں دوبارہ انگریزی لشکر کے سامنے صف آرا ہو سکیں۔ تاہم شجاع الدولہ جب تک فیض آباد میں زندہ رہے فوجی اصلاح ہی میں مصروف رہے۔ اور رات دن اسی بات کی دُھن تھی کہ جس طرح بنے اپنی قوت کو بڑھائیں۔ چنانچہ منشی فیض بخش اپنی تاریخ فرح بخش میں اسی زمانے کا چشم دید حال بیان کرتے ہیں کہ جلدی بھرنے اور فیر کرنے کے اعتبار سے شجاع الدولہ کی فوج کی بندوقوں کے مقابلے میں انگریزی فوج کی بندوقیں کوئی وقعت نہ رکھتی تھیں۔

لیکن آصف الدولہ کا عہد شروع ہوتے ہی یہ سب باتیں تشریف لے گئیں۔ انگریزوں نے بڑی ہوشیاری کے ساتھ اپنے دخل دہی کے حقوق کو بڑھانا شروع کیا اور نہایت دانائی سے آصف الدولہ کو اس بات پر آمادہ کر دیا کہ فوجی اصلاح کی طرف سے بے پروا ہو کے دوسرے مشاغل میں جی بہلائیں۔ آصف الدولہ کو خود بھی فوج کا زیادہ شوق نہ تھا۔ انھیں لُٹانے اور مرے اُڑانے کے لئے روپئے کی ضرورت تھی جو بغیر فوج کے موقوف کئے پوری نہ ہو سکتی تھی۔ اس لئے انھوں نے تھوڑی سی فوج رکھ لی۔ باقی سب کو معزول کر دیا۔ اور عیش و عشرت میں مصروف ہو گئے۔ وہ اپنے مغربی دوستوں کے اطاعت کیش دوست تھے۔ جو اُن کے اشاروں پر چلتے اور اُن کے مشوروں کے آگے کسی کی نہ سُنتے۔

اس خلوص عقیدت کے صلے میں انگریزوں نے روہیلکھنڈ پر اُن کا قبضہ کرا دیا۔ اپنی ماں بہو بیگم صاحبہ کے ستانے اور لوٹنے کے لئے جب انھوں نے انگریزوں سے مدد مانگی تو نہایت فیاضی کے ساتھ انھیں اخلاقی مدد دی گئی اور اُن کی طرفداری کی گئی لیکن اس پر بھی اُن کے زمانے تک انھیں یا لکھنؤ کی رعایا کو بہت ہی کم محسوس ہو سکا کہ ہمارے نظم و نسق میں کسی بیرونی قوت کو دخل ہے۔ جس کی زیادہ تر وجہ یہ تھی کہ آصف الدولہ کی عام فیاضی اور عیش پرستی نے ساری رعایا کو بھی عیش پرست و عشرت طلب بنا دیا تھا۔ اور کسی کو موجودہ راحت و آرام کے آگے انجام پر غور کرنے کی ضرورت ہی نہ محسوس ہوتی تھی۔

اس عیش پرستی کا نتیجہ یہ تھا کہ ظاہری صورت میں اُن دنوں لکھنؤ کے دربار میں ایسی شان وشوکت پیدا ہوگئی جو کہیں اور کسی دربار میں نہ تھی۔ اور ایسا سامان عیش جمع ہوگیا تھا جو کسی جگہ نظر نہ آتا۔ اُن دنوں شہر لکھنؤ ایسی رونق پر تھا کہ ہندوستان ہی نہیں، شاید دنیا کا کوئی شہر لکھنؤ کے اوج وعروج کا مقابلہ نہ کرسکتا ہوگا۔ شجاع الدولہ جو روپیہ فوج اور جنگی تیاریوں میں صرف کرتے تھے اُسے آصف الدولہ نے اپنی عیش طلبی کے ذوق اور شہر کی آرائش وخوش حالی میں صرف کرنا شروع کردیا، اور چند ہی روز کے اندر ساری دُنیا کی دھوم دھام اپنے یہاں جمع کرلی۔ اُن کا حوصلہ بھی یہی تھا کہ نظام حیدرآباد ہوں یا ٹیپو سلطان، کسی دربار کا کرّوفر اور کسی کی شوکت وحشمت میرے دربار سے زیادہ نہ ہوسکے۔

اپنے بیٹے وزیر علی خاں کی شادی میں اُنھوں نے ایسا حوصلہ دکھایا کہ برات کا تزک واحتشام تاریخ ارض کے تمام تکلفات سے بڑھ گیا۔ برات کے جلوس میں بارہ سو ہاتھی تھے۔ دولھا جو شاہی خلعت پہنے تھا اُس میں بیس لاکھ کے جواہرات ٹنکے ہوئے تھے۔ محفل طرب کے لئے دو عظیم الشان اور پُرتکلف خیمے بنوائے گئے جن میں ہر ایک ۶۰ فٹ چوڑا ۱۲۰۰ فٹ لمبا اور ۶۰ فٹ بلند تھا۔ اور عمدہ نفیس اور قیمتی کپڑا لگایا گیا تھا کہ اُن دونوں کی تیاری میں سلطنت کے دس لاکھ روپئے صرف ہوگئے۔

اُنھوں نے دریا کنارے مچھی بھون کے مغرب طرف دولتخانہ رومی دروازہ، اور اپنا یکتائے روزگار امام باڑہ تیار کرایا۔ ۱۲۱۳ھ محمدی

(۱۷۸۴ء میں اودھ میں قحط پڑ گیا تھا۔ اور شرفائے شہر تک فاقہ کشی میں مبتلا تھے۔ اس نازک موقع پر رعایا کی دستگیری کے لئے امام باڑے کی عمارت چھیڑ دی گئی۔ چونکہ شریف لوگ دن کو مزدوری کرنے میں اپنی بے عزتی خیال کرتے تھے اس لئے تعمیر کا کام دن کی طرح رات کو بھی جاری رہتا۔ اور غریب و فاقہ کش شرفائے شہر رات کے اندھیرے میں آکے مزدوروں میں شریک ہو جاتے اور مشعلوں کی روشنی میں کام کرتے۔ اس عمارت کو نواب نے جیسے خلوص عقیدت اور جوش دینداری سے بنوایا تھا ویسے ہی خالص اور سچے دلی جوش سے لوگوں نے تعمیر بھی کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایسی نفیس اور شاندار عمارت بن کے تیار ہو گئی جو اپنی نوعیت میں بے مثل اور نادرِ روزگار ہے۔ اُس کا نقشہ بنانے کے لئے بڑے بڑے مشہور مہندس اور معمار بلائے گئے۔ اور سب نے کوشش کی کہ ہمارا نقشہ دوسروں کے مجوزہ نقشے سے بڑھ جائے۔ مگر کفایت اللہ نام ایک بے مثل زمانہ معمار کا نقشہ پسند کیا گیا اور اُسی کے مطابق عمارت بننا شروع ہو گئی۔ جو ۱۶۷ فٹ لمبی ۵۲ فٹ چوڑی ہے۔ اینٹ اور نہایت اعلیٰ درجے کے چونے سے یہ عمارت بنائی گئی۔ جس میں فرش سے چھت تک لکڑی کا نام نہیں ہے۔ اس عمارت کو شاہانِ مغلیہ کی سنگین عمارتوں سے کسی قسم کا تعلق نہیں ہے۔ لکھنؤ میں اس کثرت سے سنگ مرمر دستیاب نہیں ہو سکتا تھا۔ لیکن امام باڑے اور آصف الدولہ کی دوسری عمارتوں کو دیکھیے تو ایک نئی خوشنما اور نرالی عظمت و شان رکھتی ہیں۔ امام باڑے کے لداؤ کی چھت چو

کرڑا دے سے بنائی گئی ہے اتنی بڑی ہے کہ اتنی بڑی لداؤ کی چھت ساری دُنیا میں کہیں نہیں ہے۔ اور اسی وجہ سے یہ بھی دُنیا کی اعجوبۂ روزگار کاریگریوں میں شمار کی جاتی ہے۔

آصف الدولہ کی عمارتوں پر یورپ کی عمارتوں کا ذرا بھی اثر نہ تھا۔ وہ اپنی نوعیت میں خالص ایشیائی ہیں جن میں نمایشی نہیں اصلی و حقیقی شان و شوکت پائی جاتی ہے۔ نواب آصف الدولہ کے بعد یہ عمارتیں کس مپرسی میں پڑی رہیں۔ غدر کے بعد انگریزوں نے اُن پر قبضہ کر کے گرد و پیش کے مکانوں کو منہدم کر دیا۔ اور سوا اُس جانب کے جدھر دریا ہے باقی تینوں طرف میدان کر کے امام باڑے کو قلعہ اور رومی دروازے کو اُس کا پھاٹک بنا لیا۔ اُس زمانے میں اِس امام باڑے میں گورے رہتے تھے۔ اس کے بڑے ہال میں سلح خانہ تھا۔ اور اُس کے فرش پر بڑی بڑی توپیں دوڑتی پھرتی تھیں۔ مگر نہ کبھی زمین کُھدی نہ در و دیوار کی کوئی چیپ اُکھڑی۔ اب سرکار انگریزی نے امام باڑے کو چھوڑ کے پھر مسلمانوں کے حوالے کر دیا ہے۔ اُس کی مسجد میں ایک مجتہد صاحب نماز پڑھاتے ہیں اور امام باڑے میں تعزیہ داری ہوتی ہے۔

نواب آصف الدولہ کی عمارتوں کی مضبوطی کا اندازہ اِس سے ہو سکتا ہے کہ اُنھیں تعمیر ہوئے اگرچہ سوا سو برس سے زیادہ مدت گذر گئی مگر آج تک اُسی عظمت و شکوہ اور اُسی مضبوطی و پائداری سے اپنی جگہ پر قائم ہیں۔ نہ کوئی اینٹ اپنے مقام سے ہٹتی ہے اور نہ کسی جگہ چونے نے اینٹوں کو چھوڑا ہے۔ بہ خلاف اُن کے دیگر

شاہانِ اودھ نے کروڑوں روپیہ صرف کرکے جو عمارتیں بعد کو بنوائیں وہ قومی و ملکی وضعداری کے مفقود ہو جانے کے علاوہ نہایت کمزور ہیں۔ اور اگر وقتاً فوقتاً مرمت نہ ہوتی رہتی تو آج تک کب کی منہدم ہو چکی ہوتیں۔

آصف الدولہ امام باڑے اور مچھی بھون کے متصل اپنے محل "دولت خانے" میں رہتے تھے۔ شہر کے باہر اور دریا پار ہجوم خلائق سے دور اور دنیوی جھگڑوں سے الگ رہ کے مصروف عیش ہونے کے لئے بیبیا پور کا محل بنوایا۔ اکثر جب وہ سیر و شکار کے لئے جاتے تو اُسی مکان میں قیام کرتے۔ اِسی طرح چنہٹ میں ایک پُرفضا و نزہت بخش مکان۔ اور چار باغ اور عیش باغ میں روشیں بنوائیں اور اُسی زمانے میں یحییٰ گنج میں اور اُس کے متصل اصطبل بنے۔ پھر محلہ وزیر گنج قائم ہوا جو آصف الدولہ کے بیٹے وزیر علی خاں کی قیام گاہ ہونے کے باعث اُنھیں کی طرف منسوب اور اُنھیں کی یادگار ہے۔ (شرر)

طیور کی لڑائی

درندوں کی لڑائی لکھنؤ میں صرف سلطنت اور امرا کے دربار تک محدود تھی۔ اس لئے کہ اُن کی داشت۔ تیاری۔ لڑائی کے وقت اُن کو سنبھالنا اور تماشائیوں کو اُن کی مضرت سے بچانا ایسی چیزیں ہیں جو غربا تو درکنار، بڑے بڑے امیروں کے امکان سے بھی باہر ہیں۔ اور اِسی لئے درندوں کی لڑائی سوادِ لکھنؤ میں اُسی وقت تک

دیکھی گئی جب تک اگلا دربار قائم تھا۔ اِدھر وہ دربار برخاست ہوا اور اُدھر وہ وحشت ناک دنگل بھی اُجڑ گئے۔

لیکن طیور کی لڑائی ایسی نہ تھی۔ اِس کا شوق ہر امیر و غریب کر سکتا تھا۔ اور ہر شوقین محنت کر کے لڑائی کے قابل مُرغ یا بٹیر تیار کر سکتا تھا۔ جو طیور لکھنؤ میں شوق اور دلچسپی کے ساتھ لڑائے گئے حسب ذیل ہیں:-

(۱) مُرغ (۲) بٹیر (۳) تیتر (۴) لوے (۵) گُلدم (۶) لال۔ (۷) کبوتر (۸) طوطے۔ اِن میں سے ہر ایک کھیل کے جُدا جُدا بیان کرنے کی ضرورت ہے۔ لکھنؤ کی کبوتر بازی اور بٹیر بازی عام طور پر مشہور ہے۔ جس پر آج کل کے تعلیم یافتہ اور موجودہ تہذیب کے دلدادہ اکثر تمسخر کیا کرتے ہیں۔ وہ اِس سے مطلق واقف نہیں کہ اُن شوقوں اور کھیلوں میں سے ہر ایک کو اِن لوگوں نے کس درجۂ کمال تک پہنچا کے ایک مستقل فن بنا دیا تھا۔ لیکن جب وہ یورپ میں جا کے وہاں بھی اِسی قسم کے لغو شوق دیکھیں گے تو کم سے کم اُنھیں اپنے اُن الفاظ پر ندامت ضرور ہو گی جو اپنے وطن کے اِن شوقینوں کی نسبت اکثر بے ساختہ کہہ بیٹھتے ہیں۔

(۱) مُرغ بازی

لڑتے اگرچہ ہر قسم اور ہر قوم کے مُرغ ہیں مگر لڑائی کے لئے مخصوص اصیل مرغ ہے۔ اور سچ یہ ہے کہ دنیا میں اصیل مرغ سے زیادہ بہادر کوئی جانور نہیں ہے۔ مُرغ کی سی بہادری درحقیقت شیر میں بھی نہیں ہے۔ وہ مر جاتا ہے مگر لڑائی سے مُنہ نہیں موڑتا۔ اصیل مُرغ کی نسبت

یہاں کے محققین کا خیال ہے کہ اُن کی نسل عرب سے لائی گئی ہے۔ اور یہ قرین قیاس بھی معلوم ہوتا ہے ۔ اس لئے کہ فی زمانناً اصیل کی جس قدر زیادہ اور اعلیٰ نسلیں حیدر آباد دکن میں موجود ہیں کہیں نہیں ہیں۔ اور ہندوستان میں وہی ایک شہر ہے جہاں اہل عرب سب جگہوں سے زیادہ آباد اور مقیم ہیں۔ بلندی ہند میں مُرغوں کی نسلیں ایران ہوتی ہوئی آئیں ۔ لکھنؤ کے نامی مُرغ بازوں میں سے ایک صاحب کا بیان تھا کہ بازی میں اُن کا مُرغ اتفاقاً ہار گیا تھا۔ دل شکستہ ہو کے وہ ارضِ عراق میں چلے گئے۔ نجف اشرف میں کئی مہینے تک مصروف عبادت رہے اور شب و روز دعا کرتے کہ خداوندا اپنے ائمہ معصومین کا صدقہ مجھے ایسا مُرغ دلوا جو لڑائی میں کسی سے نہ ہارے ۔ ایک رات کو خواب میں بشارت ہوئی کہ "جنگل میں جاؤ" صبح آنکھ کھلتے ہی اُنھوں نے کوہ و بیابان کا راستہ لیا ۔ اور ایک مرغی ساتھ لیتے گئے یکایک ایک درّہ کوہ سے ککڑوکوں کی آواز آئی ۔ اُنھوں نے فوراً قریب جا کے مُرغی چھوڑی ۔ جس کی آواز سُنتے ہی مُرغ نکل آیا ۔ اور یہ فوراً کسی حکمت سے اُسے پکڑ لائے ۔ اُس کی نسل ایسی تھی کہ پھر کبھی پالی میں اُنھیں شرمندہ نہ ہونا پڑا ۔

مُرغوں کی لڑائی کا شوق یہاں نواب شجاع الدولہ کے عہد سے آخر تک برابر رہا ۔ نواب آصف الدولہ کو بے انتہا شوق تھا ۔ نواب سعادت علی خاں باوجود بیدار مغزی کے مُرغ بازی کے دلدادہ تھے ۔ اُن کے شوق نے سوسائٹی پر ایسا اثر ڈالا کہ لکھنؤ کے اُمرائے دربار تو درکنار اُس زمانے میں جو اہلِ یورپ یہاں موجود

تھے۔ اُنھیں بھی یہی شوق ہوگیا تھا۔ چنانچہ جنرل مارٹن جن کی کوٹھی لکھنؤ کی ایک قابلِ دید عمارت اور یورپین بچّوں کی درس گاہ ہے اوّل درجے کے مُرغ باز تھے اور نواب سعادت علی خاں اُن سے بازی بد کے مُرغ لڑایا کرتے۔

لکھنؤ میں مُرغوں کی لڑائی کا یہ طریقہ تھا کہ مُرغ کے کانٹے باندھ دیئے جاتے تاکہ اُن سے ضرر نہ پہنچا سکے۔ چونچ چاقو سے چھیل کے تیز اور نُکیلی کی جاتی اور جوڑ کے دونوں مُرغ پالی میں چھوڑ دیئے جاتے۔ مُرغ باز اُن کے پیچھے پیچھے رہتے۔ مُرغ کو دوسرے مُرغ کے مقابلے میں چھوڑنا بھی ایک فن تھا۔ جس میں یہ کوشش رہتی کہ ہمارا ہی مُرغ پہلے چوٹ کرنے کا موقع پائے۔ اب دونوں مُرغ چونچوں اور لاتوں سے لڑنا شروع کرتے۔ مرغ باز اپنے اپنے مُرغ کو اُبھارتے اور اشتعال دیتے۔ اور چلّا چلّا کے کہتے "ہاں بیٹا شاباش" "پھر یہیں پر" مُرغ اُن کی للکاروں اور بڑھاوؤں پر اس طرح بڑھ بڑھ کے لاتیں اور چونچیں مارتے کہ معلوم ہوتا جیسے سمجھتے اور اُن کے کہنے پر عمل کرتے ہیں۔ جب لڑتے لڑتے زخمی اور چُور ہو جاتے تو باتفاق فریقین تھوڑی دیر کے لئے اُٹھائے جاتے۔ یہ اُٹھا لینا مُرغ بازی کی اصطلاح میں "پانی" کہلاتا ہے۔ اُس وقت مُرغ باز اُن کے زخمی سروں کو پونچھتے اور اُن پر پانی کی پھوہاریں دیتے۔ زخموں کو اپنے مُنہ سے چوستے اور ایسی ایسی تدبیریں کرتے کہ چند منٹ کے اندر مرغوں میں پھر نیا جوش پیدا ہو جاتا اور تازہ دم ہو کے دوبارہ پالی میں چھوڑے جاتے۔ اِسی طرح برابر پانی ہوتے رہتے۔ اور لڑائی کا

خاتمہ چار پانچ روز بعد اور کبھی آٹھ نو روز بعد ہوتا۔ جب ایک مُرغ اندھا ہو جاتا یا ایسی چوٹ کھا جاتا کہ اُٹھنے کے قابل نہ رہے۔ یا اور کسی وجہ سے لڑنے کے قابل نہ رہتا تو سمجھا جاتا کہ وہ ہار گیا۔ بارہا یہ ہوتا کہ مُرغ کی چونچ ٹوٹ جاتی۔ اس صورت میں بھی جہاں تک بنتا مرغباز چونچ باندھ کر لڑاتے۔

حیدرآباد کا کھیل یہاں کے خلاف بہت سخت ہے۔ وہاں کانٹے نہیں باندھے جاتے بلکہ بعوض باندھنے کے چاقو سے چھیل کے برچھی کی انی بنا دئے جاتے ہیں۔ اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لڑائی کا فیصلہ گھنٹہ ہی ڈیڑھ گھنٹے میں ہو جاتا ہے۔ لکھنؤ میں خاروں کے باندھنے طریقہ غالباً اس لئے اختیار کیا گیا تھا کہ لڑائی طول کھینچے اور زیادہ زمانے تک لطف اُٹھایا جا سکے۔

لڑائی کے لئے مرغوں کی تیاری میں مُرغ باز کے کمالات غذا اور داشت کے علاوہ اعضا کی مالش۔ پھوئی یعنی پانی کی پھوہار دینے چونچ اور خار بنانے۔ یا خار کے باندھنے اور کوفت کے مٹانے میں نظر آتے ہیں۔ اِس اندیشے سے کہ زمین پر دانہ چگنے میں چونچ کو نقصان نہ پہنچ جائے۔ اکثر اُنھیں دانہ ہاتھ پر کھلایا جاتا ہے۔

یہ شوق واجد علی شاہ کے زمانے تک زوروں پر تھا۔ مٹیا برج میں نواب علی نقی خاں کی کوٹھی میں مُرغوں کی پالی ہوتی تھی ۔ اور کلکتے سے بعض انگریز اپنے مُرغ لڑانے کو لایا کرتے تھے۔ بادشاہوں کے علاوہ اور بہت سے رئیسوں کو بھی مُرغ بازی کا شوق تھا۔ مرزا حیدر، بہو بیگم صاحبہ کے بھائی نواب سالار جنگ حیدر بیگ خاں

میجر سوارس جو نصیر الدین حیدر کے زمانے میں تھے اور خود بادشاہ سے مرغ لڑاتے تھے۔ آغا برہان الدین حیدر بھی مرغ بازی کے شائق تھے۔ آخر الذکر رئیس کے وہاں آخر زمانے تک دو اڑھائی سو مرغ رہتے۔ نہایت ہی صفائی اور نفاست سے رکھے جاتے۔ دس بارہ آدمی اُن کی داشت پر مامور تھے۔ میاں داراب علی خاں کو بڑا شوق تھا۔ نواب گھسیٹا نے بھی اس شوق کو آخر تک نباہا۔ ملیح آباد کے معزز پٹھانوں کو بھی بہت شوق تھا اور اُن کے پاس اصیل مرغوں کی بہت اچھی نسلیں محفوظ تھیں۔ یہاں مشہور مرغ باز جو اپنے فن میں اُستاد یگانہ مانے جاتے، بہت سے تھے۔ میر امداد علی شیخ گھسیٹا۔ منور علی جن کو یہ کمال حاصل تھا کہ مرغ کی آواز سن کے بتا دیتے کہ یہ بازی لے جائے گا۔ صفدر علی اور ایک اوّل درجے کے وثیقے دار سید میرن صاحب بھی مشہور تھے۔ اس آخری زمانے میں مندرجہ ذیل لوگوں کا نام مشہور ہوا۔ فضل علی جمعدار۔ قادر۔ جیون خاں حسین علی۔ نوروز علی۔ نواب محمد تقی خاں جو یہاں کے ایک عالی مرتبہ رئیس تھے۔ میاں جان۔ دل۔ چھنگا۔ حسین علی بیگ۔ احمد حسین۔ ان میں سے اب کوئی زندہ موجود نہیں ہے۔

یہی لوگ ہیں جنھوں نے مرغ بازی کو یہاں انتہائی کمال کے درجے پر پہنچا کے دکھایا۔ مگر میرا خیال ہے کہ فی الحال مرغ بازی کا شوق حیدر آباد دکن میں بڑھا ہوا ہے۔ وہاں کے بہت سے امیروں جاگیر داروں اور منصب داروں کو شوق ہے اور اُن کے پاس مرغوں کی نسلیں بھی بے مثل ہیں۔ جن کی وہ بہت حفاظت کرتے ہیں۔

(۲) بٹیر بازی

بٹیر بازی کا شوق لکھنؤ میں پنجاب سے آیا۔ پنجاب کے بعض کنچن لوگ جن کی عورتیں عصمت فروشی کا پیشہ کرتی ہیں نواب سعادت علی خاں کے عہد میں وارد لکھنؤ ہوئے۔ اور گھاگس بٹیر اپنے ساتھ لائے۔ جن کو وہ لڑاتے تھے۔ آج کل کی بعض نامور رنڈیاں انھیں لوگوں کی نسل سے ہیں۔ بٹیروں کی دو قسمیں ہوتی ہیں۔ ایک گھاگس اور دوسری چینگ۔ پنجاب میں صرف گھاگس بٹیر ہوتا ہے۔ وہ چینگ سے بڑا زبردست اور طاقتور ہوتا ہے۔ لکھنؤ میں گھاگس اور چینگ دونوں ہوتے ہیں۔ چینگ گھاگس سے قد میں چھوٹا اور نازک ہوتا ہے مگر لڑنے میں زیادہ مضبوط اور بہت جیالا ہوا کرتا ہے۔ اور اُس کی لڑائی زیادہ شاندار اور خوبصورت ہوتی ہے۔ بہرحال اس بات کا پتہ لکھنؤ ہی میں لگا کہ لڑانے کے لئے چینگ بٹیر زیادہ موزوں ہے۔

بٹیر کی لڑائی کے لئے نہ کسی بڑے میدان کی ضرورت تھی نہ گھر سے باہر نکل کے صحن تک بھی آنے کی بلکہ کمرے کے اندر ہی صاف ستھرے فرش پر تہذیب کے ساتھ بیٹھ کے اُس کی لڑائی کی سیر دیکھی جا سکتی ہے۔ اس لئے لکھنؤ کی سوسائٹی نے اِسی کو بہت پسند کیا۔ نہایت نفیس خوبصورت اور سبک کابکیں بٹیروں کے لئے ایجاد کی گئیں جو ہاتھی دانت کی ننھی ننھی گمزیوں سے آراستہ کی جاتیں اور اُن میں بٹیر رکھے جاتے۔

اس کا کھیل یوں ہے کہ پہلے موٹھ یعنی پانی میں بھگو بھگو کے گھنٹوں

ہاتھوں میں دبائے رہنے سے اُس کی وحشت دور ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ بولنے اور چونچیں مارنے لگتا ہے۔ اس کے بعد بھوک دے کے اور دست آور اجزا، جن میں مصری بہت مخصوص ہے دے دے کے اُس کا جسم درست کیا جاتا ہے۔ پھر رات گئے یا آدھی رات کو اُن کے کان میں چلاّ کے "کو" کہا جاتا ہے۔ جسے کوکنا کہتے ہیں۔ غرض اِن تدبیروں سے چربی چھنٹ جاتی ہے۔ بھدّاپن دور ہو جاتا ہے۔ اور جسم نہایت ہی پھُرتیلا اور قوی ہو جاتا ہے۔ یہی بٹیر کی تیاری ہے۔ اور اِن باتوں میں جس قدر زیادہ پورا ہے اُسی قدر سمجھئے کہ لڑائی کے لئے زیادہ موزوں ہے۔

لڑائی کے وقت فرش پر چاروں طرف ہلکا ہلکا دانہ چھٹکا دیا جاتا ہے اور بٹیر کابک سے نکالے جاتے ہیں۔ پہلے دونوں بٹیروں کی چونچیں چاقو سے بنا کے خوب تیز کر دی جاتی ہیں۔ اس کے بعد ایک دوسرے کے مقابل چھوڑ دئے جاتے ہیں۔ بٹیر کی لڑائی مُرغ سے ملتی ہوئی ہے۔ چونچ سے کاٹتا اور پنجوں سے لات مارتا ہے۔ چونچ سے حریف کے مُنہ کو زخمی اور اُلّو کر دیتا ہے۔ اور پنجوں سے بعض وقت حریف کا پوٹا تک پھاڑ دیتا ہے۔ لڑائی پندرہ بیس منٹ یا کبھی اس سے زیادہ دیر تک رہتی ہے۔ اور آخر مغلوب حریف بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔ اور بھاگنے کے بعد پھر وہ کسی بٹیر کے سامنے لڑائی میں نہیں ٹھہرتا۔

بٹیر کی ترقّی کے تین درجے ہیں اور اُس کی ناموری کے تین دَور سمجھے جاتے ہیں۔ اوّل نیا جو پکڑ کے اور پہلے پہل مانوس کر کے لڑایا جاتا ہے۔ اگر وہ بہت سی لڑائیوں میں جیتا اور نہ بھاگا تو لڑائی کی

فصل ختم ہوتے ہی معمولی پنجروں میں چھوڑ دیا جاتا ہے۔ یہ وہ زمانہ ہوتا ہے جب وہ پُرانے پر جھاڑ کے نئے نکال لاتا ہے۔ اِسے کریز بٹھانا کہتے ہیں۔ یہ زمانہ ختم ہوتے ہی دوسرے سال اُس کی ترقی کا دوسرا درجہ اور دَور ہوتا ہے۔ اور اُسے نوکار کہتے ہیں۔ پھر اس کے بعد دوبارہ کُریز بیٹھ کے جب تیسرے سال وہ لڑائی کے لئے تیار کیا جاتا ہے تو کُریز کہلاتا ہے۔ اور یہ اُس کی ترقی کا تیسرا اور اعلیٰ درجہ ہے۔

عموماً تسلیم کر لیا گیا ہے کہ لڑائی میں نوکار نئے سے اور کُریز نوکار سے زبردست ہوتا ہے۔ نیا بٹیر کُریز سے دو چونچیں بھی مشکل سے لڑ سکتا ہے۔ اعلیٰ درجے کے بٹیر باز اور شوقین رئیس صرف کُریزوں کو لڑاتے ہیں اور نئے بٹیروں کا لڑانا بالکل معمولی کھیل ہے۔ لڑائی میں طرح طرح کے فریب دفن بھی کئے جاتے ہیں۔ بعض لوگ اپنے بٹیر کے مُنہ پر کبھی کوئی ایسی کڑوی اور زہریلی چیز یا عطر لگا دیتے ہیں کہ دوسرا بٹیر دو ایک چونچیں مارتے ہی پیچھے ہٹنے اور لڑائی سے مُنہ موڑنے لگتا ہے اور اگر اِس پر بھی لڑتا رہا تو لڑائی کے بعد مر جاتا ہے۔ بعض لوگ کیف کا کھیل کھیلتے ہیں۔ یعنی لڑائی سے ایک ساعت پہلے اپنے بٹیر کو کوئی ایسی تیز نشے والی چیز کھلا دیتے ہیں کہ وہ لڑائی میں بےحس ہو کے بھاگنا بھول جاتا ہے۔ اور جب تک حریف کو پالی سے نہ بھگا دے مجنونوں کی طرح لڑتا رہتا ہے۔

لکھنؤ میں بٹیر بازی کے شوق نے ایسے ایسے باکمال بٹیر باز پیدا کر دئے جن کا کہیں نظیر نہیں مل سکتا۔ بعض لوگوں نے یہ کمال پیدا کیا تھا کہ کسی کے اچھے نامی بٹیر کو ایک نظر دیکھا اور کسی معمولی بٹیر

کی ویسی ہی صورت بنا دی۔ اور کسی موقع پر باتوں باتوں میں بدل لیا۔ خیر یہ تو ایک بیہودہ چوری تھی مگر بعض اُستادوں نے یہ کمال حاصل کیا تھا کہ بٹیروں کو تیار کر کے اچھے اچھے گُریزوں سے لڑا دیتے اور بازی لے جاتے۔

کیف کے کھیل والے اُستادوں میں ایک صاحب کیف کی نہایت اعلیٰ درجہ کی گولیاں تیار کرتے جو سو روپئے کی دس گولیاں بکتیں۔ اور لوگ شوق سے لے جاتے۔

اِن لوگوں کی سب سے بڑی اُستادی بٹیروں کے علاج میں نظر آتی ہے۔ اور ایسے ایسے بیمار اور ازکار رفتہ بٹیروں کو درست کر لیتے ہیں اور اس خوبی سے اُن کے مرض کو تشخیص کرتے اور مناسب اجزاء استعمال کراتے ہیں کہ اطبّا اور ڈاکٹر حیرت میں رہ جائیں۔ اس کی بہت کوشش کی گئی کہ بٹیروں کو پال کے انڈے سے بچے دلوائے جائیں مگر اس میں کامیابی نہ ہوئی۔

بٹیروں کے نام بھی بڑے بڑے شاندار رکھے گئے۔ جیسے رستم سُہراب۔ شہرۂ آفاق۔ پالیوں میں بڑی سے بڑی بازیاں بدی جاتی ہیں۔ اور ایک ہزار روپیہ تک کی بازی میں نے خود دیکھی ہے۔ اس کا شوق بھی بعض بادشاہوں کو رہا۔ نصیر الدین حیدر اپنے سامنے میز پر بٹیروں کی لڑائی دیکھ کے خوش ہوتے تھے۔

پُرانے بٹیر بازوں میں میر بچو۔ میر محمد۔ خواجہ حسن۔ میر فدا علی۔ چھنگا۔ میر عابد اور سید میرن کے نام یادگار ہیں۔ آج سے چالیس سال پہلے ٹٹیا برج میں میں نے داروغہ غلام عباس۔ چھوٹے خاں۔ اور غلام محمد خاں خالص پوری کو جو بڑے معمر اور سن رسیدہ لوگ تھے اِس فن میں

نہایت باکمال پایا تھا۔ غالب علی بیگ۔ مرزا اسد علی بیگ۔ نواب مرزا۔ میاں جان۔ شیخ مومن علی اور غازی الدین خاں نے بھی آخر عہد میں بہت ناموری حاصل کی تھی۔

بٹیروں کا شکار بھی لکھنؤ والوں کے لئے بڑی دلچسپی کی چیز ہے۔ پہلے اس میں صرف شوقینی تھی جس کی بدولت بہت سے مہین آدمی جنھوں نے کبھی شہر سے باہر کی سواد نہیں دیکھی تھی کھیتوں اور جنگلوں کی ہوا کھاتے تھے مگر اب اسی پر بہتوں کی روٹیاں چلتی ہیں۔

کہتے ہیں کہ بٹیر پہاڑوں سے رات کو نکلتے اور اوپر کی فضا میں اُڑتے ہوئے جاتے ہیں۔ شکار کے شوقین بڑی آواز سے بولنے والے بٹیروں کو تیار کرتے ہیں جو برابر رات بھر بولتے رہتے ہیں۔ ایسے بٹیروں کو پھندیت کہتے ہیں۔ کسی ارہر کے کھیت کے اطراف میں اکثر جال پھیلا دیا جاتا ہے۔ پھندیتوں کی آواز سن کے بٹیر اوپر سے اُترنا اور گرنا شروع ہوتے ہیں۔ اور رات بھر میں بہت سے جمع ہو جاتے ہیں۔ صبح ہوتے ہی وہ سب طرف سے ہنکا کے جال کی طرف بھگائے جاتے ہیں۔ جس میں پھنستے ہی پکڑ پکڑ کے پھٹکیوں میں بند کر لئے جاتے ہیں۔

(۳) تیتروں کی لڑائی

یہ بھی دلچسپ ہے۔ تیتر اور طیور کی بہ نسبت اُچک اُچک کے لڑتا ہے۔ مگر اس کا شوق سواد دیہاتی لوگوں اور ادنےٰ درجے والوں کے اُمرا و شرفا کو کبھی نہیں رہا۔ تیتر لوٹ سے اور دوڑا دوڑا کے تیار کئے جاتے ہیں۔ ان میں جوش اور غصہ پیدا کرنے کے لئے ان کو دیمک کھلائی

جاتی ہے۔ مگر یہ کوئی بڑا کھیل نہیں ہے۔ اور نہ مہذّب سوسائٹی میں اختیار کیا گیا۔ ہاں لکھنؤ کے ادنیٰ طبقے والوں میں کثرت سے رہا اور ہے۔

(۴) لوؤں کی لڑائی

لوا چھوٹے قسم کا تیتر ہے جو بٹیر سے بھی چھوٹا ہوتا ہے۔ وہ بجائے دانے کے سد یا یعنی مادہ پر لڑا کرتا ہے۔ اُسے لڑانا ہوتا ہے تو مادہ کا پنجرا لا کے سامنے رکھ دیا جاتا ہے۔ اس کا شوق ریاست ریواں وغیرہ میں لوگوں کو زیادہ تھا۔ لکھنؤ میں بھی پسند کیا گیا اور ایک حد تک اختیار کیا گیا۔ لوے کی لڑائی سچ یہ ہے کہ بٹیر سے زیادہ خوبصورت ہوتی ہے۔ وہ کُندے کھول کر لڑتا اور گتھ جاتا ہے۔ اور پھول کی طرح کھِل کھِل کے اُٹھتا اور گرتا ہے۔ لکھنؤ کے بعض اُمرا کو اس کا شوق ہو گیا تھا۔ مٹیا بُرج میں واجد علی شاہ مرحوم کی سرکار میں ایک بڑے اُستاد لوے لڑانے والے تھے۔ جنھوں نے بہت اچھی اچھی جوڑیں تیار کی تھیں۔ اور جب اُنھیں سامنے لا کے لڑاتے تو بڑا لطف آتا۔ لوؤں کی تیاری بھی زیادہ تر لوٹ اور بھوک سے ہوتی ہے اور اس کی لڑائی کا رواج بٹیر کے پیشتر سے تھا۔ مگر آخر میں بٹیر بازی کا اس قدر رواج ہوا کہ لوے کا شوق پھیکا پڑ گیا۔ اس کا شکار بھی عجب طریقے سے ہوتا ہے۔ یہ بھی بٹیر کی طرح اوپر کی فضا میں اُڑتا ہوا جاتا ہے۔ لوگ بٹیر کے پھندیتوں کی سی چھڑ پر ایک گھڑا باندھ دیتے ہیں۔ اس کے مونھ پر جھلّی منڈھ کے ایک سینک میں ڈورا باندھ کے اُس سینک کو جھلّی میں چھید کے اندر اٹکا دیتے ہیں اور اُس ڈورے کو ہاتھ سے سُوتنا

شروع کرتے ہیں۔ جھلی سے ایک بے ہنگم بھوں بھوں کی آواز نکلنا شروع ہوتی ہے۔ جو لوؤں کو اس قدر پسند ہے کہ اُڑتے اُڑتے نیچے اتر پڑتے ہیں اور صبح کو جال میں پھنس کے بٹیروں ہی کی طرح پکڑ لئے جاتے ہیں۔

(۵) گُلدم لڑنا

گُلدم کو عوام بُلبُل کہتے ہیں، مگر یہ غلطی ہے۔ بُلبُل بدخشاں و عجم کی ایک نغمہ سنج چڑیا ہے۔ اور اس چڑیا کی دُم کے نیچے ایک سُرخ گُل ہوتا ہے جس کی وجہ سے اِس کا نام گُلدم رکھا گیا ہے۔ اُس کی لڑائی بھی دیہاتیوں اور بازاری لوگوں میں زیادہ ہے۔ شائستہ سوسائٹی نے اُسے کبھی دلچسپی کی نظر سے نہیں دیکھا۔ مگر اُس کی لڑائی لُطف سے خالی نہیں ہوتی۔ دانے پر لڑتے ہیں۔ اور لڑائی میں دونوں حریف لڑتے ہوئے اوپر اُڑتے اور گُتھ کے گرتے ہیں۔

(۶) لال لڑانا

لال صرف پنجروں میں رکھ کے پالنے کے لئے ہیں۔ لڑائی کے لئے موزوں نہیں۔ مگر نفس پرست انسان نے اُنھیں بھی لڑا کے دو گھڑی دل بہلا لیا۔ لالوں کا پہلے تو اس حد تک مانوس بنانا مشکل ہوتا ہے کہ پنجرے کے باہر نکال کے چھوڑے جائیں اور اُڑ نہ جائیں۔ دوسرے اُنھیں اس قدر مست بھی ہونا چاہئے کہ دوسرے لال سے لڑنے کو تیار ہو جائیں۔ چنانچہ اُن کا لڑ جانا ہی دشوار ہوتا ہے۔ مگر جب لڑ گئے

تو خوب گُتھم گُتھا کرکے اور اُڑ اُڑ کے لڑتے ہیں اور بڑی دیر تک لڑتے رہتے ہیں۔ لالوں کی لڑائی دوسرے چھوٹے طیور کی لڑائی کی بہ نسبت دیر تک رہتی ہے۔ لالوں کی لڑائی کا شوق اہلِ لکھنؤ میں بہت کم رہا۔ صرف دو ہی ایک اُستاد پیدا ہوئے۔ جنھوں نے لڑایا۔ ورنہ عام رُجحان اِس کے خلاف تھا۔ اور اس کے شوقین بھی عوام اور بازاری ہی تھے۔

(۷) کبوتر بازی

کبوتر اُن مانوس جانوروں میں ہیں جن کا شوق لوگوں کو قدیم زمانے سے لے کے آج تک ہر مُلک اور ہر سرزمین میں کسی نہ کسی حد تک ضرور رہا۔ کبوتروں کی بہت سی قسمیں ہیں۔ جن میں اُڑنے والے گرہ باز اور گولے ہوتے ہیں اور جو محض خوبصورتی اور خوش رنگی کے لحاظ سے پالے جاتے ہیں۔ اُن میں شیرازی۔ گُلی۔ نسا آوری۔ گلوٹے۔ لقّے۔ لوٹن اور چو یا چندن وغیرہ زیادہ مشہور ہیں۔ یاہو کبوتر رات دن گو بجنے اور "یا ہو" کا دم بھرنے کی وجہ سے عبادت گذاروں کو زیادہ پسند تھے۔ اور اکثر فقرا و مشائخ کو اُن کا شوق تھا۔

سُنتے ہیں کہ گرہ باز پہلے پہل کابُل سے لائے گئے۔ پہلے عموماً وہی اُڑائے جاتے تھے۔ گولے بعد کو آئے جن کی نسل عرب و عجم اور ترکستان سے آئی۔ گرہ باز کی یہ شان ہے کہ صبح کو اُڑے تو گھنٹوں مکان کے عین محاذی آسمان پر چکّر لگاتے رہے۔ اس طرح کے صحن کے اندر لگن میں پانی بھر کے رکھ دیجئے تو اُس میں ہمیشہ نظر آتے رہیں گے۔ بعض دن دن بھر اُڑتے رہتے ہیں۔ اور شام کو اُترتے ہیں۔ اپنے مکان کے

پہچاننے اور وطن پرستی کے دلدادہ ہونے میں گرہ باز اتنا کمال رکھتے ہیں کہ خود میرے یہاں کا ایک کبوتر کسی کے وہاں پھنس گیا تھا جس نے پر کاٹ دئے۔ تین سال کے بعد جب اُسے موقع مِلا اور پر نکل آئے تو واپس آیا۔ اور اپنے خانے میں گھس کے اُس کبوتر سے لڑنے لگا جو اب اُس میں مقیم تھا۔

لیکن گرہ باز کی دس بارہ سے زیادہ کی ٹکڑی نہیں اُڑتی۔ لوگوں کو سَو سَو دو دو سَو کبوتروں کی ٹکڑیاں اُڑانے کا شوق ہوا تو گولے اختیار کیئے گئے۔ کبوتر بازی کا فن دہلی ہی میں اس قدر ترقی کر گیا تھا کہ کہتے ہیں آخری وارث دولت مغلیہ بہادر شاہ کی سواری نکلتی تو دو سَو کبوتروں کی ٹکڑی اوپر ہوا میں سواری کے ساتھ اُڑتی ہوئی جاتی اور جہاں پناہ پر سایہ کئے رہتی۔

کبوتر کو اپنے گھر سے بہت زیادہ اُنس ہوتا ہے۔ کابک کو ٹھیل پر رکھ کے لے جاتے، اور جہاں کہا جائے روک کے اُڑاتے، اور پھر کابک پر بُلا لینے کا کمال بھی دہلی ہی میں پہلے نظر آ چکا تھا۔

لکھنؤ میں کبوتر بازی اس خاندان فرماں روائی کے ابتدائی دور ہی سے شروع ہو گئی تھی۔ چنانچہ نواب شجاع الدولہ کو کبوتروں کا بڑا شوق تھا۔ سیّد یار علی نام ایک شخص نے جو بریلی کا رہنے والا تھا، اپنے آپ کو ایک کامل کبوتر باز کی حیثیت سے دربار میں پیش کیا اور اُن کی بڑی قدر کی گئی۔ نواب آصف الدولہ اور نواب سعادت علی خاں کو بھی شوق تھا۔ اور غازی الدین حیدر اور نصیر الدین حیدر کے زمانے میں تو کبوتر بازی یہاں بہت اعلیٰ درجے پر پہنچ گئی تھی۔ میر عباس نام

یہاں کے ایک کامل فن کبوتر باز نے یہ کمال دکھایا کہ جو کوئی پانچ روپئے نذر کر کے اُن کی دعوت کرنا چاہے وہ کہیں رہتا ہو کا بک لے کے بھیج جاتے اور اُسی کے گھر سے کبوتر اُڑا دیتے۔ اُڑاتے اور سیٹی پہ بُلا لیتے۔ مجال کیا کہ کوئی کبوتر کسی اور جگہ گر جائے۔ شوق اس قدر بڑھا ہوا تھا کہ بعض امیروں کے ہاں صرف نو سو کبوتریاں ایک ساتھ اُڑتیں اور بعض رئیس اتنے ہی یا اس سے زیادہ تعداد میں نر کبوتر اُڑاتے۔

خوست (علاقہ سرحدی افغانستان) سے پٹیت نام ایک خاص رنگ کے کبوتر آئے تھے۔ جو نہایت قیمتی تھے۔ اکثر رئیس ہزاروں روپیہ صرف کر کے اُنھیں کو اُڑاتے۔

ایک جدت پسند بزرگ نے لکھنؤ میں یہ کمال کیا کہ کبوتر کے دو پٹھوں کو لے کے ایک کا داہنا ایک کا بایاں بازو کاٹ دیا۔ اور کٹے ہوئے بازوؤں کی جگہ اُن دونوں میں ٹانکے لگا کے ایک دوہریا کبوتر بنا لیا۔ اور ایسی داشت سے پالا کہ وہ بڑے ہوئے اور اُڑنے لگے۔ ایسے بہت سے دوہریا کبوتر تیار کیے۔ اکثر معمول تھا کہ جب نصیر الدین حیدر چھتر منزل سے بجرے پر سوار ہو کے پار جاتے اور کوٹھی دلآرام میں بیٹھ کے دربار کی سیر دیکھتے اور اس پار سے اپنے اُن عجیب الخلقت دوہریا کبوتروں کو اُڑا دیتے جو پار جا کے بادشاہ کے قریب بیٹھ جاتے۔ بادشاہ اُنھیں دیکھ کے بہت محظوظ ہوتے اور انعام دیتے۔

میر امان علی نام ایک بزرگ نے یہ کمال پیدا کیا تھا کہ کبوتر کو رنگ کے جیسا چاہتے بنا دیتے۔ اکثر جگہ پر اُکھاڑ کے دوسرے رنگ کا

پر اُسی کے سوراخ میں رکھ کے اس طرح جما دیتے کہ وہ اصلی پروں کی طرح جم جاتا۔ اور بہت سے مقامات پر رنگ سے کام لیتے۔ مگر ایسا مضبوط اور پختہ رنگ کہ مجال کیا جو ذرا پھیکا بھی پڑ جائے۔ برس بھر تک رنگ قائم رہتا۔ مگر جب گریز میں پَر گر جاتے تو پھر اصلی رنگ نکل آتا۔ اُن کے ان کبوتروں میں سے ہر ایک پندرہ بیس روپئے کو بکتا۔ اور اُمرا بڑے شوق سے لیتے۔ وہ بھانتیہ بھی بنا لیا کرتے جو لاکھوں میں ایک نکلتا ہے۔ اور رنگ کے حدود اور گلوں کے اعتبار سے بے مثل ہوتا ہے۔

ایک بڑے کبوتر باز نواب پائے تھے جو گرہ باز کبوتروں کو گولوں کی طرح اُڑاتے۔ کمال یہ تھا کہ جس جگہ اور جس مکان پر چاہتے چھیپی کے اشارے سے بازی کرا دیتے، یعنی کبوتر ہوا میں قلا بازیاں کھانے لگتے۔

واجد علی شاہ نے مٹیا برج میں بہت سے نئے کبوتر جمع کئے تھے۔ کہتے ہیں کہ ریشم پرے کبوتروں کا جوڑا پچیس ہزار کو لیا تھا۔ اور ایک قسم کے سبز کبوتروں کی نسل بڑھائی تھی۔ جب انتقال ہوا ہے تو چوبیس ہزار سے زیادہ کبوتر تھے۔ جن پر سیکڑوں کبوتر باز نوکر تھے۔ اور اُن کے داروغہ غلام عباس کبوتر بازی کے فن میں جواب نہ رکھتے تھے۔

شوقینی اور فن دانی نے پالنے کے رنگین کبوتروں میں بھی بے مثل ترقی کی تھی۔ یہ صرف مشہور نہیں ہے بلکہ ایسا شیرازی جو گز بھر کے پنجرے کی وسعت کو بھرے اور ایسا گُنی جو ایک بارہ برس کی لڑکی کی چوڑی میں سے نکل جائے میں نے خود اپنی آنکھ سے دیکھے ہیں۔

(شرر)

داغ

[داغ آخری دور کے بہت مشہور غزل گو شاعر تھے۔ رام پور اور حیدر آباد کے درباروں میں اِن کی شاعری نے اِنھیں سب سے ممتاز حیثیت دلوائی اور ہر جگہ لوگ اِن کی شاعرانہ قادر الکلامی کے معترف ہوئے۔ داغ کے مرنے کے بعد سے قدیم رنگ تغزّل کا چراغ گُل ہوگیا۔ جب اِن کا انتقال ۱۹۰۵ع میں ہوگیا تو چکبست مرحوم نے زمانہ کے لئے اِن کی حیات اور شاعری پر ایک بسیط اور عالمانہ مضمون لکھا۔ یہ اقتباس اُسی مضمون کا ایک حصّہ ہے]

آج راہی جہاں سے داغؔ ہوا   خانۂ عشق بے چراغ ہوا

کیا افسوس کا مقام ہے کہ اُردو شاعری کے آخری دَور کا آخری شاعر، قدر دانانِ سخن کو ہمیشہ کے لئے داغِ مفارقت دے گیا۔ مُدّت ہوئی کہ نظمِ اُردو کے شباب کی تاروں بھری رات خاتمے پر آچکی تھی۔ یہ پچھلے پہر کا ایک تارا باقی رہ گیا تھا، جس کی روشنی دم بدم گھٹتی جاتی تھی۔ آخرکار یہ تارا بھی ہماری نظروں سے پنہاں ہوگیا۔ اور اِسی کے ساتھ قدیم مذاقِ سخن کا چراغِ سحری بھی گُل ہوگیا۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ دکن ہی کی خاک پر چمنستانِ نظمِ اُردو کی داغ بیل ڈالی گئی تھی[1] اور اس

[1] اُردو شاعری کی ابتدا اصل میں دکن ہی میں ہوئی اور اُردو کا پہلا صاحبِ دیوان شاعر قُلی قطب شاہ جس کا دیوان ۱۵۸۰ع میں مرتّب ہوا۔ اس میں غزل۔ قصیدہ۔ مثنوی۔ مرثیہ۔ قطعہ رباعی مرصّع جن کے اچھے اچھے نمونے موجود ہیں۔

چمن کا آخری پھول دکن میں خاک کا پیوند ہوا[1]- یہ آخری پھول دہلی مرحوم کا رنگین مزاج اور شوخ طبع شاعر داغؔ تھا جس کی روح آج فردوس میں کسی حور کے گیسو میں بو کی طرح سمائی ہوگی- ع

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

اگر دنیا کے مصنوعی اعزاز و اقربا کی نگاہ سے دیکھو تو جہاں اُستاد مقرب سُلطان، ناظم یار جنگ، دبیر الدولہ، فصیح الملک، بُلبل ہندوستان نواب مرزا خاں داغؔ دہلوی کا ایسا خوش نصیب شاعر ہندوستان میں کم پیدا ہوگا- ذوقؔ مرحوم شاہنشاہ دہلی کے اُستاد تھے- مگر تیس روپیہ ماہوار کا وظیفہ اُن کے لئے معراج ترقی ہو کر رہ گیا- غالب کی رگ رگ میں آبائی ریاست کا ناز خون کے ساتھ شامل تھا- مگر اس عالی حوصلہ اور زندہ دل شاعر کی جس شکستہ حالی میں بسر ہوئی سب پر ظاہر ہے- آتشؔ کے کمال پر غور کرو اور پھر یہ دیکھو کہ خاک کے بچھونے کے سوا بوریا بھی میسر نہ ہوا- اور اکثر اس شہنشاہِ سخن کو تین تین دن فاقے سے گزر گئے- ناسخؔ کی ضرور کسی قدر فارغ البالی میں گذری- لیکن وہ شان و شوکت ان کو بھی نصیب نہ ہوئی جو قسامِ ازل نے داغؔ دہلوی کے لئے مخصوص کر رکھی تھی- اس مال و دولت کے علاوہ اگر شہرت پر نظر ڈالو تو جو نام آج داغؔ کا ہے اُس پر ہر فرد بشر کو ناز ہو سکتا ہے- ہندوستان میں آج کون شہر ایسا ہے جہاں کے کوچہ و بازار میں داغ کی غزلیں ارباب نشاط کے دلوں کو نہ گرماتی ہوں- اور رنگین طبع سامعین کو وجد میں نہ لاتی ہوں-

---

[1] داغ کا انتقال دکن میں ہوا- اُس زمانہ میں نظام کے درباری شاعر اور اُستاد تھے-

اس جاہ و ثروت، اور اس عالمگیر شہرت کے اسباب کچھ ہی کیوں نہ ہوں، لیکن امرِ واقعی سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ داغ کو یہ قابلِ رشک نعمتیں حاصل تھیں۔

تخلّص بھی اس خوش نصیب شاعر نے ایسا نفیس پایا کہ سوائے دو چار شعرا کے اور کسی کے حصّے میں کم آیا ہوگا۔ اتنا ضرور ہے کہ یہ تخلّص نیا نہیں ہے۔ میر سوز کے بیٹے کا تخلّص بھی داغ تھا، مگر وہ بیچارے اُبھرے نہیں، اور آج اُن کا نام بھی کوئی نہیں جانتا اور نہ اُن کا کوئی شعر کسی کو یاد ہے۔

اِس مصنوعی شان و شوکت کے علاوہ اگر داغ کے شاعرانہ کمال پر نظر ڈالی جائے تو اور ہی عالم نظر آتا ہے۔ داغ کی شاعری عجب معرکہ آرا شاعری ہے۔ ایک فرقہ اس نامی شاعر کے معتقدین کا ہے جو اس پیمبرِ سخن کی شاعری کو معراج دینا اپنا ایمان سمجھتا ہے۔ اور اِن حضرات کو یہ کہنے میں تکلّف نہیں ہوتا کہ آتش و ناسخ و ذوق و غالب وغیرہ بھی جو چراغ شاہراہِ سخن پر روشن کر گئے ہیں وہ داغ کے کمالِ شاعری کی روشنی میں ماند نظر آتے ہیں۔ یا داغ کا کمال میر و مرزا کے کمال کا مجموعہ ہے۔ دوسرا گروہ اُن باوضع حضرات کا ہے جو داغ کے کمالِ سخن میں دھبّہ لگانا اپنا مذہب سمجھے ہوئے ہیں، اور جن کا مقولہ ہے کہ امیرؔ[1] مینائی کے اکثر شاگرد داغ سے اچھّا کہتے

---

[1] امیر مینائی شاعری میں داغ کے حریف کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ جس طرح ہر دور میں دو مشہور شاعر ایک دوسرے کے مدِّ مقابل سمجھے جاتے ہیں اُسی طرح اُس دور میں داغ اور امیر کو ایک دوسرے کا مدِّ مقابل سمجھا جاتا تھا اور دونوں کے پرستار ہر حیثیت سے ایک کو دوسرے پر فوقیت دینا اپنا ایمان جانتے تھے۔ امیر شاعری میں داغ کے مدِّ مقابل نہیں لیکن علم و فضل میں سے کہیں زیادہ ہیں۔

ہیں۔ یا یہ کہ داغ کی زبان دہلی کی مستند زبان ہے۔ غرضکہ داغ کے شاعرانہ وقار کی کشتی اس وقت تحسین ناشناس اور نفرین بیجا کے دوآبہ میں پھنسی ہوئی ہے، اور ایک عجیب طوفان اُس کے گرد برپا ہے۔ مگر زمانہ کا ناخدا اس سے زیادہ زور و شور کے طوفان جھیلے ہوئے ہے۔ وہ اِس کشتی کو بھی ایک دن اپنے اصلی مرکز پر پہنچا دے گا۔ ہاں بالفعل اس نامور شاعر کے کمال کے بے تعصبی کے ساتھ اندازہ کرنا کسی قدر دشوار ہو گیا ہے، کیونکہ اس راہ میں قدم رکھتے ہی اکثر ایسی صورتیں درپیش آتی ہیں جو گمراہ کرنے کے لئے غولِ صحرائی سے کم نہیں۔ لیکن انصاف پسندی اور بے تعصبی کا وہ اسم اعظم ہے جو مسافرِ تحقیق کو ضرور منزلِ مقصود تک پہنچا سکتا ہے۔ اس حالت میں اگر دہلی اور لکھنؤ کی معرکہ آرائیوں کے پرانے زخموں پر مرہم رکھ کر داغ کی شاعری پر ایک منصفانہ نظر ڈالی جائے تو یہ ثابت ہو جائے گا کہ یہ شوخ طبع شاعر نہ اس معراج کا مستحق ہے جو تحسین ناشناس کی بدولت اُسے اکثر نگاہوں میں حاصل ہے، نہ یہ غریب اس قعرِ بے کمالی میں پڑا ہے جس میں اس کے بے درد اور کم نظر مخالف اس کو ڈھکیلنا چاہتے ہیں۔

داغ کے کلام کی تاثیر اس امر کی شاہد ہے کہ اُس کے قدرتی طور پر شاعر ہونے میں کلام نہیں۔ اُس کے کلام کا اثر حرارتِ برق کی طرح سننے والے کے دل میں دوڑ جاتا ہے، اور ایک کیفیت پیدا کر دیتا ہے، جس کا نام تاثیرِ سخن ہے۔ مگر تاثیر تاثیر میں فرق ہے اور شاعر شاعر کے کمال میں امتیاز ہو سکتا ہے۔ پہلا

مقصد یہ دیکھنا ہے کہ داغ کا پایہ اُردو شعراء کے دربار میں کیا ہے۔ اور اُس کا کلام کس قسم کی تاثیر دل میں پیدا کرتا ہے۔ اس امر کا فیصلہ کرنے کے لئے اس بات کی ضرورت ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ وہ معیار کیا ہے جس سے شاعرانہ وقار کے مختلف مدارج کا اندازہ ممکن ہوسکتا ہے۔ یہ معیار اُسی وقت قائم ہوسکتا ہے جبکہ شاعری کے اصلی مفہوم سے واقفیت ہو۔ اب دیکھنا چاہئے کہ شاعری کا اصلی مفہوم کیا ہے۔

شاعری وہ جادو یا اعجاز ہے، جس کا کرشمہ یہ ہے کہ انسان کے خیالات اور احساسات اُس کے جذباتِ دلی کے سانچے میں ڈھل کر زبان سے نکلتے ہیں۔ اور ایک عالم تصویر پیدا کر دیتے ہیں۔ اور چونکہ شاعر کی کانوں کی فضا میں سلاست زبان کا نغمہ قدرتی طور پر سمایا ہوا ہوتا ہے، لہٰذا وہ اپنے الفاظ کو اس خوبی سے ترتیب دیتا ہے کہ اُن میں علاوہ عالمِ تصویر کے ایک تاثیر موسیقی بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ شاعر کا کلام ایک آئینہ ہوتا ہے جس میں اُس کے اُن خیالات اور احساسات کا عکس نظر آتا ہے جو اُس کے جذباتِ دلی کے رنگ میں ڈوبے ہوئے، اُس کی زبان سے نکلتے ہیں۔ غرض کہ جذبات شاعری کی روحِ رواں ہیں۔ اور چونکہ دل کو دل سے راہ ہے، لہٰذا جس قسم کے جذبات کے رنگ میں شاعر کا کلام ڈوبا ہوا ہوگا وہ اُسی قسم کے جذبات سامع کے دل میں بھی جوش میں لائے گا۔ مگر جذبات و خیالات وغیرہ کی دو قسمیں ہیں۔ اعلیٰ اور ادنیٰ۔ اعلیٰ جذبات و خیالات سے بحیثیت

مجموعی فطرتِ انسانی کا روحانی حصّہ مراد لیا جاتا ہے، اور ادنیٰ جذبات
و خیالات سے حیوانی حصّہ۔ جس شاعر کی فطرت میں اعلیٰ
جذبات و خیالات ترقی پر ہوتے ہیں وہ پاکیزہ نظری اور بلند خیالی
کی ہوا میں اُڑتا ہے۔ برعکس اِس کے جس شاعر کی فطرت
میں ادنیٰ جذبات و خیالات کا دریا موجزن ہوتا ہے، اُس کے
اعلیٰ جذبات و خیالات ریگ تہ نشین کی طرح پامال رہتے
ہیں، اور اُس کی شاعری سُننے والے کے دل میں یہی ادنیٰ
جذبات برانگیختہ کرتی ہے۔ اس معیار کو پیش نظر رکھ کر اگر
ہم داغؔ کے کمال کا اندازہ کریں تو یہ روشن ہو جاتا ہے کہ داغؔ
کی شاعری اُن جذبات و خیالات کی تصویر ہے جن سے فطرت
انسانی کا حیوانی حصّہ مُراد لیا جاتا ہے۔ اُردو شاعری عموماً عاشقانہ
شاعری کہلاتی ہے، اور ایسا کہنا ایک حد تک صحیح بھی ہے۔ کیونکہ
اُردو شعراء نے عموماً حُسن و عشق کی تصویریں اپنے جادو کار
قلم سے کھینچی ہیں۔ مگر جو اعلیٰ درجے کے اُردو شاعر ہیں
اُنھوں نے حُسن کو محض بازاری حُسن سمجھا ہے اور عشق کو
محض جذبۂ حیوانی نہیں خیال کیا ہے۔ برعکس اِس کے داغؔ
کا معشوق ہمیشہ بازاری معشوق ہے۔ داغؔ کی شاعری سے وہ
جذبات عالیہ جوش میں نہیں آتے جن کا تعلق حُسن و عشق
کے اعلیٰ مفہوم سے ہے۔

مگر با ایں ہمہ اس وقت اس تیرہ خاکدانِ ہند میں داغؔ
کے دم کی روشنی غنیمت تھی۔ اُردو شاعری کا نام اُسی کی ذات

سے زندہ تھا۔ گو وہ آتش و غالب و ذوق وغیرہ کا ہم پایہ نہ ہو، لیکن اُس کے قدرتی طور پر شاعر ہونے میں کوئی شک نہیں اور اُس نعمت خداداد کا حاصل ہونا بھی کچھ کم فخر کی بات نہیں ہے کہ اس کے کلام کی شوخی، مصنوعی شوخی نہیں ہے۔ جو شعر اُس کی زبان سے نکلتا ہے تاثیر میں ڈوبا ہوا نکلتا ہے اور اصل یہ ہے کہ اپنے رنگ خاص میں وہ معجزہ دکھا گیا ہے۔

(چکبست لکھنوی)

اودھ پنچ

[اودھ پنچ اُنیسویں صدی کا ایک بہت مشہور اور بلند پایہ ہفتہ وار اخبار تھا۔ اُردو کے بہترین مزاحیہ نگار اُسے میسّر آ گئے تھے اور اس لئے مدتوں تک اُردو میں ظرافت۔ طنز اور استہزا کے اچھے سے اچھے نمونے، پھولوں کی طرح برسائے اور موتیوں کی طرح لُٹائے۔ اُس کے پہلے دور کے بہترین مضامین کا ایک مجموعہ "گلدستۂ پنچ" کے نام سے شائع کر دیا گیا ہے۔ موجودہ مضمون چکبست مرحوم نے اُس کے دیباچہ کے طور پر لکھا تھا]

ہندوستان کے جس جس گوشہ میں اُردو زبان کا نغمہ سنائی دیتا ہے وہاں شاید کوئی ایسا شخص ہو کہ جس کے کان "اودھ پنچ" مرحوم کے ذکر خیر سے آشنا نہ ہوں "اودھ پنچ" نے تیس پینتیس سال تک اپنی عالمگیر شہرت و وقار کے پردے میں

اخباروں کی دُنیا میں سلطنت کی ہے اور اُس کے پُرانی جلدوں
کے گورِ غریباں میں اکثر ایسے اہلِ کمال دفن ہیں، جن کے
قلم کی دھاک دلوں میں لرزہ پیدا کرنے کے لئے کافی تھی۔

جس وقت "اودھ پنچ" نے دنیا میں جنم لیا اُس وقت
اخبار نویسی کا فن ہندوستان میں تخمیناً چالیس سال کے نشیب
و فراز دیکھ چکا تھا۔ ۱۸۳۶ء[1] میں پہلے پہل سرکار کی جانب سے
ہندوستان کی بے زبان رعایا کو اخبار نکالنے کی نعمت عطا ہوئی۔
اور ۱۸۷۷ء میں "اودھ پنچ" نے زبان اور ظرافت کے چہرے سے
نقاب اُٹھائی۔ اس چالیس سال کے عرصہ میں[2] اُردو کے
بہت سے اخبار جاری ہو چکے تھے۔ مثلاً لاہور میں "اخبارِ عام"
اور "کوہ نور" کا دَور تھا۔ یہ اپنے وقت کے نامور اخبار تھے۔
دہلی میں "اشرف الاخبار" کی آواز سنائی دیتی تھی۔
"وکٹوریہ پیپر" سیالکوٹ سے جاری تھا۔ "کشف الاخبار" بمبئی
میں اور "جریدۂ روزگار" مدراس میں اُردو کا نقّارہ بجا رہا تھا۔ "کارنامہ"
اور "اودھ اخبار"[3] لکھنؤ سے شائع ہوتے تھے۔ عرصہ ہوا کہ "کارنامہ"
کا کام تمام ہو گیا۔ "اودھ اخبار" ابھی تک اپنے بڑھاپے کی شرم
رکھے ہوئے ہے۔ ان کے علاوہ "اودھ پنچ" کی اشاعت کے قبل

ـــــــــــ

[1] ۱۸۳۶ء میں مولانا محمد حسین آزاد کے والد مولوی محمد باقر نے "اُردو اخبار" کے نام سے
ایک اخبار نکالا۔ یہ اُردو کا پہلا اخبار تھا۔ [2] ۱۸۳۶ء اور ۱۸۷۷ء کے درمیان۔
[3] جس کے اڈیٹر پنڈت رتن ناتھ سرشار تھے۔

ہ اودھ اخبار اب تک [illegible] جاری ہے [illegible]

بہت سے اُردو اخبار اپنی پیدایش اور موت کی منزلیں طے کر چکے تھے۔ مگر قابل غور بات یہ ہے کہ یہ اخبار محض خبروں کی تجارت کرتے تھے۔ بجز "لارنس گزٹ" کے جو کہ میرٹھ سے شائع ہوتا تھا اور جس کی نظر رعایا کے حقوق پر رہتی تھی، عام طور سے اِن اخباروں کا نہ کوئی خاص پولٹیکل یا سوشل مسلک تھا، نہ یہ کسی دستور العمل کے پابند تھے۔ اُردو اخبار نویسی کی تاریخ میں "اودھ پنچ" اور "ہندوستانی" پہلے دو اخبار ہیں جنھوں نے اخبار کو محض تجارت کا ذریعہ نہ سمجھا، بلکہ مغربی اصولوں پر اخبار نویسی کی شان پیدا کی اور اپنا خاص مسلک قائم کیا۔ "ہندوستانی" کا دور "اودھ پنچ" کے چھ سال بعد شروع ہوا۔ اور جس پولٹیکل رشی کے دماغ کا یہ اخبار کرشمہ تھا اُس نے اِسے بھی اپنی ذات کی طرح پولٹیکل خدمت کے لئے وقف کر دیا۔ "اودھ پنچ" گو ظرافت کا پرچہ تھا مگر پولٹیکل اور سوشل معرکہ آرائیوں سے بے خبر نہ تھا۔ اس کا مستقل سوشل اور پولٹیکل مسلک تھا۔ اس صوبے میں "ہندوستانی" کانگریس کا چراغ سمجھا جاتا تھا۔ مگر جن گوشوں میں اس چراغ کی روشنی کا گزر نہ تھا وہاں "اودھ پنچ" کی بجلی چکا چوند پیدا کرتی تھی۔ سوشل اصلاح کے معاملہ میں "اودھ پنچ" لکیر کا فقیر تھا۔ نئی روشنی کے نادان دوستوں کی حماقت کا پردہ فاش کرنے کے علاوہ اُس کی ذات سے اس تحریک کو کوئی نفع نہیں پہنچا۔ ظرافت کے اعتبار [illegible] یہ اپنے رنگ کا پہلا پرچہ تھا

اکثر ظریفانہ اخبار، مثلاً "انڈین پنچ"، "بمبئی پنچ"، "بانکی پور پنچ"، وغیرہ اُس کی تقلید میں نکلے مگر وہ دُنیا کی ٹھوکریں کھا کر ختم ہو گئے۔ زمانے سے کسی کو شہرت و ناموری کی سند نہیں ملی۔ "اودھ پنچ" کا جادو اُردو زبان پر عرصے تک چلتا رہا، اور اس طولانی زمانہ میں جو خدمات "اودھ پنچ" سے ظہور میں آئیں، اُن پر نظر ڈالنے سے اُردو نویسی کے دربار میں ہم اس کا صحیح مرتبہ قائم کر سکتے ہیں۔ اودھ پنچ ظرافت کا سرچشمہ تھا اور عام طور سے لوگ اُس کے فقروں اور لطیفوں پر لوٹ رہتے تھے۔ جو پھبتی اس میں نکل جاتی تھی وہ مہینوں زبان پر رہتی تھی اور دور دور مشہور ہو جاتی تھی مگر قوموں کے مذاق سلیم نے جو ظرافت کا اعلےٰ معیار قائم کیا ہے اُس کو دیکھتے ہوئے ہم اودھ پنچ کی ظرافت کو بہ حیثیت مجموعی اعلےٰ درجہ کی ظرافت نہیں کہہ سکتے۔

لطیف ظرافت اور بذلہ سنجی و تمسخر میں بہت فرق ہے۔ اگر لطیف و پاکیزہ ظرافت کا رنگ دیکھنا ہے تو اُردو زبان کے عاشق کو غالبؔ کے خطوں پر نظر ڈالنا چاہیے[۵۱]۔ اُردو

---

[۵۱] لطیف ظرافت کی بہت بلند اور اعلیٰ معیار کی مثالیں ہیں اکبرؔ الٰہ آبادی کے یہاں اکثر اور ظریفؔ لکھنوی کے کلام میں کافی تعداد میں مل سکتی ہیں۔ لطیف ظرافت سے بھی زیادہ بلند چیز طنز ہے۔ اس کے بہت اچھے نمونے مومنؔ کی غزلوں میں ہیں، اُردو نثر میں موجودہ دور میں لطیف ظرافت اور بلند ادبی طنز کے لکھنے کا بیحد رواج ہو گیا ہے۔ اس قسم کے بہت اچھے لکھنے والوں میں رشیدؔ احمد صدیقی۔ پطرسؔ اور مرزا فرحتؔ اللہ بیگ کا نام سب سے نمایاں ہے۔

نثر کے اِن جواہرات میں جہاں اور بہت سے لطافت اور رنگینی کے جوہر موجود ہیں وہاں ظرافت کی جھلک بھی کم دلکش نہیں ہے۔ نہ پھبتیاں ہیں نہ طعن و تشنیع کے جگر خراش فقرے ہیں۔ محض روزمرہ کی باتیں ہیں۔ مگر طبیعت کی شوخی متین الفاظ کے پردے سے جھلکتی ہے۔ اور پڑھنے والے کے چہرے پر مسکراہٹ کا نور پیدا کر دیتی ہے۔ باریک اور لطیف مذاق کی رنگینی اور بے ساختہ پن پر جس قدر غور کرو اُتنا ہی زیادہ لُطف آتا ہے۔ اودھ پنچ کے ظریفوں کی شوخ و طرّار طبیعت کا رنگ دوسرا ہے۔ اُن کے قلم سے پھبتیاں اس طرح نکلتی ہیں جیسے کمان سے تیر۔ جو مظلوم اِن تیروں کا نشانہ ہوتا ہے، وہ روتا ہے، اور دیکھنے والے اُس کی بے کسی پر ہنستے ہیں۔ اُن کے فقرے دل میں ہلکی سی چٹکی نہیں لیتے بلکہ نشتر کی طرح تیر جاتے ہیں۔ اُن کا ہنسنا غالب کی زیرِ لب مُسکراہٹ سے الگ ہے۔ یہ خود بھی نہایت بے تکلفی سے قہقہے لگاتے ہیں اور دوسرے کو بھی قہقہے لگانے پر مجبور کرتے ہیں۔ اکثر طبیعت کی شوخی اور بے تکلّفی درجۂ اعتدال سے گزر جاتی ہے، اور اُن کے قلم سے بے تحاشا ایسے فقرے نکل جاتے ہیں جن کو دیکھ کر مذاقِ سلیم کو آنکھیں بند کر لینا پڑتی ہیں۔ ایسا ہونا معیوب ضرور ہے مگر ایک حد تک قابلِ معافی ہے۔

اودھ پنچ کے ظریف اُس زمانہ کی ہوا کھائے ہوئے تھے جب مذاق و بے تکلّفی کا دائرہ ضرورت سے زیادہ وسیع تھا، اور زبان و قلم کی بہت سی بے اعتدالیاں ہماری نظر سے نہیں

دیکھی جاتی تھیں۔ اب زمانہ کے ساتھ ظرافت کا رنگ بھی بدل گیا ہے اور یہی دُنیا کا دستور ہے۔ ممکن ہے کہ جن باتوں کو ہم آج پھول سمجھتے ہیں وہ آئندہ نسلوں کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹکیں۔

ظرافت کے رنگ سے قطع نظر کرکے اودھ پنچ کی یادگار خدمت یہ ہے کہ اُس نے اُردو نثر کو، اُس کا مصنوعی زیور اُتار کر، جس میں سوائے کاغذی پھولوں کے کچھ نہ تھا، ایسے پھولوں سے آراستہ کیا جن میں قدرتی لطافت کا رنگ موجود تھا۔ اودھ پنچ کے پہلے رجب علی سرور[1] کے طرزِ تحریر کی پرستش ہوتی تھی اور عام مذاق تصنع اور بناوٹ کی طرف مائل تھا۔ اس زمانہ میں جو اُردو اخبار جاری تھے اُن کی زبان ایسی ہوتی تھی جسے ہم محض مجبّت میں اُردو کہہ سکتے ہیں۔ آج نثرِ اُردو جس سلیس اور پاکیزہ روش پر جاری ہے اُس کی ایجاد میں اُودھ پنچ کا بہت بڑا حصّہ ہے۔ علاوہ منشی سجاد حسین[2] مرحوم کے اودھ پنچ کے لکھنے والوں میں مرزا مچھو بیگ معروف بہ ستم ظریف، حضرت احمد علی صاحب شوق، پنڈت تربھون ناتھ ہجر، نواب سید محمد آزاد، بابو جوالا پرشاد برق، منشی احمد علی کسمنڈوی، حضرت اکبر حسین صاحب اکبر

---

[1] غالب کے دور سے پہلے عموماً پُرتکلف طرزِ تحریر پسند کیا جاتا تھا۔ مقفّٰی اور مسجّع عبارتیں جن میں ہر قدم پر ایک نیا استعارہ اور جملہ میں ایک نئی تشبیہ اپنا رنگ دکھاتی تھی۔ بات بات میں قافیہ لفظ لفظ پر سجع مُنہ سے ایک بول بھی فطرت کے رنگ میں ڈوب کر نکلنا مشکل تھا۔ یہی عام مذاق تھا اور یہی نصیحتوں کا انداز۔ اس رنگ کے سب سے شوخ اور پُرتکلف نمونے رجب علی بیگ سرور لکھنوی کی عبارتوں میں نظر آتے ہیں۔ خصوصاً اُن کی کتاب فسانۂ عجائب اُردو میں اس رنگ کا بہترین نمونہ ہے۔

[2] اودھ پنچ کے اڈیٹر اور بانی۔ اور صاحبِ طرز نثر نگار۔

یادگار نام ہیں۔ اِن لوگوں کے نظم و نثر کے مضامین دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ محض ایک طرزِ نو کے موجد ہی نہیں ہیں بلکہ زبان و قلم کے دھنی بھی ہیں۔ اُن کی عبارت شوخی و تازگی اور خداداد بے تکلفی سے معمور ہے اور اُن کی زبان لکھنؤ کی ٹکسالی زبان ہے۔ نثر کے نامہ نگاروں میں طبیعت کے چُلبلے پن اور شوخی کے لحاظ سے اور نیز زبان کی پختگی اور لکھنؤ کی بول چال اور محاورے کی صفائی کے اعتبار سے، ستم ظریف کا رنگ اوروں کے مقابلہ میں چوکھا ہے۔ احمد علی صاحب شوقؔ کے مضامین میں ظرافت کی شگوفہ کاری کے علاوہ زبان و محاورے کی تحقیقات کا خاص لُطف ہے۔ حضرت کسمنڈوی مرحوم کی عبارت خاص طور سے دلکش ہے، مگر فارسیت کا رنگ زیادہ ہے۔ ہجرؔ کا رنگ خاص یہ ہے کہ اُن کی ظرافت بمقابلہ اوروں کے، بد مذاقی اور طعن و تشنیع کے کانٹوں سے پاک ہے۔ برقؔ کی عبارت میں ظرافت کا چٹخارہ بہت کم ہے، مگر زبان نہایت صاف اور سُتھری ہے۔ آزادؔ کا قلم نواب زادوں کی بے فکری اور عیش پسندی کا خاکہ کھینچنے میں مشّاق ہے۔ منشی سجّاد حسین کا طرزِ تحریر سب سے الگ ہے۔ مضمون کیا ہیں چھوٹے چھوٹے چٹکلوں اور لطیفوں کے ذخیرے ہیں۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ پڑھنے والا مصنّف سے گفتگو کر رہا ہے۔ عبارت کہیں کہیں مختلف علوم و فنون کے پیچیدہ استعاروں سے گرانبار نظر آتی ہے، مگر بیان کی تازگی کی وجہ سے پڑھنے والے کا جی نہیں گھبراتا۔ ظریفانہ نظم کے میدان میں حضرت اکبرؔ سب سے دس قدم آگے ہیں۔ طبیعت کی خداداد شوخی، اکثر زبان کی صفائی سے بازی لے جاتی ہے۔ مگر عموماً

سوشل، پولٹیکل اور مذہبی مسائل کے ظرافت آمیز پہلو جس خوبی کے ساتھ حضرت اکبر نے نظم کئے ہیں وہ کسی دوسرے کو نصیب نہیں۔ اُن کا معیار ظرافت بھی اوروں کے مقابلہ میں لطیف تر ہے۔

اودھ پنچ کی محفل ایسی پُر مذاق اور نورانی طبیعتوں سے آراستہ تھی، اور اب بھی اگر کوئی شخص اُردو زبان حاصل کرنا چاہے تو اودھ پنچ کے ٹوٹے کھنڈروں کی زیارت اُس کے لئے ضروری ہے۔

اودھ پنچ کے مضامین کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ دُنیا کا کوئی مسئلہ ایسا نہ تھا جو اودھ پنچ کے ظریفوں کی گل کاری سے خالی رہتا ہو۔ اس کے علاوہ لکھنؤ کے طرز معاشرت کی پُر مذاق اور دلکش تصویروں سے اُس کے صفحے اکثر رنگین نظر آتے تھے۔ محرّم، چہلم، عید، شب برات، ہولی، دِوالی، بسنت کے جلسے، عیش باغ کے میلے، رقص وسرود کی محفلیں، مشاعرے، عدالت کی روبکاریاں، مُرغ بازی، تیتر بازی کے ہنگامے، الکشن کے معرکے، ایسے مشغلے تھے جو ہمیشہ اودھ پنچ کے ظریفوں کی نظر میں رہتے تھے۔ اور اُن کی طبیعتوں کے لئے تازیانہ کا کام دیتے تھے۔ ساقی نامے، برہے، بارہ ماسے، دوہے، ٹھُمریاں، غزلیں، رباعیاں وغیرہ نظم کرنے میں اُن کے اکثر نامہ نگار خاص ملکہ رکھتے تھے۔ منشی سجّاد حسین ہر ہفتہ ایک چھوٹا سا مضمون لوکل علیہ الرحمۃ کے عنوان سے لکھتے تھے، جس میں اکثر موسم کی تبدیلیاں ایسے ظریفانہ رنگ میں دکھائی جاتی تھیں کہ پڑھنے والا ہنستے ہنستے لوٹ جائے۔

—·—·—*—·—·—

دائرۂ ادبیّہ

کھُلی چٹھّی

حکیم برہم کی اڈیٹری میں گورکھپور سے ایک پرچہ 'مشرق' کے نام سے نکلتا تھا۔ برہمؔ چونکہ خود ادیب تھے اور اس کے علاوہ ایک خاص اثر کے مالک تھے اس لئے 'مشرق' میں مُلک کے بہترین انشاپردازوں کے مضامین شائع ہوتے رہتے تھے۔ مہدیؔ مرحوم نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ 'مشرق' میں ایک مستقل عنوان 'دائرہ ادبیّہ' کے کے نام سے قائم کر دیا جائے اور اُس میں مُلک کے ادیبوں کے ادبی جواہر پارے شائع ہوا کریں۔ جس خط میں یہ تجویز پیش کی تھی اُسی کے ساتھ یہ کھُلی چٹھّی بھی بھیجی تھی۔ یہ خط میر ناصرؔ علی مرحوم اڈیٹر صلائے عام کے نام ہے۔ میر ناؔصر علی مرحوم کا انتقال ۱۹۳۳ء میں ہوا ہے اور وہ اپنے طرز کے بہت قابلِ قدر نثار تھے۔ مہدی مرحوم نے خط تو خیر برائے نام لکھا ہے۔ اصل میں میر ناصر علی مرحوم کے طرزِ تحریر پر ادیبانہ اور شوخ تنقید کی ہے۔ جس سے اُن کے طرزِ تحریر کا اچھی طرح اندازہ ہوتا ہے۔

جنابِ من، یاد فرمائی کا شکریہ! پرچے[1] دیکھے۔ مدّت کی چوٹ جو دل کا چور بنی ہوئی تھی، اُبھر آئی۔ میں آپ کے لٹریچر کا اُس وقت سے دلدادہ ہوں جب لٹریچر کا صحیح مفہوم بھی میرے ذہن میں نہیں تھا۔ کم و بیش بیس برس ہوئے

[1] صلائے عام

جب آپ نے ایک وضع خاص پر لکھنے پڑھنے کا مشغلہ جاری کیا، یعنی "تیرھویں صدی" میں داد سخن لی تھی "تہذیب الاخلاق" کے ساتھ ساتھ آپ نے جس ٹھاٹھ سے دھواں دھار مضامین لکھے، اور سرسیّد کے لٹریچر پر جس سلیقے اور سخن گسترانہ شوخیوں سے آپ نے انتقادات کی کھپراڑی، سچ یہ ہے کہ وہ اُردو لٹریچر کی جان ہے۔ آج سنجیدگی اس قدر بڑھ گئی ہے کہ مَیں نہیں جانتا کہ مُلک کے نامور اہلِ قلم آپ کے گزشتہ کمالات کی داد دیں گے لیکن مَیں کھُل کر کہنا چاہتا ہوں کہ آپ نے اُس وقت انشا پردازی کو چمکایا جب بہتوں نے قلم بھی ہاتھ میں نہیں لئے تھے، آپ کا ادبی مذاق اور خاص طرح کا مادہ اختراعی (اُرجنیلٹی) درا صل آپ کی اولیات میں داخل ہونے کے لائق ہے۔

موجودہ نسل تمام تر "تہذیب الاخلاق" کے ادبی دَور کی پیدا کردہ ہے۔ جب آپ کے لٹریچر کا شباب تھا۔ اور یہیں سے اپنا مرتبہ دیکھ لیجئے۔ "تیرھویں صدی" میں بلاخوف و تردید کہہ سکتا ہوں کہ آپ کا عنصر غیر فانی ہے لیکن افسوس ہے کہ آپ کو یہ خیال نہ آیا کہ جس سے پچھلے دلوں اِتنے دماغی سامان رہے وہ بہ ہیئتِ مجموعی کتابی صورت میں جلوہ گری کا حق رکھتی۔ اِس پاکیزہ مجموعے کی ترتیب سے اُردو ادب العالیہ (کلاسکس) میں آپ کی طرف سے مستقلاً قیمتی اضافہ ہوتا جو یادگارِ زمانہ رہتا۔ آپ معاف فرمائیں گے، یہ بدترین حق تلفی تھی جو آپ اپنی کر سکتے تھے۔ یہ خیال قطعاً صحیح نہیں ہے کہ مُلک میں اچھے لکھنے والے پیدا ہو گئے ہیں۔ نئی نسل کو آپ کی اُردو سے

لہ مہدی مرحوم کو انگریزی لفظوں کے ترجمے کرنے میں خاص ملکہ تھا۔ اِسی مضمون میں کئی نہایت عمدہ عمدہ ترجمے موجود ہیں۔ جن میں ایک یہ ہے۔

کچھ واسطہ نہیں ہے۔ بہ حیثیت موجودہ نہ کسی میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ آئندہ کچھ کر سکے۔ صاف بات یہ ہے کہ جس لٹریچر پر آپ مٹے ہوئے ہیں سرے سے اُس کی جان ہی کے لالے ہیں، جس زبان کی حیات طبعی بوڑھے نذیر احمد اور حالیؔ و شبلیؔ کے دم تک ہو وہ سسک سسک کر کب تک چل سکتی ہے۔ آپ سے کچھ اُمیدیں تھیں مگر اُس وقت آپ کا صحیح عصر کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ سُنتا تھا لٹریچر بڑھاپے میں جوان ہوتا ہے۔ لیکن میں دیکھتا ہوں آپ کے ساتھ آپ کی طبیعت کا رنگ بھی کچھ بدل سا گیا ہے۔ یعنی خیالات میں ایک طرح کی بے تکی پائی جاتی ہے اور وہ بات نہیں رہی جو کبھی پہلے تھی۔ شاید اس لئے کہ "تہذیب الاخلاق" کی طرح کوئی چیز اُلجھاؤ پیدا کرنے والی نہیں رہی، یعنی جذبات کے اُکسانے کا سامان نہیں رہا۔

مُلک میں اچھے لکھنے والے کم ہیں۔ اُن میں بھی تھوڑے ہی ایسے ہیں جو آپ کے رنگ میں دو سطریں بھی لکھ سکیں۔ مرحوم ریاضؔ[1] (خدا اُسے مدتوں زندہ رکھے) اور برہمؔ[2] و اشہریؔ[3] کے دل سے پوچھئے ناصر علی[4] پھر کہاں؟ صلائے عامؔ کی ترکیب، باوصف حُسن ظن کے جو آپ کی طرف

---

[1] حضرت ریاض خیر آبادی اُردو کے سب سے کامل خمریات گو شاعر، ان کا انتقال ۱۹۳۴ء میں ہوا۔ اس جگہ مہدی مرحوم نے محبت میں مرحوم لکھا ہے۔

[2] حکیم برہم گورکھپوری جن کے پرچے میں یہ مضمون شائع ہوا تھا۔

[3] امجد علی اشہری مؤلف حیاتِ انیس۔

[4] میر ناصر علی مرحوم نے اِس نام سے اخبار نکالا تھا۔

سے ہے کچھ پسند نہ آئی۔ اس سے تو ناصری اچھا تھا "خاصے کی چیز" اور "وقف عام" ایک طرح کا بے تکلاپن ہے۔ اس سے آپ کے مذاقِ انشاء پردازی پر نکتہ چینی منظور نہیں، بلکہ آپ کو اپنے ڈھب پر لانا ہے! بیسویں صدی میں جو پرچہ آپ سے باکمال کے قلم کے سایہ میں اور وہ بھی عروس سخن کے میکے یعنی "دلّی" سے نکل رہا ہو۔ اُس کا نام میں آپ کی جگہ ہوتا تو بے سوچے سمجھے "ارتقاء" رکھ دیتا۔ نام اپنا باکیف تو ہو جس سے پرچے کی علتِ غائی یعنی آپ کے ادبی تخئیل (لٹریری آئیڈیل) کا پتہ چل سکے، تقطیع بھی مجھے پسند نہیں۔ ولایت کے نامی رسالے تو آپ کے پیشِ نظر ہوں گے۔ دور کیوں جایئے۔ "الندوة" کی نصابی تقطیع اختیار کیجئے۔ جو نہایت موزوں ہے، بہتوں کا بھی کھاتہ ٹھیک نہیں! یہ لکھ رہا ہوں اور سمجھ میں نہیں آتا آپ کے قدردان کہاں سے آئیں گے؟ موجودہ نسل آپ کو نہیں جانتی، یا کم سے کم میری طرح نہیں جانتی اور یہ آپ ہی کا قصور ہے، لیکن ہر فعل اپنی خود مکافات ہے دُنیا میں رہنے اور اچھی طرح رہنے کا اس قدر حق ہے کہ جس طرح ہو اپنی مستقل یادگار چھوڑئے۔ اس کی چلتی ہوئی ترکیب یہ ہے کہ "تیرھویں صدی" اور متفرق پرچوں میں آپ نے جو کچھ لکھا لکھایا ہے، اہتمام کے ساتھ ایک دم سے شائع کر دیجئے، لیکن مضامین غیر نہ ہوں، آب رواں میں گاڑھے کا پیوند بے جوڑ رہے گا۔ اگر یہ نہ ہوا تو میں سمجھوں گا، میرے منہ میں خاک! آپ جیتے جی مر گئے اور لٹریچر کے خونِ ناحق کا بارِ گراں جو گردن پر رہا وہ علیحدہ۔ یہ اصرار آپ کے خاص مرتبۂ انشاء پردازی کے لحاظ سے ہے۔ آپ کی زبان اپنے مختص النوع صفات کے ساتھ کسی اور کے بس کی چیز نہیں اور سچ یہ ہے کہ آپ اپنے فن کے اختصاصی (اسپشلسٹ) ہیں۔

میں آپ میں یونانیوں کی سی لطافتِ خیال پاتا ہوں۔ آپ کی چشمِ سخن جہاں "جنسِ لطیف" اور اُس کے متعلقات کی طرف اشارے کرتی ہے، وہ نزاکتِ خیال کی آخری حد ہے "تیرہویں صدی" میں بہتیرے نشتر ہیں جو آج تک دل میں چبھ رہے ہیں۔ ابھی ابھی ایک فقرہ نظر سے گذرا "یہ پان اُن کے لئے ہے"۔

بے اختیار جی بھر آیا۔ اگلے پچھلے قصّے پیش نظر ہو گئے۔ پوچھئے تو بتا نہیں سکتا۔ لیکن کچھ تو ہے جو دل پر چوٹ لگی، رکھ رکھاؤ اِتنا تو ہو، ایک چھوٹا سا فقرہ اور عطرِ زندگی۔

بوڑھے حالیؔ جو شاعرانہ جذبات کے ساتھ بھی عورت تو خیر "چھوٹے کپڑے" سے بھی گھبراتے ہیں، اس قسم کی نزاکتِ خیال کو پسند نہیں کرتے لیکن انشاپردازی اُن سے کبھی قطع نظر نہیں کر سکتی، شوقؔ[1] کی مثنویوں میں سے اگر زوائد کو نکال ڈالئے تو جو کچھ بچ رہے گا، فلسفۂ اخلاق کی جان ہوگا۔

یاد اِتنی تمھیں دلاتے جائیں   پان کل کے لئے لگاتے جائیں

ان سیدھے سادے مصرعوں میں جو رکھ رکھاؤ ہے کسی رازدارِ فطرت سے پوچھئے۔ کیا دُنیا کی شاعری اِس کی کوئی نظیر پیش کر سکتی ہے؟ یورپ میں جو آج بڑے پایہ کے لکھنے والے ہیں، اُن میں مذاقِ حُسن پرستی اس قدر رچ گیا ہے کہ قریب قریب اُن کی ہستی کا ایک جزو ہو رہا ہے۔ عورت جیسے "خوابِ طفلی اور آرزوئے شباب" کہئے۔ "ہر بات تری فسانۂ حُسن" ہئیتِ اجتماعی (یعنی سوسائٹی) کی روحِ رواں ہو رہی ہے جس سے

مثنوی زہرِ عشق کا ایک نغمہ۔

[1] نواب مرزا شوقؔ لکھنؤ کے شاعر اور اُردو کے بہت اچھے مثنوی گو ہیں۔ ان کی مثنوی "زہرِ عشق" اب تک بہت مشہور ہے۔

کوئی شائستہ لٹریچر دست بردار نہیں ہو سکتا، آپ اِن نزاکتوں سے خوب
واقف ہیں اور یہی وجہ ہے کہ :-
"عکسِ رُخ موتیوں کے دانوں میں"
"صنعت" نازک آپ کے دائرۂ تحریر میں کسی نہ کسی حیثیت سے
آ ہی جاتی ہے -
مہرالنساء کا وہ واقعہ کس قدر دلچسپ ہے، جب اُس نے باغ کی
ایک روش پر جہانگیر کے ہاتھ سے کبوتر لے کر چھوڑ دئے تھے۔ پروفیسر آزاد نے
جس خوبصورتی سے اُس کو دکھایا ہے، انشاء پردازی کو آج تک اُس سے
بہتر الفاظ نہ مل سکے۔ آپ وہ سماں دکھائیے جب مہرالنساء "جوان بیوہ" کی
حیثیت سے شاہی محل میں رہنے سہنے لگی ہے۔ لیکن ہائے وہ حُسن
افسردہ جو خود اپنی قوتوں سے واقف ہو، خوب جانتی تھی بجلی کدھر گرے گی۔
جہانگیر ایک روز اُس کے کمرے میں جا نکلا جو ضیائے حُسن سے
"شیش محل" ہو رہا تھا۔ جو روش کنیزوں کے حلقے میں زرق برق لباس
آنکھوں کو خیرہ کئے دیتے تھے "فطرت کی لاڈلی" ہمہ غمزہ و ہمہ عشوہ و
ہمہ ناز" نہایت سادے باریک لباس میں تھی، لیکن شیشے کی طرح
صاف شفّاف جسم جھلک رہا تھا۔
.... غرض مہرالنساء عالمِ تصویر بنی ہوئی تھی، شاہی نگاہیں
جسم کر حُسن عریانی کا جائزہ بھی نہ لینے پائی تھیں کہ ایک کہربائی قوت نے
بجلی کے تاروں میں نہیں، زلفِ عنبریں کے پیچوں میں "جہاں پناہ" کو جکڑنا
شروع کیا۔ شاہانہ تمکنت نے دیکھتے دیکھتے حُسنِ گلو سوز سے شکست کھائی،
جہانگیر سے ضبط نہ ہو سکا، دل کا چور زبان پر یوں آیا۔

"تمھارے اور تمھاری لونڈیوں کے لباس میں کیوں فرق ہے؟"
اس کا جواب جو کچھ ملا وہ اُسی کا حصّہ تھا جو آگے چل کر "نورجہاں" ہونے والی تھی:-
"جی میرا لباس لازماً اوروں سے مختلف ہوگا کیونکہ اُسے شاہی خواہشات کے زیر اثر ہونا چاہئے۔"
- ذرا دیکھئے گا! کیا کہہ گئی؟ جتنا کہا نہیں اُس سے زیادہ تخئیل کے لئے گنجائش چھوڑ دی

اس قسم کے بہتیرے نکلتے ہیں - مگر دکھائے کون؟ "آزاد[1]" جیتے جی مر گئے، آپ باتوں باتوں میں ٹالنا چاہتے ہیں۔ کیا اچھا ہوتا اگر آپ "بیسویں صدی کا مناظرہ" لکھتے "اخوان الصفا[2]" کے رنگ میں ایک خیالی مجمع الفصحاء (لٹریری اکیڈیمی) ترتیب دیجئے۔ پورا دائرہ ہو۔ اراکین بحث، یعنی اخلاق، مذہبی، افادی، اقتصادی، اور فلسفی وغیرہ مختلف الموضوع عناصر آکر جمع ہوگئے اور ان سبھوں میں آپس میں دماغی ٹکّر ہوئی تو لطف آجائے گا۔ کچھ نہ سہی خیّام کے فلسفے پر ریویو کر ڈالئے۔ اور جو پتے پتے کی کہہ گیا ہے نا آشنایانِ حقیقت کو سمجھا دیجئے۔ بیچارہ یورپ کے ہاتھوں جی رہا ہے[3] ایشیا میں بے طرح اُس کی مٹّی خراب

---

[1] آزاد سے مراد محمد حسین آزاد سے ہے جو اُردو کے بہترین انشاء پرداز سمجھے جاتے ہیں، ان کی مہدی مرحوم نے کئی جگہ بہت تعریف کی ہے۔ آخر عمر میں ان کا دماغ خراب ہوگیا تھا اس لئے زندہ ہونے کے باوجود بھی انشاپردازی کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ [2] ایک فارسی کتاب کا نام ہے جس میں بزرگوں کا ذکر ہے۔
[3] مغرب میں Fitzgerald نے خیام کو روشناس کرایا اور اُس کی بہت قدر ہوئی - اب ایک بہت عالمانہ اور مبسوط کتاب مولانا سلیمان ندوی نے اُردو میں لکھ کر (دوسرے صفحہ پر)

ہے، ثقہ لوگ اُسے ہاتھ بھی نہیں لگاتے۔ نہ جاننا بھی ایک مرنے کی بات
ہے۔ اِس قسم کی سرد مہریاں لٹریچر پر ایک بد نما داغ ہیں۔

آج کل سرمایہ دار وہی سمجھا جاتا ہے جو پچھلوں کے جمع کردہ مواد میں
تصرف بیجا یا بجا کر سکے۔ آپ میں مادّہ اختراعی کی کمی نہیں، مواد موجود
ہے۔ یورپ سے لیجیئے اور خیالات کو پھیلا کر سمیٹئے اور لکھئے۔ غزالی
اور ابن رشد کا مکالمہ بہت دلچسپ تھا[1]۔ لیکن ضرورت تھی کہ زیادہ
پھیلاؤ ہوتا اور لگے لپٹے مسائل میں سے کچھ نہ رہ جاتا۔ مختصر یہ کہ جس
پیمانہ پر آپ لکھ رہے ہیں میرے توقعات اُس سے کہیں بڑھے ہوئے
ہیں۔ اور یہ امر آپ کی عظمت کے ثبوت میں ہے، نری باتوں سے،
خواہ وہ کتنی ہی پیاری ہوں، اگر بار بار دُہرائے تو جی اُکتا جاتا ہے۔
متعدد ادھورے مضامین کی جگہ ایک آدھ لکھئے لیکن ذرا دل لگا کر
کم از کم ایک مضمون خالص فلسفیانہ رنگ میں ہو۔ جسے جامعیت اور
رکھ رکھاؤ کی حیثیت سے آپ اختراعِ فائقہ[2] (ماسٹر پیس) کہہ سکیں۔

نئے گروہ سے کچھ اُمید نہ کیجئے۔ اِن کے ہاں اس وقت تک صحیح
علمی مذاق کا پتہ نہیں۔ نہ پڑھنا لکھنا ضروریات زندگی میں داخل ہے۔
قومی لٹریچر سے بیگانگی، جیسا اس سے پہلے کسی موقع پر لکھ چکا ہوں ایک
طرح کی نمود سمجھی جاتی ہے۔ اور سچ یہ ہے کہ اگر شاید کچھ آتی بھی ہو،
اُردو تو خیر سے قطعاً نہیں آتی۔ انگریزی کی غیر ضروری آمیزش

[2] اس کے لئے اُردو میں اب شہ کار کا لفظ استعمال ہوتا ہے

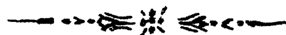
(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۵۷) شائع کرائی ہے اور نہایت محققانہ طریقہ اور دلکش انداز میں خیام کی زندگی
اور اُس کے کلام سے بحث کی ہے۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [1] میر ناصر علی کے ایک مضمون کی طرف اشارہ ہے۔

نے روزمرّہ کا جس طرح خون کر رکھا ہے، آپ دیکھ رہے ہیں۔ اس پر ستم ظریفی یہ کہ کسی کو احساس نہیں۔ مغربی تمدّن اور شائستگی کے دلدادہ جہاں یورپ کی تقلید پر مٹے ہوئے ہیں، ایک خاص مسئلہ میں اجتہاد سے نہیں چُوکتے، یعنی تکلفاتِ زندگی کے اسراف کے ساتھ کبھی قومی لٹریچر پر کچھ صرف کرنا جرم ہی نہیں بلکہ ایسا گناہ ہے جس کی بازپُرس ہو کر رہے گی۔ ایسے افراد کہاں تک آپ کے توقعات پورے کر سکیں گے؟

بہرحال آپ سے جو کچھ ہو سکے کئے جائیے، اور یہ تو میں تفصیل سے عرض کر چکا کہ آپ سے کیا چاہتا ہوں! مغربیت کے اثر سے نئے نئے عنوانِ زندگی پیدا ہو گئے ہیں۔ ان میں سے کسی بحث کو چھیڑیئے۔ آج کل قواعد رسمیہ (اٹی کیٹ) اور ارتقائے لباس پر جو نہایت اہم مسائل ہیں، کچھ لکھئے لکھائیے تو سب سے پہلے آپ کے دل و دماغ کے نتائج کی داد جس سے ملے گی، وہ میں ہوں۔

(مہدی افادی)



گرمی کا سماں

اُردو شاعری میں یہ بہت بڑی خرابی ہے کہ مقامی رنگ جس کو انگریزی میں لوکل کلر کہتے ہیں بالکل نہیں ہے۔ اس کی وجہ جہاں تک غور کیا جاتا ہے یہی ہے کہ اُردو شاعری کا نشو و نما اُس زمانے میں ہوا جب کہ اہلِ ہند تقلید کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے اور جدّتِ خیال کا نام کفر تھا۔ اس لئے وہ اپنی آنکھوں اپنے جذبات اور اپنے خیالات سے تو کام نہیں لے سکتے تھے۔ اُن کو خواہ مخواہ دوسری طرف توجہ کرنی پڑی اور چونکہ فارسی شاعری اسلامی حکومت اور ایرانی تمدّن کی بدولت پہلے ہی سے ہند میں اپنا سکّہ بٹھا چکی تھی۔ اس لئے لازمی طور پر وہی سب کی منظورِ نظر ٹھہری اور اُسی کو امامت اور اُستادی کا درجہ دیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے شاعر سرزمینِ ہند میں ایران کے خواب دیکھتے ہیں اور وہیں کے طرزِ کلام۔ وہیں کے پھولوں۔ وہیں کے پھلوں اور وہیں کے پرندوں سے اپنے خیالات کے باغ آراستہ کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ فارسی کی طرح اُردو میں بھی مرد موضوعِ شاعری قرار پائے اور وہی تشبیہیں اور استعارے مروّج ہوئے جو اہلِ ایران کے کلام کی گرمی کا موجب ہیں۔

اگرچہ اس وجہ سے کہ جذباتِ انسانی ہر جگہ ایک ہی ہیں یہاں طباعی باوجود اتنی قیود کے درجۂ کمال پر پہنچ کر ہی رہی لیکن کاملین کے کلام کو بھی وہ بات اور وہ اثر نصیب نہ ہوا جو مقامی رنگ کا حصّہ ہے

اور جن لوگوں کو منبع فیض سے اِتنا حصّہ نہ مِلا تھا اُن کا کلام تو فارسی شاعری کی پھیکی اور بھدّی نقل بن کر رہ گیا۔ ہمارا تمام لٹریچر گل و بلبل کی داستان سے بھرا پڑا ہے۔ حالانکہ ہندوستان میں کبھی کسی نے بُلبُل کی شکل بھی نہیں دیکھی۔ اور کنول کے پھول اور کوئل کی کوک اور بھونرے کی بیقراری کا، جو ہندوستان کی خصوصیات اور ہر وقت ہمارے پیش نظر ہیں، کہیں نام بھی نہیں ہے۔ قیس و فرہاد کے دل خراش قصّے تو بچّے بچّے کی زبان پر ہیں مگر نل اور پرورداس کا کوئی نام بھی نہیں جانتا۔ لیلیٰ و شیریں کے حُسنِ خدا داد کی شہرت تو عالمگیر ہے مگر درو پدی و سیتا کی نازآفرینی و کرشمہ سازی ہمارے شاعروں کی آنکھ سے اوجھل ہے۔

کاش ہماری تقلید سے سرشار بزرگ بجائے فارسی کے یا فارسی کے ساتھ ہی ساتھ ہندی شاعری کو بھی اپنا نمونہ یا رہبر یا طریق بناتے تو باوجود تقلید کے اُن کو وہ بات نصیب ہو جاتی جس کو اب آنکھیں ڈھونڈتی ہیں اور بے فائدہ ڈھونڈتی ہیں۔ ہندی شاعری کا نشو و نما اور پرورش ہندی ہی کی آب و ہوا میں ہوئی ہے اس لئے وہ اہلِ ہند کے اصلی جذبات اُن کی واقعی خصوصیات اور مقامی معلومات سے بھری ہوئی ہے۔ ہندو شاعر جس چیز کو بیان کرتے ہیں اُس کی تصویر آنکھوں کے سامنے کھڑی کر دیتے ہیں۔ اُن کی انوکھی تلاش دل کو بیقرار کر دیتی ہے اور اُن کے قومی جذبات دل سے نکل کر دل ہی میں بیٹھ جاتے ہیں طبیعت انسانی کے مطالعہ اور فطرت کی رنگا رنگ گلکاریوں کے مشاہدے میں اُن کو خاص دخل ہے۔

آج کل اس میں شک نہیں کہ ہماری شاعری کا ایک خاص

رنگ پیدا ہو رہا ہے لیکن چونکہ اُس کا دار و مدار بھی انگریزی شاعری
کی تقلید پر ہے' اس لئے وہ ہماری شاعری کو مقامی خصوصیات سے
جو دراصل ہر شاعری کی جان ہیں اور بھی دور لئے جا رہا ہے۔ اس میں
شک نہیں کہ اگر ابتدا میں کالیداس اور بھاؤ بھوتی وغیرہ کی نظموں کا
ترجمہ اُردو میں ہو گیا ہوتا تو آج اُردو شاعری کا رنگ بالکل دوسرا ہی ہوتا
اور گو اب انگریزی مذاق کے زور پکڑ جانے کی وجہ سے ہندی رنگ کا
فروغ پانا کسی قدر دشوار ہو گیا ہے لیکن چونکہ ہم اُس سے بالطبع مانوس
ہیں اور وہ ہمارے ہی اصلی جذبات کی تصویر کھینچتا ہے۔ اس لئے اب بھی
اگر اُس کمی کے پورا کرنے کی کوشش کی جائے تو ایک حد تک کامیابی
کی اُمید ہو سکتی ہے۔ یوں تو ہندی شاعری کے بہت سے طبقے ہوئے
جن کا ذکر یہاں خارج از مبحث ہو گا۔ لیکن جیسی ترقی کہ قدیم ہندوؤں
نے فن ڈراما یعنی ناٹک میں کی اُس کی مثال دوسری اقوام میں مشکل سے
مل سکتی ہے۔ اگرچہ اب یہ بالاتفاق طے ہو گیا ہے کہ فن ڈراما کی ابتدا
دوسرے فنونِ لطیفہ کی طرح قدیم یونان میں ہوئی اور وہیں سے یہ فن شریف
ہندوستان میں آیا لیکن ہندوؤں کی خداداد ذہانت اور عالی مرتبہ طباعی
نے سنہ عیسوی کے پہلے ہی اُس کو ترقی کے ایسے زینے پر پہنچا دیا تھا جو
یورپ کو ہزار ڈیڑھ ہزار برس کے بعد سولھویں صدی عیسوی میں نصیب
ہوا۔ ڈراما کو شاعرانہ جذبات کے اظہار سے خاص مناسبت ہے اور جیسی خوبی
سے صحیفۂ فطرت کا باریک مطالعہ اور قلب انسانی کے طوفان خیز جذبات
کی کشمکش اور اُس کے پیچیدہ رازوں کا انکشاف ڈراما میں دکھایا جا سکتا
ہے ایسا دوسری اصناف شاعری میں ممکن نہیں ہے۔ ہندو ڈراما

میں برخلاف دوسرے اقسامِ سخن کے یہ خاص بات بھی ہے کہ وہ
مذہبی اور روحانی رنگ سے بالکل معرّا ہے اور اس لئے ہرکس و
ناکس کے لئے سرمایۂ تعلیم و تفریح ہو سکتی ہے۔ پس ان ہی وجوہ سے
ہم نے ارادہ کیا ہے کہ اگر مکروہات زمانہ سے فرصت ملے تو کبھی کبھی
ہندو ناٹکوں کے بعض مؤثر سینوں کا ترجمہ اُردو داں پبلک کے ملاحظہ
میں پیش کیا کریں گے۔ تاکہ اُن کو معلوم ہو کہ دراصل منصب شاعر کیا ہے اور
اُس کو فطرتِ انسانی کا مطالعہ کیسی باریک نظری سے کرنا چاہئے اور اُس کے
مؤثر پیرایہ میں ظاہر کرنے کے لئے کیا طریقہ مناسب ہے۔ اُن کو یہ بھی معلوم ہوگا
کہ شاعری کے رنگ و روپ کے لئے خزانۂ فطرت کا زیر باراحسان بننا
ضروری ہے ورنہ شعر پانی کی طرح پھیکے اور بے رنگ ہوں گے۔ اگرچہ
ہندوؤں کی قدامت پرستی نے اپنی ہر چیز کو نامعلوم کے تاریک دھندلکے
میں ایسا غائب کر دیا ہے کہ پتہ لگانا دشوار ہے لیکن دقیقہ سنجانِ یورپ کا
اتفاق ہے کہ جس قدر ہندو ڈرامے فی الحال موجود ہیں اُن میں مرچھکٹیکا
(کھیل کی گاڑی) سب سے قدیم ہے۔ یہ ڈراما سدراک راجہ اوجین سے
منسوب ہے جس کی نسبت یہ تقریباً طے ہو چکا ہے کہ وہ پہلی یا دوسری صدی
قبل مسیح میں گذرا ہے۔ یہ ناٹک علو خیالات، پُر جوش جذبات، معرفت حقائق
اور مطالعہ فطرت کے لحاظ سے اپنی آپ ہی نظیر ہے اور اُس زمانے کی طرز
معاشرت پر ایسی تیز روشنی ڈالتی ہے کہ پوری تصویر آنکھوں کے سامنے
آجاتی ہے۔ اس ناٹک کی خوبیاں نہایت تفصیل سے بنگالہ کے مشہور
عالم ڈاکٹر نشی کانت مرحوم نے دو لکچروں میں بیان کی ہے اور جن لوگوں
کو شوق ہو وہ اُن سے فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔ چونکہ مرچھکٹیکا سب سے

قدیم ناٹک ہے اس لئے مناسب یہی ہے کہ انتخاب کی ابتدا بھی اُسی سے کی جائے۔ ہم نے موسمی مناسبت سے ایک ایسا سین منتخب کیا ہے جس میں ابر و باراں کا لطف عجیب دلفریب پیرایہ میں دکھایا گیا ہے۔
"اور گو ہمارے اعمال کی بدولت اِس وقت نسیم بہار کے بجائے بادِ سموم، کالی گھٹاؤں کے بجائے گرد و غبار کے دَل بادل، نمو کے بجائے انحطاط، بارانِ رحمت کے بجائے سیل فنا اور ساون کی خوشگوار تسکین بخش جھڑیوں کے بجائے آگ سے زیادہ گرم اور تیر سے زیادہ تیز انسان کی شعاعیں انسان و حیوان کو بیتاب کر رہی ہیں، لیکن مشہور ہے کہ اگر یار نہ ہو تو ذکر یار ہی باعث تسکین ہوتا ہے اور اس لئے کیا عجب ہے کہ تھکی ہوئی نگاہ کے لئے یہ گلزار صفحے ہی مُرغزار کا کام دیں"۔ ناظرین ملاحظہ فرمائیں گے کہ سُدرک نے برسات کے جنوں خیز مناظر کی تصویر کیسے تیز قلم سے کھینچی ہے اور اُن کو دیکھ کر جو وحشت انگیز مگر دلکش جذبات پیدا ہوتے ہیں، اُن کا سماں کس خوبی سے دکھایا ہے۔ اس سین کے پوری طرح سمجھنے کے لئے غالباً اس امر کا بتا دینا ضروری ہو کہ مرچھ کٹیکا کا ہیرو ایک نہایت نیک نفس اور شریف خاندان برہمن ہے جو اپنے فیاض ہاتھوں کی بدولت مفلس ہو گیا ہے اور ہیروانِ ایک دولت مند حسین شاہد بازاری وسنت سینا ہے جس کا دل اپنے فرقہ کے آئین کے خلاف محبّت و وفا سے معمور ہے۔ ویٹ مصاحب یا اتالیق کو کہتے ہیں جس کو فن موسیقی میں خاص طور پر دخل ہوتا تھا۔ پس یہ سمجھنا چاہیئے کہ شام کا وقت ہے اور وسنت سینا ویٹ کے ہمراہ اپنے محبوب چارودت کے یہاں جا رہی ہے کہ راستے میں گھٹا اُٹھتی ہے اور مینہ برسنے لگتا ہے اور اُسی حالت میں

اُس کے اور وینٹ کے مابین یہ مکالمہ ہوتا ہے۔ اب شاعر کا کمال دیکھنا چاہئے کہ اُس نے یہ دلربا منظر تین علٰحدہ شخصوں کی نگاہ سے دیکھا ہے، جن کے دلوں میں مختلف قسم کے جذبات موج زن ہیں۔ سب سے پہلا تو وینٹ ہے جو محض اوپری نگاہ سے دیکھتا ہے۔ دوسرے وسنت سینا جس کو اشتیاقِ وصال اپنے محبوب کے گھر کھینچے لئے جا رہا ہے اور اس لئے وہ اُس کو ایک عاشقِ مہجور کی نظر سے دیکھتی ہے۔ تیسرے چارودت جو ایک خوش دل کامیاب عاشق کی حیثیت سے اُس پر نظر ڈالتا ہے۔ اب ذرا بادل کا سازوسامان دیکھنا چاہئے کہ کیسی شان و شوکت سے قلّۂ کوہ پر نمودار ہوتا ہے اور رعد کے نقّارہ بجاتا اور بجلی کے پھریرے اُڑاتا فضائے عالم پر حملہ آور ہوتا اور ہاتھیوں کی قطاروں کی طرح بجلی کی زنجیروں سے جکڑا ہوا مُنہ اُٹھائے نور کی جھڑیاں برساتا دوشِ ہوا پر چلا جاتا ہے اور بخارات کے اجتماع سے آسمان طوفانی سمندر معلوم ہونے لگتا ہے۔ اندھیرا اس بلا کا ہے کہ بجلی کی چمک سے بقول ملٹن کے تاریکی اور گہری ہو جاتی اور دن رات میں تمیز باقی نہیں رہتی، اور دنیا فطرت کے اِن ہولناک مناظر سے دہشت زدہ ہو کر ابر کے خوشگوار سایہ میں خوابِ راحت کے لئے لیٹ جاتی ہے اور پانی چھم چھم برس کر لوری دیتا ہے اور اُفق کی عجیب حالت ہے کہ کبھی بجلی سے دمک اُٹھتا اور کبھی قوسِ قزح سے منوّر ہو جاتا ہے۔ بادل کبھی سمٹتا ہے اور کبھی پھیلتا ہے اور کبھی دھوئیں سے بخارات سانپ کی طرح لہراتے ہوئے آسمان پر چڑھتے ہیں۔ اگر بجلی کو دیکھو تو کبھی تو وہ شاہدِ ہرجائی کی طرح مطلعِ آسمان پر ہر طرف گشت لگاتی پھرتی ہے اور کبھی فوجِ علَم

کے لئے پھریرا بن جاتی ہے۔ کبھی آسمان کو مطلع انوار بناتی اور کبھی تاریکی کو اور گہرا کر دیتی ہے۔ کبھی فیل ابر کے لئے زنجیر بن جاتی اور کبھی بھولے بھٹکوں پر رحم کھا کر رہبری کرنے لگتی ہے۔ اب اگر وسنت سینا کے درد مند دل سے پوچھو تو اُس کو ابر کے گھٹا ٹوپ اندھیرے کا صرف یہ مقصد معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے محبوب کے وصال سے محروم رہی اور بادلوں کے ہاتھیوں کی طرح جھومنے کی صرف یہ غرض ہے کہ اُس کے حزن وملال میں ترقی ہو۔ گھنگور گھٹا کی تاریکی دن کے نکلنے کے لئے ہے اور مینہ کی جھڑیاں غریب دیپک کے ٹیلے نیست و نابود کرنے کے لئے بیچاری چاندنی بادلوں کے پیچھے چھپ جاتی ہے اور غریب کی جورو کی طرح ڈرتے ڈرتے جھانکتی ہے۔ ستاروں کا غائب ہونا اور تمام عالم پر تیرگی طاری ہوجانا بادلوں کا کبھی برسنا، کبھی چڑھنا اور کبھی اُترنا اور کبھی جھک کر زمین سے مل جانا، کبھی گرج کر دھاڑنے لگنا، کبھی رو کر دریا بہانا اور کبھی آپ ہی آپ غصہ میں آکر چہرے کا سیاہ کر لینا اگر اشتیاقِ وصال ایسی چیز نہیں ہے کہ ان بلاؤں سے کوئی وفادار دل مرعوب ہو۔ بادل کڑکے، بجلی کوندے، آسمان پھٹ پڑے، مگر پائے ثبات سے نہیں ہل سکتے اور اگر ہلیں گے تو آگے ہی بڑھیں گے۔ اب کامیاب عاشق کو دیکھئے کہ اُس کے نزدیک مینہ کی بوندیں اِندر کے خزانہ کے دُرشاہوار ہیں اور گھٹائیں کالی نہیں ہیں بلکہ کسی کی آمد آمد کے انتظار میں سیاہ غازہ مل کر آراستہ ہوئی ہیں، اور بجلی کی ادائیں محض معشوقانہ ہیں۔ خوشی کچھ ایسی چیز ہے کہ ابھی جو چیزیں بھیانک معلوم ہو رہی تھیں وہی اب دلفریب نظر آرہی ہیں بلکہ پریشانی بھی خود سمٹ سمٹا کر جمعیت کی شکل بنا

نمودار ہوتی ہے۔ اب یہ دیکھنا چاہیئے کہ انسان کو چھوڑ کر حیوانات پران ہیبت ناک مگر جانفزا مناظر کا کیا اثر پڑتا ہے۔ مورنیاں بادل کی گرج سنتے ہی بیدار ہوکر دیوانہ وار دوڑنے لگتی ہیں۔ اور مینڈھک خوش خوش آبِ زلال سے پیاس بجھاتے ہیں۔ سارس کی چیخیں طنبورہ کی غم افزا گتیں معلوم ہوتی ہیں اور بگلوں کی قطاریں کبھی تو سیاہ ابر کو سفید بنا دیتی ہیں، کبھی فیل ابر کا سر بند اور کبھی آسمان کے ہنسنے کے لئے دانت بن جاتی ہیں۔ کالی گھٹاؤں کا خیر مقدم ہر پرند اپنے خاص جذبات کے لحاظ سے کرتا ہے۔ مورنیاں تو چیخیں مار مار کر خوشیاں مناتی ہیں اور بگلے اُس کے دامنوں سے لپٹ لپٹ کر دل کے ارمان نکالتے ہیں، مگر دور اندیش مُرغابیاں فکر و تردّد کی نگاہ سے دیکھتی ہیں۔ اگرچہ یہ مناظر خود اس قدر دلفریب ہیں کہ کسی زرنگار چوکھٹے کی ضرورت نہ تھی لیکن ہمارے شاعر نے ہر ایک مناظر کو برجستہ تشبیہات اور برموقع توجیہات سے خانۂ دل میں نگینہ کی طرح جڑ دیا ہے۔ چونکہ ناظرین یہ تماشہ خود سُدرک کی نگاہ سے دیکھنے کے لئے بیقرار ہوں گے۔ اس لئے یہیں ختم کلام ہے۔

ودیشٹ :- بی بی سامنے پہاڑ کی چوٹی پر کسی پیاسے بچھڑے دُکھیارے کے دل کی طرح کالی گھٹائیں اُمنڈ رہی ہیں۔ اُن کی گرج نے مورمورنیوں کو بیدار کر دیا ہے جن کے پھڑ پھڑا کر اُڑنے سے آسمان کے نیچے ایک ایسا تلاطم برپا ہوگیا ہے کہ گویا ہزاروں مرصّع رنگ برنگ کے جواہرات سے جگمگاتے ہوئے پنکھے جھلے جا رہے ہیں۔ بڑداسی مینڈک آبِ باراں کے شفاف قطرے جو اُن کے مُنہ میں اُن کے کیچڑ سے سنے جبڑوں کو دھوتے ہوئے جاتے ہیں امرت کے چوس رہے ہیں۔ مورنیاں جوشِ مسرت سے

پیہو پیہو کرتی پھرتی ہیں اور نیپ کی تازہ کلیاں چٹکی پڑتی ہیں۔ رواں دواں اندھیرے نے چاند کو ایسا گم کر دیا ہے جیسے ریاکار اپنی شرمناک زندگی کو تقدس کے جامہ میں چھپا لیا کرتے ہیں۔ بجلی کسی حسن فروش مہ جبیں کی طرح جس کی نیکنامی تلوّن اور ہرجائی پن کی نذر ہو چکی ہو ایک جگہ دم بھر نہیں ٹھہرتی۔ بلکہ آسمان پر تڑپتی پھرتی ہے۔"

وسنت سینا۔ "واہ کیا کہنے۔ مگر مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وسواسی رات جو اندھیرے کے ساتھ مزے اُڑانے میں مصروف ہے مجھے اپنی سوکن سمجھ کر دور ہی سے روک رہی ہے اور جھلا جھلا کر لوٹا رہی ہے کہ میں کہیں اُس کے عیش میں مخل نہ ہوں۔"

ویٹ۔ "تو تم بھی اُس کو ذرا کڑک کر جواب دو اور لعن طعن کر کے راہ پر لے آؤ۔"

وسنت سینا۔ "لعن طعن تو ہمارے فرقے کا زیور ہے۔ لیکن یہاں کچھ نہیں چلتی۔ لیکن ہاں! میں اُس کی پروا کروں تو کیوں! بلا سے بدلیاں پھٹ پڑیں، بادل گرجیں اور مطلع آسمان سے بان پر بان دہکتے ہوئے گریں مگر وہ جری عورت جس کا سینہ عشق و وفا سے معمور ہے کبھی پیچھے نہیں ہٹ سکتی۔ اُس کا قدم آگے ہی بڑھتا چلا جائے گا خواہ جنوں خیز طوفان کیسی ہی بلائیں نازل کرے۔"

ویٹ۔ "یہ ابر کا بڑا ٹکڑا کسی حملہ آور راجہ کی طرح جو اپنے مغلوب دشمن کے دارالسلطنت میں دربار کرنے کے لئے جا رہا ہو، ہوا کی۔ فوج جھڑیوں کے نوکدار تیروں اور بجلی کی جگمگ کرتی جھنڈیوں کے ساتھ رات کے راجہ پر خود اُس کے آسمانی قلعہ میں حملہ کرنے کے لئے

بڑھ رہا ہے۔"

وسنت سینا: "نہیں نہیں ایسا نہیں ہے۔ میں خوب سمجھتی ہوں کہ یہ دھواں دھار بادل جو کبھی بے ڈول ہاتھیوں کی طرح اپنی بھاری لاش سنبھالے جھومتے جھامتے بڑبڑاتے چلتے ہیں اور کبھی بگلوں کی منڈلاتی قطاروں سے سفید سے معلوم ہونے لگتے ہیں، دل کو غم کا سبق دینے کے لئے اُٹھے ہیں۔ سارس کی تیز چیخیں طنبورہ کے دلسوز ٹھیکوں کا کام کر رہی ہیں جس پر کسی ہجر کی ماری دُکھیاری کی اُنگلیاں جس کا دل اپنے پیا کے پردیس سے واپس آنے میں پڑا ہو، تھاپ لگا رہی ہوں اور ہر سُریلی گت جو موسم برسات کا خیر مقدم کرتی ہو اُس کے لئے نمک پاشِ جراحت دل ہو۔"

ویٹ: "دیکھو وہ سامنے گرانڈیل بادل ہاتھی کی طرح مُنہ اُٹھائے کھڑا ہے اور بگلوں کی سفید قطاریں اُس کے سربند باندھ رہی ہے اور بجلی نے کوندکوند کر سر پر چنور کر دی ہے۔"

وسنت سینا: "کیا خوب۔ دیکھا یہ گھنگھور اندھیرا جو سیاہی میں تاڑ کے تر بتر پتّوں کو مات کر رہا ہے۔ دن کو کیسا صاف نگل گیا اور وہ دیکھو سامنے دیمک کے ٹیلے مینہ کی جھڑیوں سے دب دبا کر اُسی طرح غائب ہوتے جا رہے ہیں جیسے میدانِ جنگ سے تھڑولے ہاتھی تیروں کی بوچھار سے دُم دبا کر چپکے سے کھسک جایا کرتے ہیں۔ بیقرار بجلی ہر طرف مندروں کی طلائی قندیلوں کی طرح پُر نور شعاعیں پھیلا رہی ہے اور ڈرپوک چاندنی غریب کی جورو کی طرح بادلوں کے پیچھے سے ڈرتی کانپتی جھانک رہی ہے۔"

وسیٹ :۔ دیکھو وہ بدلیاں ہاتھیوں کی قطاروں کی طرح بجلی کی چمکدار رسیوں میں جکڑی اپنے عظیم الشان مالک کے احکام کی تعمیل میں خراماں خراماں جارہی ہیں اور ایک چاندی کی زنجیر سی آسمان سے زمین تک لٹک رہی ہے۔ نیلے فلک کے متحرک جسم سے جو بادِ بہاری کے ہلکے جھونکوں سے ہم آغوش ہوکر پھولا نہیں سماتا اور بجلی کے شعلوں سے کف بدہاں ہے تیز جھڑیاں ہیرے کی، آنے والے تیروں کی طرح گر رہی اور سطح زمین میں جو گلہائے رنگارنگ سے مزین اور سوندھی سوندھی خوشبوؤں سے مہک رہا ہے، گھسی جاتی ہے۔ طوفان نے آسمان کا بعینہٖ ایسا نقشہ بنا دیا ہے کہ گویا سمندر کی تاریک موجیں تلاطم سے تنگ آکر اُچھل اُچھل کر اپنا چمکتا ہوا سر ساحل سے ٹکرا رہی ہیں۔"

وسنت سینا :۔ دیکھو! سامنے وہ گھنگھور گھٹا دھمکیاں دیتی ہوئی اُٹھی جس سے تمام زمین و آسمان تیرہ و تار ہوگیا۔ کیا لطف ہے کہ مورنیاں چیخ چیخ کر اُس کا خیر مقدم کررہی ہیں اور خوش طبع بگلے جوشِ مسرت سے اُس کے دامنوں سے لپٹے جارہے ہیں۔ مگر دور اندیش مرغابیاں اُس پر فکر و تردد سے نظر جمائے ہوئے ہیں۔"

وسیٹ :۔ "آسمان اپنا چہرہ اندھیرے کی نقاب میں چھپائے ہوئے ہے جس کو بجلی کی تڑپ بھی بہ مشکل ہٹا سکتی ہے۔ دن اور رات بدحواس سے ہوکر ایک ہوگئے ہیں اور اُن کی کنول سی آنکھیں خوف کے مارے بند ہوئی جاتی ہیں۔ گویا کہ دُنیا بادلوں کے خوشگوار سایہ میں جو آسمان کے کونے کونے پر چھاگئے ہیں، سونے کے لئے بستر استراحت پر دراز ہے۔ اور مینہ کے برسنے کی بھینی بھینی آواز لوری دے رہی ہے۔

وسنت سینا: "سارے ستارے اس طرح غائب ہو گئے جیسے خبیث باطن لوگوں کے دل سے احسان کی یاد۔ مطلع آسمان نور سے اسی طرح عاری ہو رہا ہے، جیسے شوہر کی غیر حاضری میں عورت کے چہرے سے رونق اُڑ جاتی ہے۔ درحقیقت ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ آسمان کوئی دم میں گھُل کر بہ جائے گا۔ کیونکہ وہ اِندر کے جہاں سوز بانوں سے پگھل پگھل کر پُرشور سیلابوں میں جوڑ کٹنے کا نام نہیں جانتے، اُمنڈ رہا ہے۔ کبھی بادل چڑھتے ہیں اور کبھی اُترتے ہیں اور کبھی جُھک کر زمین سے لگ جاتے ہیں اور کبھی گرج کر دھاڑنے لگتے ہیں اور کبھی برس کر دریا بہاتے ہیں اور کبھی غصّہ میں آکر چہرہ سیاہ کر لیتے ہیں۔"

ویٹ: "کبھی آسمان بجلی سے دَمکنے لگتا ہے اور کبھی سفید بگلوں کی قطاروں کے دانت نکال کر ہنستا ہے۔ کبھی اِندر کے سو تیر والی کمان (قوس و قزح) سے جگمگا اُٹھتا ہے اور کبھی اُس کے دَمکتے ہوئے بانوں کی زو (بجلی) سے کڑکنے لگتا ہے۔ کبھی طوفانی ہواؤں کے تیز جھونکوں سے گھبرا کر لڑ بیٹھتا ہے اور کبھی سمٹتے ہوئے بادلوں سے جو کالے ناگوں کی طرح لہراتے بل کھاتے چلے جا رہے ہیں، گھنگھور گھٹا کی شکل میں ان دھوؤں کا سُرمئی لباس زیب بدن کئے جو اُس وقت اُفق پر چھا جایا کرتے ہیں جب کہ خوشبوؤں کے معطّر بخور آسمان پر پیچ در پیچ زنجیر بناتے ہوئے چڑھتے ہیں۔"

وسنت سینا ۔ اے بادل تیرا بُرا ہو۔ تو مجھے کیوں کڑک کڑک کر دھمکیاں دے رہا ہے اور اپنے آبی تیروں سے کس لئے میرا راستہ روک رہا ہے۔ حالانکہ میں اپنے محبوب کے پاس جا رہی ہوں۔ اے اِندر

سچ بتا میں نے کب تجھ سے عہد شکنی کی تھی کہ تو گرج گرج کر طعنے دے رہا ہے ۔ تجھے تو میری راہ میں حائل ہوتا زیبا نہیں ہے۔ اے اِندر اگر کبھی تیرا دل لذّت آشنائے اُلفت ہوا ہے اور کبھی تو اہلیہ کے شوہر کی شکل میں نمودار ہوا ہے تو میرے جذباتِ دل پر ترس کھا کر اپنے بادل ہٹا لے ۔ لیکن خیر اگر تیری یہی مرضی ہے تو شور مچائے ۔ موسلادھار سیلاب برسائے اور اپنا سوہان والا گُرز چلائے جا ۔ لیکن سب بے فائدہ ہے ۔ تو کبھی اُس وفادار مہ جبین کا دامن نہیں پکڑ سکتا جو اپنے محبوب کے آغوشِ محبت میں خوف سے نجات پانے کی رو میں چلی جا رہی ہے۔ اگر تو گرج رہا ہے تو بلا سے گرجا کر، کیونکہ یہی تیری فطرت کا تقاضا ہے۔ اور ظلم تیری طبیعت کا خاصہ ہے ۔ مگر او نرم دل بجلی تو کیوں کر اُن جذبات سے آشنا ہو گئی جو عورتوں کے سینوں میں تلاطم برپا کیا کرتے ہیں ۔"

وِیٹ :۔ "بس بس! آخر کار بجلی راہ پر آگئی ۔ دیکھو وہ اُس روشن چراغ کے مانند جو اِندر کے محل میں جھلملا رہا ہو یا اُس سفید جھنڈی کی طرح جو پہاڑ کی چوٹی پر ہوا میں لہرا رہی ہو یا سنہری ڈوریوں کے مثل جو ایراوت[۵] کے سینہ پر نمایاں ہوں، چمک چمک کر تمھارے محبوب کے مکان کا راستہ بتا رہی ہے ۔"

اس کے بعد وسنت سینا اپنے عاشق چارودت کے مکان پر پہنچ جاتی ہے اور چونکہ پانی کا برسنا موقوف ہو گیا اور بھینی بھینی چاندنی چھٹکی ہوئی ہے، عاشق و معشوق خانۂ باغ کے ایک کونے میں

---

۵ ایراوت ۔ اِندر کے ہاتھی کا نام ہے۔

بیٹھ کر لطف صحبت اُٹھاتے ہیں کہ اتنے میں پھر بوندیں ٹپاٹپ گرنے لگتی ہیں اور چارودت کا دوست متریے جو کسی قدر فاصلے پر بیٹھا ہوا ہے کہتا ہے۔

دوست دیکھو بادل پھر سمٹ سمٹ کر جمع ہو رہے ہیں اور بڑی بڑی بوندیں یہاں سے اُٹھنے کا تقاضا کر رہی ہیں۔"

چارودت "سچ ہے پانی کی بوندیں چھریرے بادلوں میں اُسی طرح گھسی جا رہی ہیں جیسے کنول کی ڈنڈیاں شپا شپ کیچڑ میں در آتی ہیں۔ اور اب پھر آسمان کی آنکھوں سے جو چاند کے ہجر میں بیقرار ہے، آنسو جو کسی اور عالم کے معلوم ہوتے ہیں ٹپک رہے ہیں، بادل بلدیو[1] کی طرح سیاہ لباس پہنے اندر کے خزانے سے خوش آب موتیوں کی لڑیاں برسا رہا ہے اور مینھ کی بوندیں چور شیوں کے دل کی طرح صاف و شفاف ہیں ایسی تیز تیز کھڑکتی کھڑکاتی گر رہی ہیں جیسے آتشی مزاج آدمی کے ترکش سے تیر۔ بی بی دیکھو آسمان اپنے چہرے پر تاڑ کے سیاہ پتوں کا غازہ مل کر اور بادِ بہاری کے تازگی بخش جھونکوں کے معطر پنکھوں کی ہوا کھا کر بجلی کے ساتھ جو بے خوف اپنے محبوب کی طرف بڑھی چلی جا رہی ہے، کیسی گرمجوشی سے بغلگیر ہوتا ہے۔ (وسنت سینا) بجلی کے کوندنے سے ڈر کر چارودت کی چھاتی سے لپٹ جاتی ہے) چارودت (سینے سے لگا کر) او بادلو! گرجو بلکہ اور بھی زور شور سے گرجو جو تمھارے بے سُرے بھیانک راگ میں بھی مجھے نغمۂ دلفریب کا لطف آ رہا ہے۔ کیونکہ تمھاری ہی بدولت

---

[1] بلدیو۔ بلرام کا نام جو سری کرشن جی کے بھائی تھے۔

مجھے یہ دن نصیب ہوا اور میرا دل امید وصال سے سیراب ہوا۔
(گویا کہ بادل سے مخاطب ہوکر) او کالے منہ کے خبیث تو بھی بڑا ہی بدمعاش ہے کہ میری مخدومہ کو اپنی بجلیاں کوندا کر ڈرا دیا۔

چارودت - لعن طعن کا موقع نہیں ہے۔ پانی برستا ہے تو برسنے دو کیونکہ آسمان ابھی تک منہ چڑھائے ہوئے ہے اور بجلی تڑپ تڑپ کر ہر طرف سینکڑوں شعلے مشتعل کر رہی ہے۔ بادلوں نے حقیقت میں مجھ پر عجب احسان کیا ہے کہ مجھے اپنے من موہن سے ملا دیا۔ جس کے فراق میں بے قرار تھا۔ خوش نصیب بلکہ کچھ اس سے بھی زیادہ وہ لوگ ہیں جن کے گھروں کی چاردیواریاں اُس بُت شیریں کے کام کی موجودگی سے منوّر ہوں جس کی پوجا اُن کا ایمان ہے یا جن کے دستِ شوق اُن کے کپکپاتے جوبن کو اپنے گرم سینہ سے چمٹا سکیں۔ دیکھو پیاری آسمان پر اندر کی کمان جو اُن ہاتھوں کی طرح تنی ہوئی ہے جو پھیلتے پھیلتے تھک گئے ہوں، محراب بنا رہی ہے۔ آسمان انگڑائیاں لے لے کر اپنی بجلی کی زبان نکال اور ابر کی ٹھوڑی لٹکا رہا ہے اور یہ سب چیزیں ہم کو بھی زبان حال سے آرام لینے کا اشارہ کر رہی ہیں۔ پس چلو سو رہیں۔ مینھ کی بوندیں عجب سُریلے پن سے گر رہی ہیں اور تاڑ کے پتوں پر ٹپک اور زمین کے سنگریزوں سے ٹکرا اور بہتے چشموں میں ایسی خوش آیند سُر پیدا کر رہی ہیں جیسے کسی اچھے گلے یا بین سے نکلتے ہیں۔

(عزیز مرزا)



آنسو کی سرگذشت

جس طرح اُردو شاعری میں مستقل موضوع پر نظمیں لکھنے کا رواج
شروع سے بہت کم رہا۔ اُسی طرح نثر نگاری میں بہت کم ایسے لکھنے والے
ہوئے ہیں جنھوں نے کافی تعداد میں مادی۔ روحانی اور اُس کے
علاوہ اپنی روزانہ زندگی کی معمولی معمولی چیزوں اور باتوں پر مضامین
لکھے ہوں۔ خواجہ حسن نظامی نے اُردو انشار پردازوں میں سب سے
زیادہ اس روش کو اُردو میں رائج کیا اور چھوٹی سے چھوٹی اور معمولی
سے معمولی چیزوں پر اپنے رنگین انداز میں سیکڑوں مضمون لکھے ہیں۔
اُردو کو بہت ضرورت ہے کہ اُس میں اس طرح کے مضامین لکھنے والے
زیادہ سے زیادہ تعداد میں پیدا ہوں۔

جس دل میں درد نہیں اُسے انسان کے سینے میں نہ رہنا چاہئے۔
آنسو نشانِ درد ہے اور مجھ کو اُس کی سرگذشت بہت بھاتی ہے۔ زمانہ
کی خاطر اس کو قلمبند کر دیا گیا تاکہ سب درد آشنا دل دید کا لطف اٹھائیں۔

بچارا آنسو اُس گھر میں پیدا ہوا جہاں خوشی کی چہل پہل، اور شادی
کی گھما گھمی تھی۔ چاروں طرف سے مبارک سلامت کی آوازیں آرہی
تھیں۔ مگر جس ننھے سے دل میں اُس کا ڈیرا تھا، اُس کو شکم مادری
کی یاد نے گھیر رکھا تھا۔ آنکھیں بار بار اس وطن تاریک کو ڈھونڈتی
تھیں، اور مایوس ہو کر رہ جاتی تھیں۔ آخر دلِ نازک کو تاب نہ رہی۔

اُس میں درد کا ایک دھواں اُٹھا اور آنسوؤں کو زبردستی آنکھوں تک کھینچ لایا۔

یہ کشمکش مدّتوں آنسو کو درپیش رہی۔ اس کے بعد ایسا ہوا کہ بھرے پُرے گھر میں بربادی شروع ہوئی۔ پہلے باپ مرا اور پھر ماں بھی رخصت ہوگئی۔ ایک جوان لڑکی اور چھوٹا سا لڑکا زندہ بچا۔ باقی سب کا خاتمہ ہوگیا۔

لڑکی ہوشیار تھی۔ بار بار بے کسی و لاچاری کا خیال آتا، اور غمزدہ دل پر ایک ٹھیس سی لگتی۔ آنسو اُمنڈ اُمنڈ کر آتے۔ حسین و غمگین آنکھوں میں تیرنے لگتے، مگر یہ دُکھیاری اُن کو زبردستی پی جاتی تا کہ معصوم بھائی نہ دیکھ لے، اور اُس کے شکستہ دل کو صدمہ نہ پہنچے۔

کچھ دن تو یونہی گذرے۔ اس کے بعد لڑکی کی شادی ہوگئی۔ لڑکی پڑھی لکھی تھی۔ تعلیم یافتہ خاوند کو بہت عزیز ہوئی اور دونوں میں اخلاص و محبت کا رشتہ مضبوط قائم ہوگیا۔ یہ صورت دیکھ کر آنسو خلوت میں سدھارے اور اُن کی سرگذشت کا سلسلہ ملتوی ہوگیا۔

یکایک زمانے نے اپنی نیرنگی کا ورق اُلٹا، اور پیاری کا پیارا ساجن طاعون کا شکار ہوگیا۔ شوہر کیا مرا، یہ خود مرگئی۔ ہندو دھرم اور راجپوتی شرم کے پیام آنے لگے کہ زندگی ختم ہوگئی، اب اس آباد دُنیا میں تیرا کچھ حصّہ نہیں۔ اپنا چِت چِتا کی سُلگتی آگ میں لگا، وہی تیرے دُکھ کا خاتمہ کرے گی۔ چندرماں کی سُہانی چاندنی کو مست دیکھ اور برکھا رُت کی مستانہ ہوا سے اپنے دامن بچا، اور یقین کر کہ خوشی کے دن تیرے ساجن کے ساتھ چل گئے۔ بپتا کی ماری لڑکی دم بخود، چُپکی سُن رہی تھی، کہ دل میں ایک سنّاٹا سا آیا، درد کی ہلکی ہلکی

چمک ہونے لگی اور برسوں کے رُکے ہوئے آنسو اُبل پڑے۔ یہ آنسو نرالی شان کے تھے۔ اندرونی شورش نے ان کی رنگت نکھار دی تھی۔ سیاہ پلکوں سے ڈھلک کر زرد رُخساروں پر بہنا اور چمکنا ستم ڈھا رہا تھا۔ اب آنسوؤں کا دور دورہ تھا اور آنکھیں کا عمل دخل۔ اندھیری رات میں بیچاری جوان بیوہ کا کوئی ساتھ نہ دیتا۔ غریب اکیلی پڑی سسکیاں لیا کرتی تھی مگر اُس کے اصلی رفیق آنسو اُس سے ایک لحظہ کو بھی جُدا نہ ہوتے تھے۔

ایک دفعہ ہولی کے موسم میں ارمان بھری بیوہ اپنے رنگیلے پیتم کو یاد کرکے آنسو بہا رہی تھی اور اُس کی سُہاگن ہمجولیاں رنگ اُچھالتی، کلیلیں کرتی پھرتی تھیں اور اُس کی حالتِ زار پر کسی کو بھی رحم نہ آتا تھا۔ یہ بے ترسی دیکھ کر اُسے خیال آیا کہ مہاتما بُدھ نے سچ فرمایا ہے کہ کُل سنسار خود غرض، اور دُکھ کی پوٹ ہے۔ اس کی فانی خوبی پر نہ ریجھنا۔ اپنی ہنسی کے مطالعہ میں دل لگانا۔ اصلی سُکھ اور آنند ہے۔ یہ خیال آتے ہی بدنصیب لڑکی نے جی میں ٹھان لی کہ اب اُس جوتی سروپ سے دل لگانا چاہئے، جس نے ان جگجوں کو ظاہر کیا ہے۔ یہ سوچ کر ایک رات گھر سے نکل گئی اور گنجان جنگل میں آسن جما کر جا بیٹھی۔

لیکن جوں جوں حجابات دور ہوتے تھے دل میں میٹھا میٹھا درد ہوتا تھا اور آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکلے پڑتے تھے۔

اس لڑکی کا بیان ہے کہ جو لطف اس درد اور اس گریہ میں آتا ہے۔ وہ دُنیا کی سب خوشیوں سے افضل ہے۔ یہی آنسو ہیں جن پر اُس کی دلچسپ زندگی کا انجام ہوا۔

(حسن نظامی)

دیا سلائی

"آپ کون"؟ "ناچیز تنکہ"۔ "اسم شریف"؟ "دیا سلائی کہتے ہیں"۔
دولت خانہ؟ جناب دولت خانہ۔ اصلی گھر جنگل ویرانہ تھا، مگر چند روز سے
احمد آباد میں بستی بسائی ہے۔ اور سچ پوچھئے تو یہ ننھا سا کاغذی ہوٹل
جس کو آپ بکس کہتے ہیں، اور جو آپ کی انگلیوں میں دبا ہوا ہے، میرا
موجودہ ٹھکانا ہے۔

یہ "احمد آباد" ناروے یا سوئڈن کے پاس کوئی نیا مقام ہے؟
کیونکہ آپ کی بستیاں تو انھیں علاقوں میں سنی جاتی ہیں۔ نہیں جناب
"احمد آباد" ہندوستان میں ہے۔ آپ دیکھتے نہیں میری رنگت کالی
ہے۔ یہ اسی ملک کی نشانی ہے۔ ورنہ ناروے، سوئڈن کی دیا سلائی
گوری چٹی ہوتی ہے۔ مجھ غریب کو اس سے کیا نسبت؟

اہا! تو آپ ہمارے ملک کی دیا سلائی ہیں، تب تو آپ کا رنگ
سانولا ہے، مگر ہماری نگاہ میں سب دیا سلائیوں کی رانی ہو۔ "ذرا مہربانی
کرکے مجھ کو رانی نہ فرمائیے۔ "بیگم" کہئے۔ میں نے مسلمانوں کے گھر میں
جنم لیا ہے"۔

"بہت اچھا میاں تنکے ناراض نہ ہو۔ اللہ اکبر تم کو بھی یہ دن لگے
کہ "رانی" اور بیگم میں تمیز کرتے ہو۔ "مد کے آمدی کے پیر شدی"۔ وہ وقت
بھول گئے کہ زنجیروں میں باندھ کر مشین کے آرے کے نیچے رکھے جاتے
تھے، اور آرا آن کی آن میں تمھارے ٹکڑے کر ڈالتا تھا۔ اس کے بعد
جیسی گت بنتی تھی وہ خود خیال کرکے گریبان میں منہ ڈال سکتے ہو۔

تمھارے تراشیدہ کندوں کا ظلماتی گرم چشمے میں ڈالا جانا اور اُس کھولتے ہوئے پانی میں تمھارا تلملانا۔ کبھی سطح آب پر آنا۔ کبھی پھر تہ میں جا پڑنا، یہاں تک کہ اُسی دار و گیر اور پیچ و تاب میں تمھاری کھال تک اُتر جاتی تھی۔ اُس وقت کچھ دیر کے لئے باہر نکال کر تم کو دم دیا جاتا تھا۔ اُس کے بعد پھر مشین میں کس دیا جاتا تھا۔ اور مشین چھیل چھیل کے تمھارے لمبے لمبے پرت بنا دیتی تھی اور پھر وہ پرت دوسری کل میں ڈال کر کترے جاتے تھے۔ اس طرح اس حرکت میں تم جیسی ہزاروں ہستیاں عالم وجود میں آجاتی تھیں۔ زرد گندھک اور سُرخ مصالحہ کا لباس بھی کچھ عزت سے نہیں پہنایا جاتا تھا۔ بلکہ سرنگوں کر کے گرم گرم گندھک اور مصالحہ میں تمھاری ناک ڈبو دی جاتی تھی۔ اِس پر یہ مزاج کہ بیگم کہلانے کی آرزو۔ پیچپچی کی ڈبیا میں رہتے رہتے یہ دماغ ہوگیا۔ ابھی کوئی شخص بکس کی کالی مٹی سے مُنڈیا رگڑ کے پھینک دے گا۔ پھر جو آئے گا پاؤں میں مسلتا آئے گا۔

حضرت آپ کو تو غصہ آگیا۔ خفگی کی کیا بات ہے، جو چیز جہاں ہو اُسی سے منسوب ہوتی ہے۔ میں مسلمانوں کی خانہ زاد ہوں۔ اگر "راتی" کے مقابلہ میں 'بیگم' کے لفظ کو پسند کروں تو کیا گناہ ہے۔ یہ سب نام کی بحث ہے، کام دیکھنا چاہئے۔ سو جیسا مسلمانوں کا کام کرتی ہوں، بے کم و کاست ہندوؤں کا بھی بجا لاتی ہوں۔ یہاں تک کہ میرے مذہب میں دیسی بدیسی، گورے کالے، کا فرق بھی جائز نہیں۔ مندر میں میرے دم سے روشنی ہے، اور مسجد میں بھی۔ راجہ اور نواب کے محل کی تاریکی بھی دور کرتی ہوں، اور ایک غریب کے جھونپڑے میں بھی میرے سبب اُجالا ہو جاتا ہے۔ رہی یہ بات کہ بے حقیقت ہوں اور بے بسی کے عالم میں

انسانی کلوں سے عرصہ تک بے کل رہی ہوں، تو یہ کچھ مجھی پر منحصر نہیں۔ آپ پر بھی یہ بپتا پڑ چکی ہے۔ بلکہ آپ کی مجھ سے زیادہ دُرگت ہوئی ہے۔ کیا یاد نہیں کہ پریم کی آری نے شجر راز سے کاٹا۔ اور نو مہینے شکمِ مادر کے چشمہ میں آپ بھی جوش کھاتے رہے۔ اور پھر برسوں پریت دریت کے چکر میں گردش رہی۔ میرے "رانی" اور "بیگم" کے لفظ سے اتنے چونکے۔ ذرا اپنی ہٹ دھرمی کو دیکھئے کہ فقط نام اور لفظ کے فرق سے آپ کے کاموں میں بھی فرق پڑ جاتا تھا۔ جو کالا کرتا ہے وہ گورا نہیں کرنا چاہتا۔ جو مسلمان کو پسند ہے اُس سے ہندو کو نفرت ہے اور غریب و کمزور ہونا تو گویا دائرۂ آدمیت سے خارج ہو جاتا ہے۔ اُس کو دُنیا میں رہنے اور انسان کہلانے کا کوئی حق باقی نہیں رہتا ہے۔

"بس بس خاموش رہو بی فتنی! ہو تو اتنی ذرا سی، مگر زبان بارہ ہات کی ہے۔ لگیں حد سے گزرنے۔ تم کیا جانو کہ آدم زاد کی کیا عالی شان ہے!"

مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہوئی ہو تو قرآن میں سُنا ہو گا کہ خُدا نے آدمی کو زمین میں اپنا خلیفہ بنایا ہے اور تمام اسرار کا علم اُس کو بخشا ہے۔ پس یہ جو کچھ کرتا ہے، عین منشائے الٰہی کے مطابق کرتا ہے۔ کیونکہ سب کاموں کی حقیقت اُس کو معلوم ہے۔"

اوہو! آپ کو یہ غرّہ بھی ہے۔ بیشک آپ خلیفۂ خدا ہیں۔ مگر سب چیزوں کی حقیقت آپ کو معلوم نہیں۔ قرآن میں تو یہ آیا ہے کہ آدمی کو سب چیزوں کے نام بتائے گئے ہیں۔ یہ کہاں ہے کہ اصلیت بھی بتا دی گئی ہے۔ اگر اصلیت اور حقیقت معلوم ہے تو بتاؤ کہ بجلی کیا چیز ہے؟ وہ تو غلاموں کی طرح آپ کی خدمت کرتی ہے، اور اُس کی

تابعداری پر آپ کو گھمنڈ بھی بہت بڑا ہے، مگر آج تک آپ کو یہ خبر نہیں کہ یہ کیا چیز ہے اور چند حرکتوں سے کیوں کر ظاہر ہو جاتی ہے۔"

"خیر بجلی تو بڑی چیز ہے، تنکے کے اسرار سے بھی آپ ناواقف ہیں کہ ذرا سی رگڑ میں یہ نورانی شعلہ کہاں سے آجاتا ہے۔ محض غلط ارشاد ہے کہ آپ کے سب کام عین مرضی الٰہی کے مطابق ہوتے ہیں۔ خدا کی ہوا عام ہے۔ پانی اور روشنی عام ہے، جنگل اور دریا عام ہیں۔ مگر آپ کی ذات شریف ان سب چیزوں کو اپنے لئے مخصوص کر لینا چاہتی ہے۔ آپ کی خواہش ہوتی ہے کہ روٹی، پانی، ہوا، سب میرے قبضے میں ہوں جس کو چاہوں دوں اور جس کو چاہوں محروم کر دوں۔ ایک آدمی کروڑوں روپئے خزانوں میں بند رکھتا ہے اور لاکھوں آدمی بھوک سے مر جاتے ہیں۔ مگر وہ خود غرض کچھ پروا نہیں کرتا۔ اپنی ہوس اور طمع کے جوش میں، نام اور نشان کے شوق میں، لاکھوں ہم جنسوں کو فنا کر ڈالتا ہے تو کیا خدائی خلافت کا ان ہی اعمال سے دعویٰ کیا جاتا ہے، اور کیا یہ باتیں منشائے پروردگار کے موافق ہیں؟ حضرت آپ ہزاروں، لاکھوں سجدے کرتے ہیں مگر آپ کا سرکش وجود ویسا کا ویسا ہی باقی موجود رہتا ہے مجھ کو دیکھئے کہ ایک ہی سجدے میں مقبول ہو جاتی ہوں۔ اور تجلّی اس چھوٹی سی شکل کو جلا کر خاک کر دیتی ہے۔"

"خدا تمھاری طرّار زبان کو چلاتا رکھے۔ میں ہارا، تم جیتیں۔ اچھا لاؤ اندھیرا زیادہ ہو گیا میرے کلبۂ تاریک کو تجلّیٔ راز سے روشن کر دو۔

(حسن نظامی)

اُردو شاعری پر پہلا عام اعتراض

مولانا حالیؔ کی تصنیف شعر و شاعری، نے جو حقیقت میں اُن کے دیوان کا ایک طویل اور عالمانہ مقدمہ ہے جہاں لوگوں کی معلومات کے خزانے میں بیش بہا موتیوں کا اضافہ کیا وہاں دوسری طرف بدگمانیوں کی ایک اچھی خاصی زنجیر بنا کر رکھ دی۔ جس کے پھندے میں پھنس کر اُردو شاعری طرح طرح کی بُرائیوں کا مجموعہ نظر آنے لگی۔ حقیقت میں مولانا حالیؔ کا مقصد بھی اصلاحی تھا، لیکن اس اصلاح میں ذرا سی تیزی تھی۔ مولانا مسعود حسن نے ایک کتاب ہماری شاعری، لکھی اور اُس میں اُن تمام اعتراضات سے مفصل بحث کی ہے جو عام طور پر اُردو شاعری پر کئے جاتے ہیں اور نہایت دلکش اور عالمانہ انداز میں یہ بتایا ہے کہ کس طرح اُردو شاعری پر اعتراض کرنے والے محض ناواقفیت اور بے توجہی کی وجہ سے ایسے اعتراضات کے طلسم باندھتے ہیں جن سے حقیقت میں اُردو شاعری کو دور کا لگاؤ بھی نہیں ہے۔ تعصب اور تنگ نظری نے اُس پر ایسے رنگ چڑھا دئے ہیں جو اُس پر بدنما داغوں کی طرح چمکتے ہیں۔ مسعود صاحب نے تحقیق کی جِلا سے اُن بدنما داغوں کو دور کرنے کی کوشش کی ہے۔ موجودہ مضمون اس کتاب کا ایک مختصر سا حصّہ ہے۔

اُردو شاعری بہت محدود ہے۔ اس میں کچھ گُل و بُلبُل کی کہانیاں ہیں، کچھ عشق و محبت، ہجر و وصل کی داستانیں ہیں۔ کچھ دُنیا کی بے ثباتی کا ذکر

ہے۔ کچھ فلک کی شکایت اور نصیبوں کا رونا ہے۔ اللہ اللہ خیر صلاح۔

انصاف اس اعتراض کی وسعت اور ہمہ گیری سے سوال کرتا ہے کہ کیا معترضوں نے اُردو شاعری کے پُر بہار باغ کے چمن چمن کی سیر کی ہے۔ کیا ہماری شاعری کے ہر خط و خال پر نظر ڈالی ہے۔ کیا یہ سمجھ لیا ہے کہ اُردو زبان حالات کے نقشے اور خیالات کی تصویریں کس کس طرح کھینچتی ہے؟ کیا یہ امتیاز کر لیا ہے کہ شاعرانہ بیان اور عامیانہ زبان میں کیا فرق ہوتا ہے؟ جواب کون دے اور کیا دے؟ دو چار غزلیں کسی ایسے ویسے شاعر کی دیکھ لیں۔ مطلب اپنے دل سے اُلٹا سیدھا لگا لیا۔ اور اعتراضوں کا پوٹ بغل میں دبا کر نقادوں کی صف میں آ کھڑے ہوئے، اپنی زبان سے یہ لاعلمی اور اس لاعلمی پر یہ دعویٰ! سخن فہمی کے ایسے مدعیوں میں گھر کر اُردو شاعری مرزا غالب کی زبان سے فریاد کرتی ہے ؎

بیا ورید گرایں جا بود زباں دانے   غریب شہر سخنہائے گفتنی دارد

اس اعتراض کا ایوان غلطیوں اور غلط فہمیوں کے چار ستونوں پر قائم ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ ان کی بنیاد تنقید کے سیلاب کا مقابلہ کر سکتی ہے یا نہیں۔

پہلی غلطی یہ اعتراض اُردو شاعری کے دائرے کو تنگ کر کے غزل میں محدود کر دیتا ہے۔ بیشک غزل ہی ہماری شاعری کی وہ صنف ہے جس کی خصوصیتیں ہر نگاہ کو اپنی طرف کھینچتی ہیں، ہر دل میں گھر کرتی ہیں، ہر زبان کو لذّت دیتی ہیں، اور ہر محفل کو گرماتی ہیں۔ مقدار کے لحاظ سے بھی شاعری کی ہر صنف سے غزل کا پلّہ بھاری ہے۔ مگر رباعیاں، قطعے، قصیدے، مثنویاں، واسوخت، ناٹک،

سلام، مرثیے اور مسلسل نظمیں بھی کچھ کم نہیں، بلکہ مجموعی حیثیت سے غزلوں سے کہیں زیادہ ہیں۔ لیکن کوتاہ نظری کا بھلا ہو کہ اُردو شاعری پر بحث کرتے وقت اِن تمام صنفوں کا خیال دماغ کے کسی گوشہ میں بھی موجود نہیں ہوتا، اور مرثیوں کا تو گویا اُردو شاعری میں شمار ہی نہیں۔ حالانکہ اُردو کے خزانہ میں ایک مرثیہ ہی وہ بیش بہا گوہر ہے کہ اگر شاعری کے بازار میں ہماری زبان صرف اِسی جنس کو لے کر جا کھڑی ہو تو نگاہ دار جوہریوں کی نظر میں کسی زبان سے کم سرمایہ دار نہ ٹھیرے۔ واقعہ نگاری، جذبہ نگاری، سیرت نگاری اور منظر نگاری، غرضکہ شاعری کے ملک میں کون سا سکّہ رائج ہے کہ مرثیے کا خزانہ اُس سے خالی ہے۔ ہماری شاعری کی اور صنفیں بھی تہی دست نہیں ہیں۔ اُن کی جیبیں بھی انواع و اقسام کے جواہرات سے بھری ہوئی ہیں۔

اگر ہماری شاعری کے وسیع چمنستان کے ایک ایک تختے کی سیر کی جائے اور ہر پھول کا رنگ امتیاز کی آنکھوں سے دیکھا جائے تو معلوم ہو کہ اس باغ میں کتنے اور کتنی طرح کے پھول ہیں کہ اپنی اپنی بہار دکھا رہے ہیں۔ جی تو چاہتا تھا کہ ہر رنگ کے دو دو، چار چار پھول لے کر ایک گلدستہ بناؤں کہ اعتراض کی آنکھیں روشن ہوں، مگر اس کام کے لئے سخت محنت اور برسوں کی فرصت درکار ہے۔ اگر زندگی نے وفا اور فرصت نے مساعدت کی تو یہ کام بھی ہو رہے گا۔

دوسری غلطی

ایک عام خیال ہے کہ غزل کے ہر شعر میں عشقیہ مضامین باندھے جاتے ہیں۔ بالخصوص جن شعروں میں، یار، دوست، محبوب، ظالم، قاتل، بیداد گر، یا اسی قبیل کے اور لفظ

آتے ہیں اور جن شعروں میں کسی کا صاف طور پر ذکر نہیں ہوتا، صرف ضمیروں کے اشارے ہوتے ہیں، وہ سب کے سب عاشق و معشوق کے باہمی تعلقات بیان کرتے ہیں۔ یہ ایسی غلطی ہے جس سے ادعائے سخن فہمی کا دامن اکثر داغ دار نظر آتا ہے۔ اگر غزل صرف عشقیہ مضامین کے لئے مخصوص ہوتی تو بھی جو لوگ محبت کے مفہوم اور عشق کی دُنیا کی وسعت سے واقف ہیں، اُن کی نگاہوں میں غزل کا دائرہ بہت تنگ نہ ٹھہرتا، مگر حقیقت یہ ہے کہ غزل میں عاشق و معشوق کے تعلقات کے علاوہ ظالم و مظلوم، حاکم و محکوم، خادم و مخدوم، مختار و مجبور، خالق و مخلوق وغیرہ کے باہمی تعلقات بھی دکھائے گئے ہیں۔

غزل حقیقت میں جذبات کا مرقّع ہے۔ اس کا ہر شعر کسی انسانی جذبے کی تصویر ہے۔ اور انسان کے جذبات اپنی نیرنگیوں میں شمار کی حد سے نکل جاتے ہیں۔ اس لئے بے شمار مضامین غزل کے شعروں میں موجود ہیں۔ مگر انھیں سمجھنے کے لئے شاعر کی زبان سمجھنا ضروری ہے۔ ذیل کی مثالیں بتائیں گی کہ شاعرانہ اور غیر شاعرانہ انداز بیان میں کیا فرق ہوتا ہے۔ یہ مثالیں اخلاقی مضامین سے لی گئی ہیں، اس لئے کہ اخلاق کی تعلیم میں انداز بیان کا یہ فرق بہت صاف نظر آتا ہے۔

پہلی مثال

انکسار کی تعلیم دینا ہو تو ایک غیر شاعر کہے گا "بڑی سے بڑی حکومت پر بھی غرور نہ کرنا چاہیئے۔ نہ دولت کو قیام ہے نہ حکومت کو بقا۔ بڑے سے بڑے دولت و حکومت والے چند روز کے بعد خاک میں مل کر خاک ہو جاتے ہیں۔" لیکن شاعر یہی تعلیم ان

لفظوں میں دیتا ہے ؎

کاش یہ جمشید کو معلوم ہوتا جام میں　　کاسۂ سر کاسۂ دستِ گدا ہو جائے گا

دوسری مثال استغنا کی طرف مائل کرنا ہو تو ایک غیر شاعر کہے گا کہ اپنی کملی میں مست رہو۔ کسی کے سامنے سر نہ جھکاؤ۔ کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلاؤ۔ جس حال میں ہو اُسی میں خوش رہو۔ لیکن شاعر یہی مطلب یوں ادا کرتا ہے :-

دلِ پُر خوں کی اک گلابی سے　　عمر بھر ہم رہے شرابی سے　(میر)

تیسری مثال قناعت کی تعلیم دینا ہو تو ایک غیر شاعر کہے گا کہ "حرص و ہوس کو چھوڑو۔ قناعت کے ساتھ زندگی بسر کرو۔ توکل کی وہ عادت ڈالو کہ سوال کے لئے ہاتھ اُٹھ بھی نہ سکیں" لیکن شاعر یہی تعلیم یوں دیتا ہے :-

آگے کسو کے کیا کریں دستِ طمع دراز　　وہ ہاتھ سو گیا ہے سرہانے دھرے دھرے

چوتھی مثال دوسروں کے جذبات کا احترام کرنا سکھانا ہو تو غیر شاعر کہے گا کہ "جو کام کرو خوب غور کر کے کرو۔ جو بات کہو، سوچ سمجھ کے کہو۔ ایسا نہ ہو کہ تمھاری ذات سے کسی کو نقصان پہنچے۔ ایسا نہ ہو کہ تمھاری بات سے کسی کا دل دُکھے۔ دنیا کے معاملات بہت نازک ہوتے ہیں۔ ذرا سی غفلت میں کام بگڑ جاتا ہے" لیکن شاعر اسی مفہوم کو یوں ادا کرتا ہے :- ؎

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہِ شیشہ گری کا　(میرؔ)

جو لوگ ہمارے شاعروں کی زبان سمجھتے ہیں وہ اس حقیقت سے

بے خبر نہیں ہیں کہ اُردو غزل عشق و محبّت میں محدود نہیں ہوتی بلکہ گوناگوں جذبات اور رنگا رنگ خیالات کا گلدستہ ہوتی ہے۔

اب رہی واقعہ نگاری اور منظر نگاری تو یہ چیزیں غزل کے احاطے سے خارج ہیں۔ شمس العلما، مولوی امداد امام صاحب اثرؔ عظیم آبادی غزل کی تعریف میں لکھتے ہیں :-

"اصطلاح میں اس (غزل سے) وہ صنف شاعری مُراد ہے کہ جس میں ایسے مضامین جو اعلیٰ درجہ کی واردات قلبیہ اور ارفع درجے کے امورِ ذہنیہ سے خبر دیتے ہیں۔ حوالۂ قلم کئے جائیں .... اس صنعت کا یہی تقاضا ہے کہ امور داخلی کے سوا امور خارجی قلمبند نہ ہوں اور اگر ہوں بھی تو داخلی پہلو کی آمیزش سے خالی نہ ہوں"

اس بیان سے ظاہر ہے کہ غزل کے لئے کچھ حدیں بندھی ہوئی ہیں۔ مگر "وارداتِ قلبیہ" اور "اُمورِ ذہنیہ" کی کوئی تعداد معیّن نہیں کی جاسکتی۔ اس لئے غزل محدود ہونے پر بھی غیر محدود ہی رہی۔ منشی جگت موہن صاحب رواںؔ[1] نے کیا خوب کہا ہے۔

اللہ اللہ ری یہ وسعتِ دامانِ غزل   بُلبُل و گُل ہی پہ موقوف نہیں شانِ غزل
ختم پہنائے دو عالم پہ ہے پایانِ غزل   پوچھئے حافظؔ شیراز سے امکانِ غزل
منبط ہے آئینۂ رازِ حقیقت اس میں   یہ وہ کوزہ ہے کہ دریا کی ہے وسعت اِس میں

تیسری غلطی

اکثر لوگ شعر کا مطلب یوں سمجھنا چاہتے ہیں، جیسے کوئی فلسفے کا مسئلہ سمجھتا ہے۔ یہ نہیں جانتے کہ فلسفہ عقل کا بیان ہے اور شاعری جذبات کی زبان ہے۔ فلسفہ کو جو رشتہ دماغ سے ہے

[1] اُناؤ کے رہنے والے ایک اُردو کے مشہور شاعر جن کا انتقال ۱۹۳۴ء میں ہوگیا۔

شاعری کو وہی تعلق دل سے ہے، فلسفی کا قول اگر کسی واقعہ کا بیان ہوتا ہے تو بیان واقعہ ہی اس کا اصل مقصود ہوتا ہے۔ لیکن شاعر جب کوئی واقعہ بیان کرتا ہے تو بیان واقعہ اُس کا مقصود اصلی نہیں ہوتا بلکہ وہ جذبات جو اس واقعہ کے ساتھ وابستہ ہیں۔ یا وہ اثر اس واقعہ سے دل پر پڑتا ہے، چکبست لکھنوی کا ایک نہایت مشہور شعر ہے :۔

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہورِ ترتیب   موت کیا ہے اِنھیں اجزا کا پریشاں ہونا

اس شعر کی تعریف اکثر لوگ اس بنا پر کرتے ہیں کہ اس میں شاعر نے حیات و ممات کا فلسفہ بیان کیا ہے اور دو لفظوں میں بتا دیا ہے کہ زندگی کیا ہے اور موت کس کو کہتے ہیں۔ لیکن مذاقِ سلیم کہتا ہے کہ اگر یہ شعر حیات و موت کا نرا کھرا فلسفہ ہے، تو نہایت ناقص ہے اور اگر قابلِ تعریف نہیں ہے تو لائقِ تحسین بھی نہیں ہے۔ اصل یہ ہے کہ اس شعر میں شاعر نے زندگی اور موت کی حقیقت نہیں، بے حقیقتی دکھائی ہے۔ کہتا ہے کہ نہ زندگی کی کچھ حقیقت ہے اور نہ موت کی کچھ اہمیت۔ عناصر کے نامحدود ذخیرے میں سے کبھی کچھ عنصر ایک خاص ترتیب سے جمع ہو جاتے ہیں، کبھی منتشر ہو جاتے ہیں۔ پہلی حالت کا نام زندگی رکھ لیا گیا ہے دوسری کا موت۔ اور یہ فطرت کے معمولی کرشمے ہیں جو ہر لمحہ ظاہر ہوا کرتے ہیں۔ پس زندگی پر مرنا کیا اور موت سے ڈرنا کیسا؟ اب واضح ہو گیا کہ اس شعر میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ مقصود بالذات نہیں ہے بلکہ مقصود وہ اثر ہے جو اس بیان سے دل پر پڑتا ہے۔

جو لوگ فلسفیانہ اور شاعرانہ کلام کا یہ نازک فرق نہیں جانتے ہیں وہ شعر کے لفظوں سے گذر کر شاعر کے جذبات تک نہیں پہنچ سکتے۔

اور جو شعر لفظوں کے اعتبار سے کچھ ملتے جلتے ہوتے ہیں اُنھیں مفہوم کے لحاظ سے بھی یکساں سمجھ لیتے ہیں۔ انھیں لوگوں کا قول ہے کہ اُردو شاعری میں گل و بلبل کے افسانوں کے سوا اور کیا ہے؟ اس قول سے صاف ظاہر ہے کہ جن شعروں میں "گل" اور "بلبل" کے الفاظ آتے ہیں، اُن کے نزدیک وہ سب گل و بلبل ہی کے افسانے سناتے ہیں اور ایک ہی چیز کو اُلٹ پلٹ کر دکھاتے ہیں۔ مگر ان کے اس خیال میں سخن فہمی کو حیرت ہے کہاں یہ قول کہ اُردو شاعری میں گل و بلبل کے سوا کچھ نہیں اور کہاں یہ حقیقت کہ انھیں کہانیوں میں سب کچھ ہے۔

اُردو کے شاعروں نے (تُک بندوں کا ذکر نہیں) گل و بلبل کا حال شاید ہی کبھی لکھا ہو۔ گل و بلبل کے پردے میں ہمیشہ انسانی زندگی کا کوئی واقعہ بیان کیا ہے۔ یا انسانی فطرت کا کوئی راز کھولا ہے۔ مَیں اپنے تجربے اور مشاہدے سے چند واقعات لکھتا ہوں۔ ہر واقعہ کے بعد ایک شعر بھی لکھوں گا۔ جس میں شاعر نے اس واقعہ کو گل و بلبل کے پردے میں بیان کر دیا ہے۔

پہلا واقعہ میری والدہ مرحومہ کو فطرتاً میری بہن کی شادی کا بڑا ارمان تھا۔ لیکن اُن کی ناگہانی موت نے یہ ارمان پورا نہ ہونے دیا۔ اُن کے انتقال کے بعد اُس کی شادی کا وقت آیا۔ بہت دھوم دھام تو میرے امکان میں نہ تھی۔ لیکن جو کچھ ہو سکتا تھا اُس میں کمی بھی نہیں کی۔ گھر مہمانوں سے بھرا ہوا تھا۔ خوب چہل پہل تھی میرے اصول کے خلاف کچھ گانا بجانا بھی ہو رہا تھا۔ یہ سب کچھ تھا مگر مجھے ہر طرف ایک ویرانی سی معلوم ہوتی تھی۔ ہر جگہ والدہ کی موجودگی کی ضرورت محسوس ہوتی

تھی۔ یہاں تک کہ جس مردانے کمرے میں میرا اور بعض احباب کا قیام تھا اور جس میں وہ اگر زندہ ہوتیں تو کبھی نہ ہوتیں اُس میں بھی میری آنکھیں اُنھیں کو ڈھونڈتی تھیں۔ اور اُن کے نہ ہونے سے سنّاٹا معلوم ہوتا تھا۔ اب یہ شعر پڑھئے۔ اور دوسرے مصرعہ میں "ہر" کا جو لفظ آگیا ہے اُس کے معنی سمجھئے۔

آئی بہار گلشن گُل سے بھرا ہے لیکن
ہر گوشۂ چمن میں خالی ہے جائے بلبل
(میر)

دوسرا واقعہ میرے وطن میں ایک بزرگ میر وزیر علی صاحب مرحوم تھے۔ آدمی کچھ زیادہ پڑھے لکھے تو نہ تھے لیکن صحبت یافتہ اور نہایت خوش تقریر تھے۔ اُن کی گفتگو میں فارسی کے شعر اور مثلیں، قرآن کی آیتیں اور حدیث کے فقرے دیکھ کر ہر شخص کو اُن کے مبلغ علم کے بارے میں دھوکا ہو سکتا تھا۔ عالم پیری میں نوجوان نواسے نے جس کا نام شمشاد علی تھا، داغِ مفارقت دیا۔ میر صاحب مرحوم گلیوں میں، باغوں میں۔ اُس کا نام لے لے کر پکارتے پھرتے تھے۔ راہ گیروں سے اُس کا پتہ پوچھتے پھرتے تھے۔ اِس حالت کو نظر میں رکھئے اور یہ شعر پڑھئے ؎

ہمارے بعد یہ ہے حال ہمصفیروں کا — اس آشیاں میں صدا دی اُدھر پکار آئے

تیسرا واقعہ ایک صاحب اپنی شادی کے "چند" ہی روز بعد تحصیلِ علم کے شوق میں ایک دوسرے شہر چلے گئے اور یہ عہد کر لیا کہ جب تک تعلیم ختم نہ کرلوں گا گھر کا رُخ نہ کروں گا۔ ایک مدّت گذر گئی اور اُن کا عہد نہیں ٹوٹا۔ نئی دُلہن کی نظروں میں جدائی کی یہ طویل

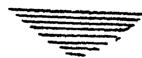
مدّت فطرتاً اور بھی طویل ہوگئی ۔ انتظار کی انتہا اور ضبط کی حد ہوتی ہے۔ آخر وہ حد بھی ختم ہوگئی ۔ بند ٹوٹ گیا اور ٹھہرا ہوا دریا بہ نکلا ۔ اُس کے جذبات کی آندھی نے رسمی حجاب کا پردہ اُلٹ دیا ۔ اُس نے اپنے شوہر کو خط لکھا جس میں مختلف طریقوں سے اُسے گھر آنے کی ترغیب دی منجملہ اُن کے ایک لطیف اشارہ اس بات کی طرف بھی تھا کہ حسن اور جوانی چلتی پھرتی چھاؤں ہے ۔ اگر یہ زمانہ یوں ہی جدائی کی کلفتوں میں گذر گیا تو پھر ساری عمر اس کی تلافی نہ ہوسکے گی ۔ اب دیکھئے کہ شاعر گُل و بلبل کے پردے میں اس واقعہ کو کیوں کر بیان کرتا ہے ۔

مُرغانِ چمن سے پھولوں نے اے شاد یہ کہلا بھیجا ہے

آنا ہے اگر تو آجاؤ ایسے میں ، ابھی شاداب ہیں ہم

طوالت کے خوف سے اِنھیں تین مثالوں پر اکتفا کرتا ہوں ۔ گُل اور بُلبُل اِن دو لفظوں سے شاعروں نے جو جو چیزیں مُراد لی ہیں اُن کی تفصیل کے لئے ایک ضخیم دفتر چاہیئے ۔ اُردو اور فارسی شاعری میں گُل و بُلبُل کا قریب قریب وہی حال ہے جو یورپی زبانوں کی شاعری میں دیومالا کی دیویوں اور دیوتاؤں کا ہے ۔ اس لئے جتنے شعروں میں گُل و بُلبُل کا ذکر آیا ہے اُن سب کو یکساں سمجھنا غلطی ہے ، اور بہت بڑی غلطی ہے ۔

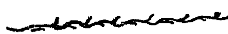
(مسعود حسن رضوی)



سفرنامۂ حجاز

مولانا عبد الماجد کی مشہور اور تازہ ترین تصانیف میں سے سفرنامۂ حجاز ہے جو اُردو نثر نگاری کا ایک عمدہ نمونہ ہونے کی حیثیت سے بے حد مقبول ہو چکا ہے۔ یہ مضمون اسی سفرنامہ کا ابتدائی حصّہ ہے۔

ہندوستان کے طول و عرض میں بے شمار سفر، بہ ضرورت اور بلا ضرورت کر ڈالے، لیکن جو ایک ہی جگہ سفر کرنے اور حاضری دینے کی تھی وہاں سر کے بل کُجا، پیروں کے بل بھی جانا نصیب میں نہ آیا۔ بنگلوں اور کوٹھیوں، حویلیوں اور ڈیوڑھیوں کے گرد چکّر لگانے میں ایک عمر گزر گئی، پر وہ آستان پاک جو اس قابل تھا کہ اُس کے گرد طواف کرنے میں ساری عمر تمام کر دی جاتی اور اس پر پروانہ وار جان نثار کر دی جاتی، گردش تقدیر نے محروم کر رکھا تو اسی کی جبیں سائی سے۔ مُلک کے گوشہ گوشہ کی سیر کر ڈالی۔ پر نہ توفیق ہوئی تو ایک اس سرزمین کی زیارت سے مشرف ہونے کی، جس کی سربلندی پر آسمان کو بھی رشک ہے۔ جہاں کھڑے ہو کر اللہ کے خلیل نے اپنے رب کی توحید کی منادی کی تھی اور جس ریگ کے ذرّوں پر اللہ کے حبیب کے نقش قدم آج تک ثبت ہیں۔



محرومیوں کی حکایت دراز، اور کوتہ سنجیوں کا سلسلہ طویل لیکن، رحمت باری بے حساب اور فضلِ خداوندی بے کراں، بڑے سے بڑے مجرم

اپنی سیہ کاریوں کی پوٹ لے کر آئے اور بحرِ کرم کے ایک قطرہ نے سارے دفتروں کی سیاہیاں دم بھر میں سفیدی سے بدل دیں۔ روتے کانپتے آئے اور ہنستے کھلکھلاتے واپس گئے، اقلیمِ سخن کے تاجدار خسرو نامدار نے اِس مضمون کو یوں ادا کیا ہے ؎

قطرہ ز آبِ رحمت تو بس است　　شستش نامۂ سیاہ ہمہ

اور ایک دہقانی کج مج زبان نے اپنی بولی میں یوں عرض کیا ہے ؎

سمجھے تھے سیہ کاری اپنی ہے فزوں حد سے
دیکھا تو کرم تیرا اس سے بھی سوا پایا

بالآخر جس کی رحمت ابرِ کرم بن کر سوکھے کھیتوں کو آن کی آن میں سرسبز و شاداب کر دیتی ہے، اُس کی مشیت اس کی متقاضی ہوئی کہ ایک محرومِ عمل، مردہ قلب کو اپنے حرم محترم کی حاضری و طواف، اور اپنے حبیب پاک کی آرامگاہ کی زیارت سے مشرف فرمائے۔ چنانچہ ارادہ ہوا، منصوبے باندھے۔

اللہ اللہ! کجا ایک ننگ خلائق اور کہاں وہ قدوسیوں اور نورانیوں والی سرزمین! کہاں ایک روسیاہ کے ناپاک قدم اور کہاں وہ معصوموں اور ملکوتیوں کی سجدہ گاہ! ایاز قدر خود بشناس، عقل اس خوش قسمتی پر دنگ، خرد اس بوالعجبی پر حیران!

ہے آرزو کہ ابروِ پُرخم کو دیکھئے　　اس حوصلہ کو دیکھئے اور ہم کو دیکھئے

لیکن ربوبیت کے عجائب کاروبار ہیں، اپنا نام رب العالمین ارشاد فرمایا ہے، رب الصالحین نہیں فرمایا۔ مرتبۂ کمال پر صرف اتقیاء و صالحین ابرار و اخیار ہی نہیں پہچانے جاتے، ربوبیت کا تعلق اشرار و فجار سے ہے۔

دستگیری صرف نیکوں ہی کی نہیں، بدوں اور بدتر سے بدتر بدوں کی بھی ہوتی رہتی ہے۔ ہوائے بہار جب چلتی ہے۔ تو چمن کے خوشبودار پھولوں اور چراگاہ کی گھاس کی پتّیوں دونوں کو مہکا دیتی ہے۔



غرض نیت قائم ہوچکی ہے، حج کے مہینے تین ہیں۔ شوال، ذی قعدہ، وعشرۂ اوّل ذی الحجہ، جس تاریخ کو ماہ مبارک رمضان ختم ہوتا ہے۔ ٹھیک اُس تاریخ سے موسم حج کی ابتدا ہوجاتی ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ، یکم شوال کو گھر سے نکلنا ہوگا اور ۳ شوال کو ۱۰ بجے شب کے اکسپرس سے لکھنؤ سے بمبئی کے لئے روانگی، اور ۵ شوال کو بمبئی پہونچکر مغل کمپنی کے پہلے جہاز سے عزم سفر، پہلے زیارتِ دیارِ حبیب و حاضریٔ روضۃ الانور، جتنے دنوں تک بھی قسمت یاوری کرے۔ پھر آغاز ذی الحجہ میں فریضۂ حج کے لئے مکہ معظمہ بعد ادائے فریضہ قصد مراجعت، اور اگر زندگی باقی ہے تو انشاء اللہ اول عشرۂ محرّم میں واپسیِ وطن۔ یہ سارے ارادے اپنے ہیں اور بندوں کو اپنے ارادوں کے نفاذ پر جو قدرت ہے، اُس کا حال معلوم۔ ہوگا وہی جو کچھ بندہ کا چاہا نہیں، بلکہ بندوں کے پروردگار و مالک کا چاہا ہوگا۔ کیا ایک مُشتِ خاک اور کیا اُس کے ارادے، ارادہ کا حق تو اُسی کا ہے جس کے ہاتھ میں موت و زندگی، عافیت و سلامتی کی کنجیاں ہیں۔ مولا کی شانِ کریمی دیکھئے کہ مولانا مناظر احسن صاحب جیسے صاحبِ ذوق و صاحبِ علم بزرگ اور بعض اور عزیزوں اور مخلصوں کی محبت کی سعادت اور رفاقت کی دولت بھی نصیب میں آرہی ہے، انشاء اللہ العزیز۔

روانگی بمبئی

عید ہر سال آتی ہے، اب کی عید ہر سال کی معمولی عید نہ تھی۔ کسی کے آستانے پر ذوقِ جبیں سائی دل کو بیتاب کئے ہوئے تھا کسی کے دربار کی حاضری کا دن ایک ایک کرکے گِنا جارہا تھا۔ رمضان ختم ہوا، عید آئی، انتظار کی گھڑیاں کٹیں، وعدۂ دیدار پورا ہونے کی ساعت آئی۔ ہجر کے بعد وصل، مہجوری کے بعد حضوری، انتظار کے بعد دیدار، پیاس کے بعد سیرابی، جس کارفرمائے فطرت نے ازل سے یہ قانون رکھ دیا ہے، اُس نے ماہِ مبارک کا خاتمہ موسمِ حج کے آغاز پر رکھا ہے۔ حج کا مشہور و معروف موسم عین اُس وقت سے شروع ہوتا ہے، جب آخری روزہ اور آخری افطار، آخری تراویح اور آخری سحری سے فراغت ہو چکتی ہے۔ مبارک ہیں ماہ مبارک کی راتوں کی وہ بیداریاں جو کسی کی آرزوے دید میں بسر ہوں! اور مبارک ہیں ماہ مبارک کے بھوک اور پیاس ضعف اور تڑپ والے وہ دن، جن کا خاتمہ کسی کی گلی کے طواف وسعی پر ہو!

انبساطِ عید دیدن روئے تو!
عید گاہِ ماغریباں روئے تو!

سفر سیر و تفریح کے لئے نہ تھا، "تحصیل علوم، و تکمیل فنون" کے لئے نہ تھا، علمی و ادبی تحقیقات، تاریخی و اثری تفتیش کے لئے نہ تھا، کشمیر و شملہ کا نہ تھا، لندن و پیرس، آکسفورڈ و کیمبرج کا نہ تھا۔ ہاں وہاں کے لئے بھی، نہ تھا جہاں، گرج گرج کر تقریریں کی جاتی ہیں اور جھگڑ جھگڑ کر

رزولیوشن پاس ہوتے ہیں! سفر جلجلاتی ہوئی ریگ والی زمین کی طرف تھا، گرمی کے موسم میں اُس آسمان کی چھت کے نیچے تھا جس کا آفتاب تمتما یا ہوا ہوتا ہے۔ ہوٹلوں اور پارکوں، آبشاروں اور سبزہ زاروں کی طرف نہ تھا، خشک اور چٹیل میدانوں، بے آب وگیاہ ویرانوں اور آگ اور خاک برسانے والے ریگستانوں کی جانب تھا۔ ایک گنہگار اُمتی اپنے شفیع اور شفیق آقا کے آستانے پر حاضر ہورہا تھا۔ بندے کی حاضری اپنے مولا کے دربار میں تھی۔ بھاگا ہوا غلام، تھک کر اور ہار کر، پچھتا کر اور شرما کر، پھر اپنے مالک کی طرف رُخ کر رہا تھا۔ ذرّہ آرزومند تھا کہ آفتاب کی تابش سے جگمگا اُٹھے۔ قطرے کو ہوس ہوئی کہ بحرِ بیکراں کے وصل کا لُطف اُٹھائے۔ مشتِ خاک کو یہ دماغ ہوا کہ نورِ پاک کی جاروب کشوں کی فہرست میں اپنا نام لکھائے۔ جو کچھ نہ تھا اُسے یہ ولولہ ہوا کہ جو سب کچھ ہے اُس سے تعلق و پیوند پیدا کیجیے۔

ہے آرزو کہ ابروِ پُرخم کو دیکھیے
اس حوصلے کو دیکھیے اور ہم کو دیکھیے

(عبدالماجد دریاآبادی)

زودِ پشیماں

تمہید

(مولانا عبد الماجد نے ایک ڈراما زودِ پشیماں کے نام سے لکھا ہے۔ نیچے کا حصہ اس ڈرامے کا ایک پورا ایکٹ ہے۔ یہ ڈراما اسٹیج پر کھیلے جانے کے قابل نہیں لیکن ادبی ڈراموں میں اسے ایک اچھا مرتبہ حاصل ہے)۔

(یوسف اپنے کمرے میں مطالعہ میں مشغول ہے۔ اس کے دوست خلیل آتے ہیں)

یوسف۔ تسلیم۔ آپ خوب آگئے۔ میں آپ کا انتظار ہی کر رہا تھا۔ کہئے آپ نے ڈاکٹر ولیم کا پریسیڈنشل ایڈرس پڑھا؟

خلیل۔ ہاں وہ تو مَیں نے پرسوں ہی پڑھ ڈالا تھا۔ اُس کی خوبیاں اندازہ سے بھی بڑھ کر نکلیں۔ یہ تو پہلے سے معلوم تھا کہ ولیم باتیں دقیق کہے گا، مگر یہ بالکل خیال نہ تھا کہ وہ اس قدر دلنشین پیرایۂ ادا بھی اختیار کرسکتا ہے۔ لیکن سب سے زیادہ حیرت کی بات یہ ہے کہ بعض خیالات تو اُس نے وہ ظاہر کئے جو عرصہ ہوا مَیں آپ کی زبان سے سُن چُکا تھا۔

یوسف۔ جی ہاں آج صبح پروفیسر واچا سے ملا تھا، وہ بھی اِس عجیب

توارد سے حیران تھے۔

خلیل۔ کیا قیامت ہے کہ ایک خیال آپ کی زبان سے ادا ہو تو کوئی اُس پر اعتنا نہ کرے۔ لیکن وہی خیال جب یورپ کے کسی فاضل کی زبان سے ادا ہوتا ہے تو لوگ اُس پر آمنّا وصدّقنا کہنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔

یوسف۔ یہی تو حاکم و محکوم کی جماعتوں میں فرق ہوتا ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ اگر ایک مُلک کے سپاہی دوسرے ملک کے سپاہیوں کو مغلوب کرلیں تو وہ اُس مُلک کے حاکم ہو جاتے ہیں۔ لیکن واقعات بتاتے ہیں کہ یہ فتحمندی محض سطحی اور یہ حکمرانی بالکل اوچھی ہوتی ہے۔ اصلی حکومت وہ ہوتی ہے جو محکوم جماعت کی جائدادوں اور جانوں پر نہیں، بلکہ اُس کے افکار و خیالات، جذبات و معتقدات، اور دل و دماغ کے قویٰ پر ہوتی ہے۔ یورپ نے ایشیا کو اِسی طرز پر مسخّر کرنا چاہا، اور آپ دیکھتے ہیں وہ اِس کوشش میں کس حد تک کامیاب ہو گیا۔

خلیل۔ جی ہاں، یہ تو ہے ہی۔ ہاں ایک بات تو بتائیے۔ ازدواج پر جو ولیم نے رائے دی ہے، اُس سے آپ کہاں تک متفق ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ تمدّن کے حق میں سب سے بڑی لعنت تجرّد اور سب سے بڑی رحمت تاہّل ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

یوسف۔ اس سے مجھے پورا اتفاق ہے۔

خلیل۔ کیا کہا؟ اتفاق۔

یوسف۔ جی، حرف بحرف اتفاق۔

خلیل۔ تو پھر اِس پر عمل کیوں نہیں کرتے؟ یا صرف زبان ہی سے

اتفاق ہے۔

یوسف:۔ "یعنی، یہ میری ذات کی طرف اشارہ ہے؟"

خلیل:۔ "ہاں ہاں صاحب آپ ہی کی طرف۔ جب آپ ایک رائے کو بالکل صحیح مانتے ہیں، تو اُس پر خود عمل کیوں نہیں کرتے؟ زبان سے تو آپ یہ کہتے ہیں، کہ ہر شخص کو شادی کرنا چاہیئے، لیکن عملاً یہ حالت ہے کہ جہاں بچپن سے شادی لگی ہوئی تھی، وہاں بیٹھے بٹھلائے انکار کر دیا۔ اور نہ آئندہ کے لئے والدین کی کوئی اسکیم چلنے دیتے ہیں۔"

یوسف:۔ "میں اپنے نقطۂ خیال کی شاید پوری توضیح نہیں کرسکا۔ پروفیسر ولیم کی رائے کی تائید کے یہ معنی ہیں کہ میرے نزدیک سوسائٹی کے لئے بحیثیت مجموعی تجرّد لوازم حیات سے ہے، جس کے بغیر کوئی قوم عرصے تک زندہ نہیں رہ سکتی۔ فرض کیجئے ایک قوم ایسی ہے جو من حیث القوم تجرّد کی زندگی بسر کرتی ہے، مثلاً اہلِ فرانس، تو ایسی قوم کارزارِ حیات میں اُس قوم سے یقیناً مغلوب ہو جائے گی، جس میں شادی کی رسم عام طور سے جاری ہے۔ کیونکہ جیسا میرے آپ کے درمیان بارہا گفتگو ہو چکی ہے، اجتماعی زندگی مشروط ہے خانگی زندگی پر، اور خانگی زندگی کی فلاح اس میں ہے کہ رسم ازدواج کو قائم رکھا جائے۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ تو کسی طرح نہیں نکلتا کہ ہر فرد کے لئے شادی کرنا لازمی ہے۔"

خلیل:۔ "آپ کی یہ منطق میری سمجھ میں نہیں آئی۔ ایک شے کو آپ ایک مجموعہ کے لئے ضروری قرار دیتے ہیں۔ لیکن خود ہی اُسے اُس کے افراد کے لئے غیر ضروری بتاتے ہیں۔ سوسائٹی تو کوئی الگ شے نہیں، افراد ہی کے مجموعے کا نام ہے۔ پس جب افراد کے لئے فرداً فرداً لازمی نہیں

تو اُس کے مجموعہ کے لئے، جسے آپ سوسائٹی کہتے ہیں، اُس کی ضرورت کہاں سے ثابت ہو جائے گی؟ جو شے کُل پر صادق آتی ہے، ضرور ہے کہ اُس کے ہر جزو پر بھی صادق آئے۔ یہ تو ایک کھُلی ہوئی بات ہے۔"

یوسف :۔"تعجب ہے کہ ایسی سیدھی سی بات میں آپ کو ایسا موٹا مغالطہ ہوا۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں کہ جو شے کُل کے لئے لازمی ہے، وہ ہر جزو کے لئے بھی لازمی ہے! مِل نے اس پر جو کچھ لکھا ہے، اُسے اِتنی جلد بھُلا دیا؟ خیر! یہ تو ایک دوسرا سوال تھا۔ میرے عرض کرنے کا مطلب یہ تھا کہ شادی افراد کے لئے بحیثیت افراد کوئی معنی ہی نہیں رکھتی محض ایک مہمل شے ہے۔ لیکن چونکہ یہ رسم سوسائٹی کے لئے مفید ہے، لہذا افراد کو بحیثیتِ اجزائے سوسائٹی اِس کی پابندی کرتے رہنا چاہئے مگر اب فرض کیجئے، زید ایک فرد ہے جو فرائض زوجی کو زیادہ خوبی سے انجام نہیں دے سکتا، یا یہ کہ وہ مجرّد رہ کر سوسائٹی کو جس قدر فائدہ پہنچا سکتا ہے، اُس قدر متاہّل ہو کر کبھی نہیں پہنچا سکتا۔ تو ایسی حالت میں زید کے لئے شادی کرنا نہ صرف بے کار و غیر مفید ہے بلکہ ایک صریح جُرم ہے۔ کیونکہ شادی کر کے اُس نے اپنے وجود کو سوسائٹی کے لئے کم مفید بنا دیا۔"

خلیل :۔"تو آپ کی تقریر کا ماحصل یہ نکلا کہ نکاح تمام تر ایک اجتماعی ضرورت ہے، اور چونکہ اجتماعی ضروریات کو آپ بغیر نکاح کے بہتر طریقے پر پورا کر سکتے ہیں۔ اس لئے شادی کرنا آپ کے لئے جرم ہے۔"

یوسف :۔"بس بس، بالکل یہی میرا مطلب ہے۔"

خلیل :۔"اس خیال کے وجوہ و اسباب؟"

یوسف :- ایک کھلی وجہ تو یہ ہے کہ میں اپنی علمی خدمات سے اگر دُنیا کے کسی کام آسکتا ہوں، تو مجرّد ہی رہ کر۔ متاہّل زندگی، علمی زندگی کے حق میں سمِ قاتل ہے۔ آج بیوی کی طبیعت نادرست ہے، کل بچّہ بیمار ہے۔ بیوی زیورات کے لئے ضد کر رہی ہیں، بچّہ کھلونوں کے لئے مچل رہا ہے۔ غرض شادی کر کے سیکڑوں جھگڑے آدمی کے سر لگ جاتے ہیں۔ غمِ نداری بُز بخر ایسی حالت میں مَیں تو کم از کم اپنے دماغ کو کسی گھر کے کام کے قابل نہیں پاتا"۔

خلیل :- ایک اور سوال کر کے اس گفتگو کو ختم کرتا ہوں۔ کیا آپ کے نزدیک خود افراد کے ذاتی جذبات اس معاملے میں کوئی وزن نہیں رکھتے؟"

یوسف :- "نہیں رکھتے" یا "نہیں رکھنا چاہیئے" رکھتے تو بہر حال ہیں۔ جس کا ثبوت آپ اپنے چاروں طرف دیکھتے ہیں، لیکن مَیں سمجھتا ہوں کہ اِن کا وزن ہونا چاہیئے یا نہیں"۔

خلیل :- تو صاف الفاظ میں یہ کہئے کہ تقاضائے جنسیت جو فطرت نے ہر انسان میں ودیعت کر رکھا ہے، ایک بے معنی شے ہے، اور عشق و محبّت زوجی مُہمل الفاظ ہیں"۔

یوسف :- "بے شک۔ گو حیوانیت کے نقطۂ خیال سے اعلیٰ و افضل، لیکن انسانیت کی عینک سے دیکھئے تو پست و مہمل"۔

خلیل :- "یہ کیا۔ ذرا اسے اور صاف کیجئے۔

یوسف :- "میرا مطلب یہ ہے کہ حیاتِ حیوانی میں بے شبہ جذبۂ جنسی کا درجہ نہایت اہم و ضروری ہوتا ہے، کیونکہ اُس وقت تک احساسِ فرض شناسی ہو ہی نہیں سکتا۔ اور اگر افراد پر اس جذبہ کی حکومت

نہ ہو تو نسل جاری ہی نہ رہ سکے۔ لیکن انسان جوں جوں مرتبۂ انسانیت میں ترقی کرتا جاتا ہے، اُسی نسبت سے اُسے جذبات کی قید سے آزاد ہوتے رہنا چاہیئے اور اپنی زندگی کو صرف عقل کی دکھلائی ہوئی شاہراہِ فرض پر چلانا چاہیئے، رہا عشق و محبت، تو اس کے افسانے میں نے بھی بہت سُنے ہیں۔ دیکھیئے۔ انسان کی زندگی حقائق سے کس قدر دور، اور وہم پرستیوں میں کس قدر گرفتار رہتی ہے۔ بچپن میں بھوت پریت دیو و جن کے افسانے سُنتے رہے۔ ہوش سنبھالا تو لیجیئے عشق و محبت، حُسن و جمال لیلیٰ و مجنوں کے افسانوں سے طبیعت بہلانے لگے۔ کہولت کے دن آئے تو یہ ورق بھی اُلٹ دیا۔ اب کیا ہے؟ اب بہشت و دوزخ، حور و غلماں، جبریئل و عزرائیل کے چرچے ہو رہے ہیں۔ غرض ساری عمر اِسی خرافات پرستی میں گزر جاتی ہے، اور یہ کبھی بھولے سے بھی نہیں خیال آتا، کہ یہ سب مزخرفات ایک ہی داستان کی مختلف حکایتیں ہیں۔ اصلیت نہ اِن کی نہ اُن کی۔ ہاں عشق کے متعلق مولانا حالی کی رباعی آپ نے سُنی ہے؟

ہے عشق طبیب دل کے بیماروں کا یا گھر ہے وہ خود ہزار آزاروں کا
ہم کچھ نہیں جانتے پر اتنی ہے خبر ایک مشغلہ دلچسپ ہے بیکاروں کا

کیا اچھی ماہیتِ عشق بیان کردی ہے۔ "اک مشغلہ دلچسپ ہے بیکاروں کا"۔

خلیل:۔ درست ہے!

یوسف:۔ اصل یہ ہے کہ جن دماغوں کو کسی اعلیٰ و بہتر قسم کی مصروفیت میسّر نہیں آتی، یا اُن میں اِن مصروفیتوں کی قابلیت نہیں ہوتی، وہ لامحالہ جذباتِ حیوانی کی سیری میں مشغول رہتے ہیں۔ لیکن جن کی توجہ اِن حوائج حیوانی سے بالاتر و لطیف تر افکار کی طرف رہتی ہے، اُن

میں ایسے خیالات کا گذر ہی نہیں ہوتا۔ پس جناب والا، اگر آپ چاہتے ہیں کہ میری ناچیز کوششیں، علم کی ترقی و اضافہ میں کچھ بھی کام آسکیں، تو میرے لئے بہترین مشورہ یہ ہے کہ میں شادی و ادی کے جنجال میں نہ پڑوں۔ اِن بکھیڑوں میں پڑ کر میں اپنی توجہ کو یکسو نہیں رکھ سکتا۔ اور بغیر یکسوئی کے اب تک تو کسی نے کچھ کام کیا نہیں۔"

خلیل "خیر۔ خدا آپ کے اِن خیالات کو مبارک کرے۔ زندگی ہے تو ہم بھی انشاء اللہ یہ تماشا دیکھیں گے، کہ یہ خیالات کب تک قائم رہتے ہیں۔ (گھڑی دیکھ کر) اُفّوہ، باتوں میں وقت ہی نہیں معلوم ہوا۔ اچھا اب اجازت دیجئے۔ کل پھر ملاقات ہوگی۔ تسلیم۔" (جاتا ہے)

یوسف "تسلیم۔"

(نواب باقر حسین کا آدمی داخل ہوتا ہے)

نوکر "سرکار نے آپ کو یاد کیا ہے۔ کہا ہے کہ فرصت ہو تو کھڑے کھڑے ہو جائیں۔ کچھ ضروری باتیں کرنا ہیں۔"

یوسف "اچھا۔ تم چلو۔ میں ابھی آیا۔" (دونوں مختلف راستے سے جاتے ہیں)

سین (۲)

(نواب باقر حسین کا زنانہ مکان۔ گھر کی عورتیں چلتی پھرتی نظر آتی ہیں۔ یوسف داخل ہوتا ہے)

یوسف "آداب عرض ہے۔"

باقر حسین "اہا۔ میاں یوسف ہیں۔ آج تو مدت دراز کے بعد دکھائی دیئے ہو، اور وہ بھی میرے بلانے سے آئے ہو، آخر ہم لوگ بھی تمھارے عزیز ہیں یا نہیں؟ اور اب تو تم ماشاء اللہ بی۔ اے کے امتحان میں

پاس بھی ہوگئے ہو۔ اب کس شے میں مشغول رہتے ہو۔ کل تمھارے والد سے بھی ملاقات ہوئی تھی، وہ کہتے تھے تم خود اپنے گھر میں بھی بے بلائے نہیں جاتے ہو۔ آخر ہم نے بھی طالب علمی کی ہے۔ لیکن یہ کبھی نہیں کیا کہ پڑھنے کے پیچھے گھر بار کو بھول جائیں۔ اور دیکھو اس محنت کا تمھاری صحت پر کیسا اثر پڑ رہا ہے؟ کس قدر دُبلے ہو گئے ہو۔"

یوسف "بجا ہے"

باقر حسین "بجا ہے کیا معنی؟ کیا تم کو اس میں شک ہے؟ خیر اس کے جواب کی تکلیف نہ گوارا کرو، یہ بتاؤ کہ تم نے میرے جدید تقرر کا حال تو سُنا ہوگا"

یوسف "کیسا تقرر؟ مجھے بالکل خبر نہیں"

باقر حسین "عجب آدمی ہو۔ معلوم نہیں کس دُنیا میں رہتے ہو؟ سارے شہر کو خبر ہو گئی۔ بچہ بچہ جان گیا۔ اخبارات میں شائع ہو گیا، اور تمھیں خبر ہی نہیں ہوئی۔ کتابوں میں پڑ کر ایسے بے خبر ہو جاتے ہو کہ کسی چیز کی خبر ہی نہیں۔ مہاراجہ راجگڈھ نے مجھے اپنی وزارت کے لئے طلب کیا ہے۔ اُن کی ریاست کی بدانتظامیوں کو دیکھ کر لاٹ صاحب نے عرصہ ہوا، اُنھیں لکھا تھا، کہ ہم تمھیں ایک نہایت ہوشیار و تجربہ کار وزیر دے سکتے ہیں، جس نے اپنی ذاتی جائداد کا بہتر سے بہتر انتظام کیا ہے۔ یہ سُن کر مہاراجہ صاحب پھڑک گئے اور مجھے دو ہزار ماہوار کے مشاہرہ پر طلب کیا ہے"

یوسف "خوب۔ تو پھر کب تک تشریف لے جانے کا قصد ہے؟"

باقر حسین۔ پہلی کو یہاں سے روانہ ہو جاؤں گا۔ اُن کو تار دے دیا ہے

یوسف :- بہتر ہے۔"

باقر حسین :- میں نے تم سے اس کا ذکر اس لئے کر دیا، کہ تمھارا جی چاہے، تو ہمراہ چلو۔ راجگڑھ کی آب و ہوا و موسم کا کیا کہنا، جنت نظیر خطہ ہے۔ نینی تال و شملہ اُس کے آگے گرد ہیں۔ وہاں چلنے سے تمھاری تفریح بھی ہو جائے گی، اور ذرا سیر بھی کرنا۔ یہاں خالی کتابوں کو لئے پڑے رہتے ہو۔"

یوسف :- خالی تو میں آج کل بالکل نہیں ہوں۔ آپ کو شاید اس کا علم نہیں ہوا کہ گورنمنٹ نے سو روپیہ ماہوار کا وظیفہ پانچ سال کے لئے اِس شرط پر دیا ہے، کہ میں بیالوجی کے کسی مسئلے پر ایک اوریجنل مضمون تیّار کروں۔ مجھے جو کچھ نوٹ لینا تھے، یہاں کی لائبریری و لیبوریٹری سے لے چکا۔ اب زیادہ وقت اُن کی ترتیب میں صرف ہو گا۔ راجگڑھ میں نسبتہً تنہائی ہو گی، یہاں تو احباب و اعزّہ کی خاطر داری میں بہت وقت ضائع ہو جاتا ہے۔ اس لئے تعمیل ارشاد میں مجھے عذر نہیں۔"

باقر حسین :- اچھا اچھا۔ یہ بہت خوشی کی بات ہے۔ بس اب اپنا سامانِ سفر درست کرو۔ مجھے اس وقت کمشنر صاحب کے یہاں جانا ہے۔ (یوسف اُٹھتا ہے) ہاں ایک بات تو تم سے کہنا رہ ہی گئی ہے۔ راجگڑھ کا قیام تمھارے لئے اس واسطے اور بھی دلچسپ ہو گا کہ وہاں مشرقی کے اتالیق ڈاکٹر اے میمبسٹی بھی ہوں گے۔ وہ آج کل رخصت پر گئے ہوئے ہیں، وہیں راجگڑھ میں آکر ملیں گے۔ تمھیں شاید اُن سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ نہایت قابل آدمی ہیں۔ اُن کی قابلیت کا اندازہ اِسی سے کر سکتے ہو کہ سالہا سال علی گڑھ کالج میں بسر کئے ہیں۔ کیمبرج کے گریجویٹ ہیں۔ امریکہ کے اِل۔ اِل۔ ڈی ہیں۔ طریقۂ تعلیم اِن کا بالکل جرمن اصول

پر ہے، یعنی کتابی خواندگی کم، اور زبانی تعلیم زیادہ۔ تم اُن سے مل کر یقیناً بہت خوش ہو گے۔ لوگوں نے مشرّف کو بدنام کرنا چاہا تھا۔ یہ مشہور کر دیا تھا کہ خدا نخواستہ وہ فاترالعقل ہے۔ مگر جب سے مَیں نے اِن ماسٹر صاحب کو رکھ دیا ہے، ماشاءاللہ اُس کی ذہانت پر جِلا ہو گئی۔ حُسنیٰ کو تم جانتے ہو، ماشاءاللہ کیسی تیز و ذہین ہے۔ یہ بہت افسوس کی بات ہوتی، اگر اُس کا شوہر کوئی نالائق یا غبی ہوتا۔ مگر خوش قسمتی سے مجھے مشرّف سا لائق داماد ملا جاتا ہے۔ مشرّف، حسنیٰ وغیرہ سب لڑکے لڑکیاں میرے ہمراہ ہوں گی اور مشرّف ہی کے سبب سے اُن کے اتالیق صاحب بھی ہمراہ رہیں گے۔ تم جانتے ہو مَیں کس قدر آزاد خیال واقع ہوا ہوں، بھلا ہمارے یہاں کا کوئی شریف اِسے گوارا کرے گا کہ شادی کے قبل لڑکی اپنے منگیتر کے سامنے برابر آتی جاتی رہے۔ لیکن مجھے دیکھو کہ مَیں نے کسی کے طنز و تشنیع کی پروا نہیں کی، حسنیٰ و مشرّف میں کوئی پردہ نہیں رکھا۔ اور یہاں تو خیر، بھائی جان و بھابھی جان کا بہت کچھ لحاظ کرنا پڑتا ہے، وہاں راجگڈھ میں دیکھنا۔ مجھے ہر طرح پر آزادی حاصل ہو گی۔ یہ معنی ہیں روشن خیالی کے۔ یہ نہیں کہ آدمی کہے سب کچھ، مگر عمل کے نام سے تبرّا۔

یوسف۔ بہتر ہے۔ "تسلیم"

(جاتا ہے۔ پردہ گرتا ہے)

سین (۲)

(راجگڈھ میں مشرف اور اُن کے ماسٹر ایک کمرے میں بیٹھے ہیں۔
یوسف کے آنے کی اطلاع ہوتی ہے)۔

ماسٹر۔(خدمتگار سے جو کارڈ لایا تھا) اچھا سلام دو۔(یوسف داخل ہوتا ہے)

یوسف ۔ تسلیمات ۔

ماسٹر۔(سلام کا جواب اشارے سے دیتے ہیں) آپ کو کوئی خاص کام؟

یوسف۔جی نہیں، کوئی خاص کام نہیں، بجز اس کے کہ نواب صاحب نے آپ کی قابلیت کی خاص تعریف کی تھی۔اِسی سے میں بھی مشتاق ہوکر آپ کی ملاقات کے لئے چلا آیا۔

ماسٹر۔ آپ نے کچھ ایجوکیشن (تعلیم) پایا ہے؟

یوسف۔جی بی۔اے پاس کیا ہے۔

ماسٹر۔یہیں انڈیا (ہندوستان) کے کسی کالج سے؟

یوسف ۔ جی ہاں ۔ ہارڈنگ کالج خلد آباد سے ۔

ماسٹر۔افسوس ہے، کہ انڈیا کا ایجوکیشنل سسٹم (نظام تعلیم) اتنا خراب ہے کہ ہم یہاں کے کسی بی۔اے، ایم۔اے۔ کو ایجوکیٹڈ (تعلیم یافتہ) نہیں کہہ سکتا۔

یوسف ۔ ہاں نقائص اور بکثرت نقائص کے موجود ہونے سے تو مجھے بھی انکار نہیں، لیکن اِس سے اِتنا وسیع نتیجہ نکالنا شاید صحیح نہ ہو۔

ماسٹر۔کیا آپ اس پوائنٹ (مسئلہ) پر مجھ سے ڈسکس (بحث) کرسکتا ہے، جبکہ آپ جانتا ہے کہ آپ کے یہاں اورینٹل لینگویجز (مشرقی زبانیں) کمپلسری

(لازمی) ہیں۔

یوسف - اولاً، تو یہ واقعہ نہیں، کہ مشرقی زبانوں کی تحصیل ہندوستان کی یونیورسٹیوں میں لازمی ہے۔ دوسرے ابھی مجھے یہ سمجھنا باقی ہے، کہ مشرقی زبانوں کی تحصیل، انسان کو تعلیم یافتہ بنانے کے منافی ہے۔

ماسٹر - او۔ آپ کے خیالات کیسے تنگ و تاریک ہیں۔ آپ ہرگز اُردو۔ فارسی۔ عربی۔ سنسکرت سے ایک اِنچ آگے نہیں بڑھ سکتے۔ دُنیا میں اب تک جتنے گریٹ مین (بڑے لوگ) گزرے ہیں سب کی یہی رائے تھی۔

یوسف - مجھے بد قسمتی سے ایسے بڑے لوگوں کے نہ نام سے واقفیت ہے، نہ اُن کے دلائل سے۔

ماسٹر - سر سیّد، ملٹن، نپولین، نیوٹن، سب کی یہی رائے تھی۔ اِن لوگوں کا نام شاید انڈین یونیورسٹیز میں کبھی نہیں آتا۔

یوسف - یہ جناب نے کیا ارشاد فرمایا۔ نپولین، ملٹن و نیوٹن کو اس بحث سے کیا تعلق ہے۔ لے دے کے ایک سر سیّد کا نام البتہ اس بحث میں لیا جا سکتا ہے۔ لیکن جناب فرمائیں، کہ اُنھوں نے اپنی کس تحریر میں یہ رائے ظاہر کی ہے۔

ماسٹر - او۔ آپ کیا کہتا ہے۔ میں سر سیّد کا خاص پرائیوٹ دوست تھا، مجھے اُن کے ورکس (تصانیف) کے پڑھنے کی کبھی ضرورت نہیں پیش آئی۔

یوسف - جناب علی گڈھ تشریف کس زمانے میں رکھتے تھے؟

ماسٹر - ۱۸۹۹ء (سنہ ۱۸۹۹ء) سے ۱۹۰۵ء (سنہ ۱۹۰۵ء) تک۔

یوسف - تو شاید سر سیّد کی روح سے آپ کی دوستی ہو گی، کیونکہ وہ تو سنہ ۹۹ء میں زندہ نہ تھے اور ہاں، جناب نے وہاں تعلیم کس درجے میں پائی؟

بی۔ اے، وہیں پاس کیا؟

ماسٹر۔ او۔ نو۔ کسی انڈین یونیورسٹی سے بی۔ اے کرنا بیکار تھا۔ میں نے وہاں اسکول میں پڑھا۔ سکستھ کلاس (چھٹے درجے) سے لے کر ایٹتھ (آٹھویں) تک۔

یوسف۔ ماشاء اللہ۔ اور کیمبرج سے بی۔ اے کس مضمون میں کیا۔

ماسٹر۔ وہاں کے لوگ جس سبجکٹ (مضمون) کو سب سے زیادہ مشکل سمجھتے تھے اُس میں، یعنی اُردو میں۔

یوسف۔ بجا ارشاد ہوا۔ تو اس میں آنرز حاصل کئے ہوں گے؟

ماسٹر۔ نہیں میں نے خالی "پاس" لینا کافی سمجھا۔ عقلمند آدمی کبھی کسی چیز کا زیادہ لالچ نہیں کرتا۔ علم بھی ایک دولت ہے۔ کبھی اس کا زیادہ لالچ نہیں کرنا چاہیے۔

یوسف۔ کیا خوب ارشاد ہوا۔ اور جناب نے یہ ال۔ ال۔ ڈی کی ڈگری کہاں سے حاصل کی ہے؟

ماسٹر۔ یہ امریکہ کی آنریری ڈگری ہے۔

یوسف۔ کسی علمی خدمت کے صلے میں؟

ماسٹر۔ او۔ آپ کس طرح کی بات کرتا ہے؟ جب ہم نے بی۔ اے، کرلیا اور اُس کے بعد امریکہ کی ایک پرائیوٹ یونیورسٹی کو پانچ سو روپیہ بھیج دیا، تو صاف معلوم ہوگیا کہ ہم یونیورسٹی میٹرز (یونیورسٹی کے معاملات) میں پورا انٹرسٹ (دلچسپی) لیتا ہے، اور اسی پر ہم کو ال۔ ال۔ ڈی کا آنریری ڈگری مل گیا۔

یوسف (علیحدہ) افسوس، دُنیا کس قدر ظاہر پرست ہے، اور اُسے

دھوکا دینا کس قدر آسان ہے! ایک شخص جہالت کا پتلا ہے، مگر علی گڈھ کیمبرج و امریکہ کے نام سے دُنیا کو مرعوب کئے ہوئے ہے'! (بہ آوازِ بلند) آپ کو اب تک کسی نے پہچانا ہی نہیں۔ واقعی آپ تو عجیب و غریب اوصاف کا مجموعہ ہیں۔ ہاں یہ تو فرمایئے، کہ یوں تو جناب کو جملہ علوم و فنوں پر عبور ہو گا، مگر کس مضمون سے خاص طور پر دلچسپی ہے؟

ماسٹر۔ یہ آپ نے ٹھیک کہا۔ ہم کو ہر سبجکٹ (مضمون) سے انٹرسٹ (دلچسپی) ہے لیکن ہمارے اسپشل انٹرسٹ (خاص دلچسپی) کا سبجکٹ ایجوکیشن (فنِ تعلیم) ہے۔ آپ ہمارا حال سُنئے، اس طرح پر ہے کہ ہمارا ماموں آنریری اسسٹنٹ کلکٹر تھا۔ اُس نے بہت سارا روپیہ کمایا تھا۔ اُس نے ہم کو بیرسٹری کے لئے لنڈن بھیجا۔ ہم کئی برس یورپ میں رہا، اور لنڈن، پیرس و برلن کی خوب سیر کیا، لیکن امتحان میں کبھی شریک نہیں ہوا۔ کئی برس کے بعد ہم نے کیمبرج یونیورسٹی جوائن (شریک ہوا) کیا، اور وہاں سے اُردو میں۔ بی۔ اے۔ پاس کی ڈگری لیا۔ اِتنے میں ہمارے ماموں پر برایبری (رشوت) کا کیس (مقدمہ) چل گیا، وہ اُس سے آخر کو چھوٹ گیا۔ لیکن سارا روپیہ ڈفنس (اپنی بریّت) کے بیرسٹرز کو دے دینا پڑا۔ تب ہم کو انگلینڈ سے لوٹنا پڑا۔ پھر ہم نے امریکہ کی ایک پرائیوٹ یونیورسٹی کو ۵۰۰ روپیہ بھیج کر۔ اِل۔ اِل۔ ڈی کی ڈگری لی۔ پھر ہم نے ایجوکیشنل سروس (صیغۂ تعلیم) میں آنا چاہا، لیکن یہاں کا انگریز لوگ امریکہ سے بہت جلتا ہے، وہاں کی ڈگری کو بوگس (فرضی و مصنوعی) ڈگری بتاتا ہے۔ اس کے بعد ہمارے ماموں نے ہم کو انسپکٹر جنرل پولیس سے انٹروڈیوس (ملا دیا) کر دیا۔ اُس کی میم کا ایک دفعہ اُنھوں نے جان بچایا تھا۔ وہ اُن کو بہت مانتا تھا۔ اُس نے ہم کو سال بھر کے لئے اِس کنڈیشن

(شرط) پر کہ ایک سال کے بعد یہ جگہ پیڈ (یا تنخواہ) ہوجائے گی۔ آنریری انسپکٹر پولیس کر دیا۔ ہم کو شکار کا بہت شوق ہے۔ ہم ایک دفعہ شکار کر رہا تھا، سامنے ہم کو ایک ڈارک آبجکٹ (سیاہ چیز) ملتا ہوا معلوم ہوا۔ ہم سمجھا کہ سُوّر ہے، اور فیر کر دیا۔ جب وہ چلّایا، تو معلوم ہوا کہ وہ ڈارک آبجکٹ (سیاہ چیز) سُوّر نہیں، کالا آدمی تھا۔ کسی راجہ کا گراسکٹ (گھسیارہ) تھا۔ ہم نے اُس کی عورت کو چار سو روپیہ دے کر چُپ کر دیا۔ پھر ایک دن یہ ہوا کہ ہم نے اپنے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس کی، جنھوں نے اس کیس (معاملہ) کو ہش اپ (دبا دیا) کر دیا تھا، شکریہ میں دعوت کی۔ جب وہ کھانے پر آئے تو ہم نے سب آدمیوں کے سامنے اُن سے کہہ دیا، کہ آپ کا ٹائی بہت میلا ہے، ہم ایسے آدمی کے ساتھ کھانا نہیں کھا سکتا۔ اس پر وہ خفا ہو کر چلا گیا اور ہماری رپورٹ کر دی۔ تب سے ہم نے وہ نوکری چھوڑ دیا۔ اور اب یہ پڑھانے کی نوکری کرتا ہے۔ آپ نے ہمارے بڑے بھائی مسٹر اے، کے اکبر کا نام سُنا ہوگا۔ وہ بہت مشہور آدمی ہے۔ وہ کلکتہ ہائی کورٹ میں بیرسٹری کرتا تھا، اور وَن تھاؤزنڈ (ایک ہزار) ماہوار کا انکم (آمدنی) رکھتا تھا۔ لیکن ہمارے ماموں سے لاٹ صاحب نے ایک روز کہا کہ "جو رسپکٹ (عزت) گورنمنٹ سروس (سرکاری ملازمت) میں ہے۔ وہ بیرسٹری میں نہیں۔ آپ کا بھانجا اگر گورنمنٹ پلیڈری (سرکاری وکالت) کر لے، تو ہم اُس کو دو برس کے اندر چیف جسٹس کر دے گا۔" تب سے وہ بیرسٹری چھوڑ کر اودھ میں گورنمنٹ پلیڈری کرتا ہے۔ اب وہ ہنڈرڈ ٹوئنٹی فایو (ایک سو پچیس) ماہوار کماتا ہے۔ لاٹ صاحب کے جمعدار سے اُس نے بہت دوستی پیدا کر لیا ہے۔ ہر سنڈے (اتوار) کو اُس سے ملنے آتا ہے۔

یوسف ۔ تو یہ کہئے "ایں خانہ تمام آفتاب است" یہ تو آپ نے اپنی اور اپنے خانداں کی بہت ہی دلچسپ سوانح عمری بیان فرمادی۔ نواب صاحب کو غالباً جناب کے ان کمالات و خاندانی خصوصیات کا علم نہیں۔ ہاں، یہ تو فرمائیں، کہ جناب اپنی گفتگو میں انگریزی الفاظ کا اس قدر اسراف بیجا کیوں کرتے ہیں ؟

ماسٹر ۔ او۔ آپ کے سامنے تو ہم بہت کم انگلش ورڈز (انگریزی الفاظ) بولا۔ پہلے ہمارا یہ عادت تھا، کہ ہم چپراسی، کانسٹبل، چوکیدار، سب سے انگریزی میں بات کرتا، جب دیکھتا کہ وہ نہیں سمجھتا، تب اردو میں اس کا ترجمہ کر دیتا۔ البتہ مشرق سے بات کرنے میں ہمیں بالکل اُردو بولنا پڑتا ہے، وہ ابھی انگریزی کا ایک لفظ نہیں جانتا۔

یوسف ۔ ناگوار نہ ہو، تو یہ بھی بیان فرما دیجئے، کہ جناب کا اسم مبارک کس زبان کا لفظ ہے اور اس کے کیا معنی ہیں ؟

ماسٹر ۔ او۔ آپ مینرز (آداب تہذیب) بالکل نہیں جانتا، جو کسی سے اس کے پرائیوٹ (خانگی) حال پوچھتا ہے۔ اچھا ہم آپ کو یہ بھی بتائے دیتا ہے۔ ماں باپ نے ہمارا نام عبدالباسط رکھا تھا۔ انگلینڈ میں ہم کو ایک اٹالین میڈ (خادمہ) کے ساتھ محبت ہو گیا۔ بہت آدمی محبت میں اپنا ریلیجن (مذہب) بدل دیتے ہیں۔ ہم نے اپنا نام بدل کر اٹالین کر دیا۔ اس طرح کہ "باسط" کو بیسٹی Basitee اور "عبدل" کو "المَا" کر دیا۔ اب سب لوگ اسے بیسٹی کہتے ہیں۔

یوسف ۔ ماشاءاللہ۔ کیا خوب استاد اور کیا خوب شاگرد ہیں۔ اچھا اب بہت دیر ہو گئی۔ رخصت ہوتا ہوں لیکن ماسٹر صاحب آپ کا بہت

ممنون ہوں، کہ آپ کی وجہ سے میرے تجربات میں اس قدر اضافہ ہوگیا۔ تسلیم

(جاتا ہے)

(ایک خدمتگار دوڑا ہوا آتا ہے)

خدمتگار۔ یہاں میاں یوسف تو نہیں ہیں؟

ماسٹر۔ کیوں خیر تو ہے؟

خدمتگار۔ اس وقت بٹیا کی طبیعت بہت خراب ہے۔ سر میں درد تو صبح سے تھا، لیکن اس وقت بہت تیز ہو گیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی دوا کئی دفعہ لگا چکی ہیں، مگر کچھ آرام ہی نہیں ہوتا۔ سرکار نے حکم دیا کہ میاں یوسف کو بلا لاؤ۔ وہ کوئی عمل جانتے ہیں۔ اسمریزم مسمریزم کچھ ایسا ہی نام ہے، شاید اُس سے آرام ہو جائے۔ سُنتے ہیں اُس سے بیماری فوراً اتر جاتی ہے۔

مشرّف۔ اُنہہ۔ ہوگا بھی۔ جاؤ یہاں یوسف ووسف کہاں۔

ماسٹر۔ چلو، مشرّف، گھوڑ دوڑ میں چلیں۔ وقت آگیا۔ کہو آج بازی لگانے کے لئے کتنا روپیہ ہے؟

مشرّف۔ آج تو کچھ بھی نہیں، کوئی پانچ ہزار ہوگا۔

ماسٹر۔ خیر کیا ہرج ہے۔ ابھی تو گھوڑ دوڑ کئی روز رہے گی۔ آج پہلا دن ہے۔

(دونوں جاتے ہیں)

سین (۴)

(باقر حسین کے مکان کا ایک حصّہ - ایک طرف سے ایک خدمتگار دوسری طرف سے اَنّا آتی ہے)

خدمتگار - کہو بُوا غفورن - اب تو بیٹا کی طبیعت بحال رہتی ہے نہ؟

غفورن - ہاں رمجانی (رمضانی) اب تو اللہ کا فجل (فضل) رہتا ہے۔ ایسی نیک لڑکی تو ہم نے آج تک نہیں دیکھی۔

رمضانی - ہاں، مجاز (مزاج) تو بہت ہی اچّھا ہے، اپنے بھی دل سے دعا نکلتی ہے کہ پروردگار اُنھیں خوش رکھے۔ لیکن بُوا، ایک بات کہوں جو بُرا نہ مانو۔

غفورن - کہو۔

رمضانی - نہیں، مجھے ڈر لگتا ہے، تم برا مان جاؤ گی۔

غفورن - نہیں - میں نہیں بُرا ماننے کی تو کہو تو۔

رمضانی - اچھا اِدھر آؤ تو کان میں کہوں۔ (سرگوشیاں کرتا ہے)

غفورن - (غضب آلود حیرت کے ساتھ) ارے یہ یوسف! دیکھنے میں کیسا نیک بکھت (نیکبخت) معلوم ہوتا تھا - اللہ اِس کو گارت (غارت) کرے، جو میری بیٹی کو بُری نظر سے دیکھے - لیکن رمجانی مجھے اب تک اس بات کا اکین (یقین) نہیں آتا - اگر کہیں یہ گلت (غلط) نکلا، تب؟

رمضانی - مجال تھی جو اِتنی بڑی بات میرے مُنہ سے خلاف نکل سکتی - قسم اللہ کی غفورن بُوا، جب اپنی آنکھوں دیکھ لیا، تب تمھارے آگے زبان کھولی - بھلا جب اشرافوں نے یہ حرکتیں شروع کر دیں، تو ہم لوگوں کو

کون بُرا کہہ سکتا ہے؟

غفورن۔ اچھا، اب اِس وکت (وقت) تو بیگم صاحبہ کے پاس مجھے بڑی جلدی ہے۔ تھوڑی دیر میں آؤں گی، تب کھلاصہ (خلاصہ بمعنی مفصل) باتیں ہوں گی۔ میرے تو جیسے ہوش اُڑے جاتے ہیں۔

رمضانی۔ بات ہی ایسی ہے۔ (دونوں جاتے ہیں) (یوسف آتا ہے)

(نواب باقر حسین کے مکان کا کوئی حصّہ)

یوسف۔ (ٹہل ٹہل کر گاتا ہوا نظر آتا ہے)

شورشِ جوشِ جنوں اب جلوہ دکھلانے کو ہے
یعنی جو کچھ دل میں تھا سب لب پہ آ جانے کو ہے

رخصت اے ضبط و تحمّل، الوداع اے پاسِ وضع
بندشوں سے اب زباں آزاد ہو جانے کو ہے

ہو چکی صبر و سکون و خاموشی کی انتہا
جامِ ضبطِ آہ و نالہ اب چھلک جانے کو ہے

لو مبارک تم کو اے اہلِ تماشا سیر نَو
دستِ بسمل سے عنانِ ضبط چھُٹ جانے کو ہے

خوب کر مشقِ جفا، لیکن ستمگر یہ بھی سوچ
کیا وفا کیشی کا جذبہ اِس سے مٹ جانے کو ہے

بے ادب لب، اُن سے کچھ کہنے کو ہیں پھر مضطرب
اُن کے چہرہ پر حیا کی پھر جھلک آنے کو ہے

سچ بتا، ناظرؔ مسرت تجھ کو اتنی کیوں ہے، کیا
اُن کی محفل میں کوئی تیری غزل گانے کو ہے

یوسف، یوسف، کیا مَیں وہی یوسف ہوں جو آج سے دو ہفتے پیشتر تھا؟ نہیں، ہرگز نہیں، اگر میں وہی ہوتا، تو اس وقت اپنے تئیں کسی علمی صحبت یا خلوت کدہ میں پاتا۔ یہاں اِس وقت یہ عاشقانہ اشعار پڑھتا ہوا نہ ہوتا۔ یہ آخر کیا بات ہوئی؟ کسی نے مجھ پر سحر کر دیا؟ کسی سخت مرض نے مجھے گھیر لیا؟ نہیں، یہ کچھ بھی نہیں۔ پھر آخر کیا ہے؟ ٹھہرو، میں خود، علامات کی مدد سے اپنے مرض کی تشخیص کروں گا۔ سب سے بڑا تغیر اپنی حالت میں، مَیں یہ پاتا ہوں، کہ پہلے جن مشاغل میں مَیں ہمہ تن مصروف و منہمک رہتا تھا، جن کے لئے ہر طرح کا عیش و آرام اپنے اوپر حرام کر لیا تھا اور جن مشاغل میں انہماک کے آگے مجھے نہ موسم کی تکلیف ستاتی تھی، نہ بھوک پیاس کی۔ اب اُنھیں مشاغل کی طرف سے طبیعت اُچاٹ ہو گئی ہے، سائنس کے مسائل کی تحقیقات کو میں نے اپنا مقصدِ زندگی بنایا تھا، اور کل تک اُن کی اُدھیڑ بُن میں نہ رات کو رات سمجھتا تھا، نہ دن کو دن۔ لیکن آج یہ حال ہے کہ گھنٹہ دو گھنٹہ بھی اپنی توجہ اُن پر یکسوئی کے ساتھ قائم نہیں رکھ سکتا۔ پھر آخر ذہن کس شے پر جمتا ہے؟ ایک صورت پر؟ کس کی صورت؟ عزیز و محبوب حسنیٰ کی صورت پر۔ یہ صورت میرے لئے کوئی نئی نہیں، اس سے پیشتر میں نے بارہا دیکھا تھا۔ لیکن یہ جذبہ جواب پیدا ہوا ہے، میرے لئے بالکل نیا ہے، بالکل انوکھا ہے۔ پھر صورت کی دلکشی پر غور کرتا ہوں، تو بھی کوئی غیر معمولی خوبی ذہن کے سامنے نہیں آتی۔ اعضا کا تناسب، جسم کی نزاکت، اطوار کی نفاست، اِن میں سے الگ الگ کوئی شے ایسی نہیں نظر آتی، جس کے لحاظ سے حُسنیٰ یگانۂ روزگار ہو۔ مگر پھر یہ کیا ہے، کہ یہ سمجھنے کے باوجود بھی، حُسنیٰ کی طرف اپنے میں ایک خاص

کشش، ایک غیر معمولی میلان پاتا ہوں؟ کچھ عقل ہی نہیں کام کرتی لیکن آخر، میں چاہتا کیا ہوں؟ صرف یہ کہ ہر وقت حسنیٰ اسے یکجائی رہے۔ ہر وقت اُس کی صورت میرے پیش نظر رہے۔ میں اُس سے کسی وقت بھی جدا نہ ہوں، کیا یہ میری خواہش، اخلاقی، شرعی، قانونی، کسی حیثیت سے معیوب ہے؟ مجھے تو ایسا نہیں معلوم ہوتا۔ لیکن کیا مجھے اس خواہش میں کامیاب ہونا ممکن ہے؟ کیا ایسی کوئی صورت نکل سکتی ہے، کہ میرے اور حسنیٰ کے درمیان ایک ناقابلِ انفصال وابستگی قائم ہو جائے؟ اس کی صورت عقد ہے۔ تو کیا میں عقد کروں گا؟ کیا شادی کر کے خانگی زندگی کے جھگڑوں میں پڑ جاؤں گا؟ کیا میں جس شے سے ہمیشہ بچتا رہا، اب مجبوراً اُس میں پڑنا پڑے گا؟ میں شادی کو اپنے لئے جرم سمجھتا تھا، تو کیا اب اُس جرم کا مرتکب بنوں گا؟ کیا فطرت نے میرے غرور کو توڑنے کے لئے یہ سامان اکٹھا کر دیا ہے؟ نہیں، اے فیاض و رحیم فطرت! رحم مجھ پر رحم! مجھے اِن مصائب میں نہ ڈال۔ اِن آفتوں میں نہ پھنسا۔ میں انھیں نہیں جھیل سکتا۔ میرے پیر میں بیڑیاں نہ پہنا۔ میں انھیں نہیں اُٹھا سکتا۔ مگر میں یہ کیا کہہ رہا ہوں؟ مجھے اِن آفتوں میں کون پھنسا رہا ہے؟ میں خود ہی تو دانستہ اس آگ میں کود رہا ہوں، اور خود ہی فریاد کرتا ہوں کہ "مجھے بچاؤ" "مجھے بچاؤ"۔ اچھا اب دل کو مضبوط کر کے اس طرف سے اپنی طبیعت ہٹائے لیتا ہوں۔ لیکن کیا میں اس پر قادر ہو سکوں گا؟ افسوس کہ مجھ میں اعتمادِ نفس نہیں رہا۔ پہلے مجھے اپنی ذات پر اعتماد تھا، اپنی قوت پر بھروسہ تھا۔ لیکن اب میں اپنی شکست کا اعتراف کرتا ہوں۔ اے جذباتِ انسانی! میں نے تمھاری قوت کو ہمیشہ

ذلیل سمجھا، میں تمھارے سامنے اپنے دل ودماغ کو ہیچ پاتا تھا، لیکن یہ کیا ہے کہ میری عقل تمھارے پہلے ہی حملے میں مغلوب ہو گئی ہے کیا واقعی انسان کی عقل ایسی ہی بودی شے ہے؟ افسوس یہ مسئلہ آج میری سمجھ میں آیا۔ دلائل کی مدد سے نہیں، ذاتی تجربے سے۔ کتابوں کے مطالعے سے نہیں، آپ بیتی سے۔ او مغرور و برخود غلط انسان! کیا تیری انسانیت و شائستگی، فرزانگی و تدبر کی یہی بساط ہے! اے عشق و محبت کی پاک و مجرد ہستیو! میں نے تمھاری شان میں ہمیشہ گستاخی کی، تمھیں ہمیشہ بے حقیقت سمجھا، تمھارے وجود سے ہمیشہ انکار کیا۔ لیکن اب حقائقِ زندگی یہ کہنے پر مجبور کرتے ہیں کہ حقیقی وجود تمھارا ہی ہے۔ ایسی قوت جو انسان سے کام لے سکے، وہ صرف تمھیں میں ہے۔ عقل و علم، فلسفہ و منطق، یہ سب الفاظ ہیں، جو صرف کتابوں میں لکھے جانے کے قابل ہیں، برتنے کے لائق نہیں۔ ہاں میں پھر بہکا جاتا ہوں۔ حسنیٰ، عزیز حسنیٰ کا تصوّر کرتے کرتے کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ حسنیٰ! کیا تو مجھے میری خواہش میں کامیاب ہونے دے گی! ہا۔ ہا۔ یہ کس قدر طفلانہ خیال ہے۔ کہاں حسنیٰ، کہاں میں! دولت و افلاس کا کہیں جوڑ مل سکتا ہے؟ لیکن نہیں، مجھے خیال ہوتا ہے کہ تیری خاموش نگاہ نے بھی مجھے پیامِ محبت دیا ہے۔ کاش، یہ سچ ہو! مگر میں یہ کیا کہہ رہا ہوں؟ یہ سب میرا وہم ہے۔ اُفوہ۔ کس قدر متناقض خیالات دماغ میں چکّر کھاتے ہیں۔ کیا یہ جنون ہے؟ ہاں شاید جنون کی وہی قسم ہے، جسے عشق سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اب میرے سر میں چکّر آ۔ آ۔

(کرسی پر گر پڑتا ہے)

(پردہ گرتا ہے)

(مولوی عبدالماجد دریاآبادی)

چڑیا چڑے کی کہانی

(چڑے کی زبانی)

چُوں چوچُوں، چڑ چوں، سب غلط، سب جھوٹ!

چڑیا چڑے کی کہانی بہت انسانوں نے لکھی ہے، مگر قلم درکفِ دشمن است،
چُوں، چوچُوں، چُوں، میری اور چڑیا کی لڑائی بہتان! چڑیا کا آنکھیں دُکھنے کا بہانہ کرنا افترا! چُوں چڑ چُوں، چوں، چُوں، آؤ، اب میں تمھیں چند باتیں سُناؤں کہ تمھاری آنکھیں کھلیں،

حضرت انسان کو باتیں بنانی بہت آتی ہیں اور بس مجھ کو خدا نے مشاہدہ کی قوت عطا کی ہے۔ ویسے دیکھو تو میں بیوقوف، بھولا بھولا، اِدھر اُدھر پھُدکتا نظر آتا ہوں مگر میں دیکھتا سب کچھ ہوں، سمجھتا سب کچھ ہوں، کہتا بھی سب کچھ ہوں مگر تم نہیں سمجھتے۔

میں دیکھتا ہوں، کہ خُدا نے مجھے آزاد، آزادی طلب! اور آزادی پسند مخلوق بنایا ہے۔ پرندوں، اور چرندوں میں بہت سے ایسے ہیں کہ انسان سے بالکل نفرت کرتے ہیں، اور جنگلوں میں انسان کے گھونسلوں سے دور جا کے رہتے ہیں، بعض بیوقوف ایسے ہیں، کہ انسانوں میں انسان کے خادم ہو کے رہتے ہیں۔ مگر میں انسانوں کی کارستانیوں کو دیکھنے کے لئے شہروں میں رہتا ہوں، اُن کے بڑے بڑے بھونڈے بھونڈے گھونسلوں میں اپنا پیارا، پیارا، چھوٹا، چھوٹا گھونسلا بناتا ہوں۔ لیکن وہ پکڑ کے مجھے رکھنا چاہیں تو کبھی نہیں رہتا، پنجرے میں بند کر کے

رکھنے کی بات دوسری ہے یا میرے پَر کاٹ دیں تو وہ اور ہی بات ہے، ورنہ میَں کبھی حضرتِ انسان سے مانوس نہیں ہوتا۔ میں اُنھیں خودغرض سمجھتا ہوں اور پرلے سرے کا ظالم۔

مگر مجھے اپنی کہانی سُنانی ہے، ضمناً حضرت انسان سے بھی دو دو باتیں ہو جائیں گی (پھُدک کے اور پَروں کو پھُلا کے) خُدا کا شکر ہے کہ اُس نے مجھے ایسا اچھا لباس دیا؛ ایک حد تک خوبصورت مگر نہ اِتنا کہ انسان کی حریص نگاہوں کا ہدف بن جاؤں، جسم میں پھُرتی دی کہ خوشی خوشی پھُدکتا پھروں، چھوٹے پروں میں پرواز کی تیز طاقت دی کہ انسانوں کی رفیق اُن کی ہمخصال اُن کی چھیتی بلّی کی دستبُرد سے بچوں، جسم ایسا موزوں دیا کہ بیان نہیں ہو سکتا، نہ اِتنا بڑا کہ شاہین اور باز مجھ پر جھپٹیں جیسے وہ کبوتر پر جھپٹتے ہیں، نہ اِتنا چھوٹا کہ حشرات الارض کی طرح بالکل حقیر ہی ہو جاؤں اور کوئی مجھے دیکھے ہی نہیں۔

آواز کیسی اچھّی، چوُں، چوُں، چڑ چوُں، چڑ چوُں۔ آپ کے نزدیک اگر یہ خوش آیند نہ ہو تو نہ سہی، اور میَں خوش ہوں کہ آپ اِسے پسند نہیں کرتے، لیکن میرے ننھّے دل کی خوشی اور طمانیت ظاہر کرنے کے لئے یہ بہت کافی ہے۔ چوُں، چوُں، چوُں، چڑ چوُں۔ شکر ہے خُدا کا اُس نے نے بُلبُل کا ترانۂ شیریں اور نالۂ رنگیں مجھے نہیں دیا، ورنہ صیّاد اور قفس یہی میرے رفیق ہوتے۔ بیوقوف بُلبُل کو دیکھئے قفس میں بیٹھ کے بھی گاتی ہے اور اپنی اسارت پر دردانگیز، نہیں، دل آویز نالے کرتی ہے۔ اور نہیں سمجھتی کہ یہ اُس کی اسیری کو اور بڑھاتے ہیں ؎

گُل و گلچیں کا گِلہ بُلبُلِ خوش لہجہ نہ کر تو گرفتار ہوئی اپنی صدا کے باعث

اگر ذرا بھی عقل ہوتی تو قفس میں پہنچتے ہی خاموش ہو جاتی اور اُس وقت تک خاموش رہتی کہ یا قفس کھلتا یا موت آتی۔

میں اُڑتا ہوں، پھدکتا ہوں، دانے چُگتا ہوں، مگر الحمدللہ کسی کو آزار نہیں دیتا، خُدا کی زمین سب کے لئے اور اُس کے دانے سب کے لئے ہیں، یہ فلسفہ قدرت نے مجھے سمجھا دیا ہے؛ اور اس لئے میں سب سے کہتا ہوں آؤ اور کھاؤ، اور خُدا کی نعمتوں سے فائدہ اُٹھاؤ۔ جہاں بہت سے دانے ہوئے اور ہم اپنے تمام ہمجنسوں کے ساتھ پہنچے؛ پھر وہاں اگر اور مخلوق چُگ رہی ہو تو مَیں معترض نہیں ہوتا، کبوتر ہوں۔ مینائیں ہوں، فاختائیں ہوں؛ سب کو صلائے عام ہے، سب ساتھ آئیں اور کھائیں۔ میں اکل کھُرا نہیں، تنہا خوری میری عادت نہیں۔

حضرتِ انسان کی بعض باتوں پر تو مجھے بیساختہ ہنسی آتی ہے: قہ، قہ قہ، چُوں چڑ چُوں، چڑ چُوں چُوں، کس قدر مغرور مگر سادہ لوح جنس ہے۔ میرا نام کنجشکِ خانگی رکھا ہے، یعنی جب انسان کے یہ گھونسلے جن میں وہ آج کل رہتے ہیں نہ تھے، اور وہ بہائم کی طرح غاروں اور کھوؤں میں رہتے تھے تو مَیں نہ تھا؟ میرا گھونسلا نہ تھا؟ یا کیا اب میں سوائے اُن کے گھونسلوں کے کسی اور جگہ اپنا گھونسلا نہیں بناتا؟ اب بھی چمن، صحرا، مرغزار، وادی، درخت، جھاڑی۔ میرے گھونسلے کے لئے ویسے ہی موجود ہیں جیسے انسان کے گھونسلے۔

میں تو اُن کے بہنگم موٹے بھدّے گھونسلوں میں اپنا گھونسلا صرف اس لئے بناتا ہوں کہ یہاں رہ کر اس ریاکار مخلوق کے کرتوتوں کو اچھی طرح مشاہدہ کروں، اور پھر اپنے ہمجنسوں میں بیٹھکر ان خودبینوں، ان بیوقوف

مغروروں کے اوپر ہنسوں۔ اگر میں انہیں انسان خانگی کہوں تو زیادہ زیبا ہے۔

پھر اُن کے گھونسلوں کا حال سُنیئے۔ ایک بڑا ہے، ایک چھوٹا ہے، ایک اونچا ہے، ایک نیچا ہے۔ یہ کیوں؟ مساوات کیوں نہیں؟ اِسے تو میں سمجھتا ہوں کہ اُن کے گھونسلوں کے اندر کے خس و خاشاک جنھیں انسان کیا کہتے ہیں بھُول گیا، ہاں، میز کُرسی فرش و فروش مختلف رنگ کے ہوں۔ کیونکہ میں بھی کہیں سے تاگا، کہیں سے تنکا، کہیں سے پتّا لاکر گھونسلا بناتا ہوں، لیکن بڑائی چھوٹائی کیوں ہے؟ ہاں، ہاں خیال نہیں رہا تھا، اس کی وجہ معلوم ہوئی۔ میں نے دیکھا ہے: چھوٹے گھونسلے والا انسان بڑے گھونسلے والے انسان کے سامنے، سر جھُکا کے، ہاتھ جوڑ کے کھڑا ہوتا ہے، اُس کی خدمت کرتا ہے۔ لَا حَولَ وَلَا قُوَّۃَ۔ کس قدر بے غیرت مخلوق ہے، مَیں نہ اپنے ہمجنس کی اور نہ کسی غیر جنس کی خدمت کرتا ہوں، اگر مار بھی ڈالو تو خدمت نہ کروں؛ اور کیوں کروں، خُدا کے فضل سے ہم سب مساوی ہیں، کسی کو ایک دوسرے کی خدمت کرنے کی ضرورت ہے نہ آرزو، اپنے بال بچّوں کی خدمت کے سوا، کسی کی خدمت کرنا، کسی کے گھونسلے پر جاکر دریوزہ گری کرنا، عار کی بات ہے، ننگ کی بات ہے، مگر انسان۔ وہ مُدعیِ عقل احمق، جو اپنے تئیں درس آموزِ قدرت خیال کرتا ہے۔ اس نُکتے کو نہیں سمجھتا۔

ہائے ریاکار انسان! اِس نے ایک لفظ نکالا ہے اور اُس پر اُسے بہت ناز ہے۔ کہتا ہے: "سوائے میرے، کسی میں حیا نہیں، سب جاندار سوائے انسان کے بے حیا ہیں حیا اور شرم کا احساس صرف مجھ میں ہے۔"

اوڈینگ مارنے والی مخلوق، بس، بس۔ جسے تو حیا کہتا ہے وہ ریا کاری ہے۔
انسان چڑا، اور انسان چڑیا، کبوتر چڑا، اور کبوتر چڑیا دانہ بدلی کرنے اور پوٹا بھرانے میں ایک ہیں۔ میں نہیں جانتا انسان نے یہ عادت کبوتر سے لی ہے، یا کبوتر نے انسان کی نقل اُتاری۔ میں اس کی تحقیق نہیں کرسکتا، کیونکہ کبوتر اگرچہ پرندہ ہے، لیکن ایسا احمق، قدرِ حریت ناشناس پرندہ ہے کہ انسان سے بہت مانوس ہے؛ اور ایسا کاہل ہے کہ اپنے لئے گھونسلا بھی نہیں بناتا، انسان اُس کے لئے گھونسلا بناتا ہے؛ اور یہ اُس کے عوض میں اُس کا درم ناخریدہ غلام بن جاتا ہے۔ وہ اُسے پکڑتا ہے، مگر پنجرے میں بند نہیں کرتا، پھر بھی یہ اُس سے نفرت نہیں کرتا، اور اڑ نہیں جاتا۔
لیکن کبوتر، گو اُسے رات دن غٹرغوں کی ضربیں لگانے اور دانہ بدلی کرنے کے سوائے کوئی اور کام نہیں (صبح سے شام تک یہ حضرت دانہ بدلی کیا کرتے ہیں، اور یہ خیال رہے کہ دانہ بدلی بچّوں کا پوٹہ بھرنے کے لئے نہیں، اگر ایسا ہوتا تو کوئی تعجّب کی بات نہ تھی، کیونکہ بیچارے بچّے اُڑ نہیں سکتے؛ اور اُن کا پوٹہ ماں باپوں ہی کو بھرانا پڑتا ہے؛ مگر کبوتر یوں ہی بے فائدہ ایک دوسرے سے چونچ ملایا اور پھڑ پھڑایا کرتے ہیں؛ اور ایک منٹ دو منٹ نہیں، گھنٹوں یوں ہی کیا کرتے ہیں) گو کبوتر کو اس کے سوا کوئی اور کام نہیں، تاہم سادہ لوح اور صاف دروں مخلوق! وہ کبھی انسان کی طرح چُھپ چُھپ کے دانہ بدلی نہیں کرتا۔
مگر حضرت انسان! اِن کا باوا آدم ہی نرالا ہے، دانہ بدلی میں یہ کبوتر سے کم نہیں، بلکہ بڑھے ہوئے ہی ہوں گے، مگر وہی خود ایجاد حیا اور شرم کی پابندی سے اپنے گھونسلوں میں، چُھپ چُھپ کے؛ لیکن پہلے کہہ چکا ہوں

کہ وہ حیا شرم نہیں ہے، بلکہ وہ ریاکاری ہے جو گھونسلوں میں وہ چوری چھپے کرتے ہیں جسے وہ علانیہ نہیں کر سکتے۔

کل ہی کی تو بات ہے؛ یہ تمھارے پڑوس کے گھونسلے میں کئی انسان چڑیا اور چڑے بیٹھے تھے، میں اوپر چھت میں تھا، وہ اپنی زبان میں چوں چوں کر رہے تھے، میں اپنی زبان میں چوں چوں کر رہا تھا، آہستہ آہستہ اُس گھونسلے کے ایک حصّہ میں سے جسے تم کمرہ کہتے ہو اور سب انسان تو چلے گئے، اور بس ایک انسان چڑا، اور ایک انسان چڑیا۔ یا تمھاری زبان میں میاں بی بی، رہ گئے۔ اب انھوں نے دانہ بدلی شروع کر دی اور پھر وہی پیار محبت کی باتیں ہونے لگیں، تم کہو گے کہ اس میں ریاکاری کی کونسی بات ہوئی؟ سنئیے: جب اُن کے ہمجنس بیٹھے تھے، اُس وقت اُنھوں نے یہ باتیں کیوں روا نہ رکھیں؟ اگر کہو شرم کی وجہ سے؟ بہت خوب! تو بعد میں بھی تو میں کمرے میں موجود تھا۔ پہلے مجھے خیال ہوا تھا کہ شاید اُنھوں نے مجھے دیکھا نہیں، اس لئے میں اُڑ کے، اور پھڑ پھڑ اکر کے، اُن کے قریب میز پر جا بیٹھا، کرسی پر جا بیٹھا، وہاں سے اُڑ کے دیوار میں جو تصویر لگی ہوئی تھی، اُس کے چوکھٹے پر جا بیٹھا، تب بھی اُنھیں کچھ اثر نہیں، اپنے کام سے کام؛ آخر میں نے زور سے چلّانا شروع کیا: "میں یہاں ہوں، میں یہاں ہوں، چوں، چوں، چوں، مگر بے حیائی دیکھئے، مجھے دیکھ کے دونوں نے ہنسنا شروع کر دیا؛ مجھے نہایت غصّہ آیا، اور میں اُن کو گالیاں دیتا ہوا، پھر سے کمرے سے باہر اُڑ گیا۔ فرمائیے! آپ ہی فرمائیے۔ آپ اِسے کیا کہتے ہیں۔ حیا، یا، ریاکاری؟

اِسی ایک بات پر کیا منحصر ہے؛ حضرت انسان کے ڈھنگوں سے میں خوب واقف ہوں کوئی مجھ سے پوچھے، کوئی لاکھ بار تو میں نے انسان چڑے کو

انسان چڑیا کے سامنے ادّعائے وفاداری کرتے سُنا ہوگا ۔

"آہ ! مَیں تمھیں چاہتا ہوں، تمھارے سوا حور بھی ہو تو اُس پر آنکھ نہ ڈالوں" بیچاری بھولی بھالی چڑیا اُسے یقین کرتی ہے، اور محبّت کی آنکھوں سے اُن آنکھوں سے جن سے آنسو اور احسانمندی ٹپکتی ہوتی ہیں۔ اُسے دیکھتی ہے۔ یہ ایسا منظر تھا، کہ شروع شروع میں اُس سے بہت متاثر ہوتا تھا لیکن مَیں کیا دیکھتا ہوں کہ وہی انسان چڑا، دوسرے دن دوسرے گھونسلے میں دوسری چڑیا سے۔ پہلی چڑیا کی نظروں سے دور۔ کہہ رہا ہے: آہ ! مَیں تمھیں چاہتا ہوں، تمھارے سوا حور بھی ہو تو اُس پر آنکھ نہ ڈالوں" اور یہ بیچاری معصوم چڑیا بھی) اُس دھوکے باز چڑے کے پھندے میں پھنس جاتی ہے، اور اپنا محبّت بھرا دل اُس کے سپرد کردیتی ہے۔

تیسرے دن کیا دیکھتا ہوں کہ وہی چڑا ایک اور گھونسلے میں، ایک تیسری چڑیا سے کہہ رہا ہے: " آہ ! مَیں تمھیں چاہتا ہوں، تمھارے سوا حور بھی ہو تو اُس پر آنکھ نہ ڈالوں" + اور یہ تیسری تشنۂ محبّت بھی اِن باتوں پہ یقین کرکے، دِل ہار بیٹھتی ہے، آخرکار، ایک دن آتا ہے کہ تینوں کو حقیقت معلوم ہوتی ہے، اور ـــ یا کنوؤں سے چند جان فاختہ انسان چڑیوں کی لاشیں نکلتی ہیں، یا افیم اِنھیں ابدی نیند سُلا دیتی ہے !

دل چاہتا ہے اِس ناپاک مخلوق کو ٹھونگیں مار مار کے مار ڈالوں۔

یہاں چڑیا بول اُٹھی، "چڑے کا قطع کلام تو ہوتا ہے) مگر مجھے یہ کہنا ہے کہ انسان چڑیا کا بھولاپن یہیں ختم نہیں ہوجاتا، بلکہ ہر بات سے ظاہر ہوتا ہے، میرا چڑا۔ مَیں اُس کے سامنے کہتی ہوں کچھ ڈرتی تھوڑا ہی ہوں۔ رات دن مجھ سے کہا کرتا ہے: "تم بیحد خوبصورت ہو، تمھاری برابر دُنیا میں

کوئی خوبصورت نہیں"، مگر خوشامد سے میرا دماغ نہیں چل جاتا، میں اِس کان سُنتی ہوں اور اُس کان اُڑا دیتی ہوں کیونکہ گو اُس کی نظروں میں مَیں خوبصورت ہوں لیکن حقیقت میں خوبصورت نہیں، اِسے میں اچھی طرح جانتی ہوں، مگر کہیں آدم نے حوّا سے کہہ دیا تھا کہ تم بہت خوبصورت ہو" بس وہ دن اور آج کا دن، کہ انسان چڑیا کے سامنے سے آئینہ نہیں ہٹتا، آئینہ نہیں تو آرسی ہے، آرسی نہیں تو پانی میں اپنا عکس دیکھا جاتا ہے، اور اپنے عکس کو دیکھ دیکھ کے خود ہی جھوما کرتی ہے، اور مارے غرور کے زمین پر قدم نہیں رکھتی۔ یہ نہیں سمجھتی کہ یہ سب چڑے کی خوشامد کی باتیں ہیں اور بس۔

پھر گھر میں بیٹھی، چڑے کو نیک اور اپنا عاشق سمجھا کرتی ہے اور چڑا اُس کی غیبت میں رنگ رلیاں مناتا ہے۔ یہ نہیں سمجھتی کہ "مالِ عرب پیشِ عرب" ہی رہے تو اچھا ہے۔ میں اِس نکتہ کو سمجھتی ہوں اور یہی وجہ ہے کہ میں ہر وقت اپنے چڑے کے ساتھ ہوں، یہاں تک کہ تدارکِ معیشت میں بھی برابر کی شریک ہوں، میں چڑے کو فخر و تفوّق کا موقع ہی نہیں دیتی، چڑے نے پھر کہنا شروع کیا: "آپ مجھے دیکھئے، یہ کچھ غرور اور ستایش کے طور پر نہیں کہتا اور نہ اپنی پیاری چڑیا کو سُنانے کے لئے کہتا ہوں بلکہ واقعہ بیان کرتا ہوں کہ میں ایک۔ بس ایک ۔ چڑیا کو دل دیتا ہوں ایک کعبہ کا طواف کرتا ہوں، ایک دیوی کے گرد پھرتا ہوں، میں ایک چڑیا کو دل دیتا ہوں، اور اُس کے ساتھ پیمانِ وفا باندھتا ہوں، اور اُس پیمان کو نہیں توڑتا، مگر یہ کہ موت آ کے اُسے توڑ دے۔

میں ایک چڑیا کو دل دیتا ہوں، اور اُس کو پورا اختیار دیتا ہوں کہ میری

کُل حرکتوں کی نگرانی کرے۔ میں جہاں جاؤں، جس مجلس میں پہنچوں، میرے ساتھ ہو، لڑائی لڑوں تو میرا دل بڑھائے، چہکوں تو میرا نغمہ سُنے۔ انسانوں کی طرح ہم علیٰحدہ علیٰحدہ زندگی بسر نہیں کرتے،

. . . .

. . . .

. . . .

. . . .

لو، تم سے باتیں کرنے میں، مَیں بھول ہی گیا کہ مجھ پر فرائض پدری ہیں۔ مَیں انسان باپوں کی طرح نہیں کہ اکثر اپنے عیش میں اپنے بال بچّوں کا خیال تک نہیں کرتے، بلکہ بعض تو ہمیشہ کے لئے اُنھیں چھوڑ دیتے ہیں، نان و نفقہ بھی نہیں دیتے ہیں! ایسا بے غیرت نہیں، جب ان بچّوں کو دُنیا میں لانے کا میں ہی باعث ہوا ہوں تو جب تک خود نہ اُڑ سکیں، میں خود بھوکا رہوں گا، لیکن ان کا پوٹہ بھروں گا، بڑی دیر ہوگئی، وہ چونچ کھولے انتظار میں بیٹھے ہوں گے، ہاں ذرا بچھے دانے، یا روٹی کی چھوٹی چھوٹی گولیاں بنا کر توڑ ڈالدو۔

. . . .

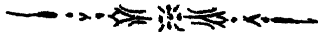
آہا! تم نے میری خواہش پوری کی۔ شکریہ ادا کرتا ہوں، خدا تمھارے اور تمھارے بال بچّوں کے پوٹوں کو بھی ہمیشہ بھرا رکھے۔

تو اب جاتے ہیں ،

پھر ملیں گے اگر خدا لایا "

اور یہ کہتے ہوئے دونوں پھر سے اڑ گئے ۔

(سیّد سجّاد حیدر)



بوڑھا اور بالا

بھن جب مصطفےٰ آباد سے پلٹے اُس وقت اُن کی عمر ساٹھ سے زائد ہو چکی تھی۔ ساری زندگی شہروں میں بسر کی۔ کبھی کلکتے کی سیر کی تو کبھی بمبئی کی۔ کبھی دہلی میں قیام کیا تو کبھی لکھنؤ میں۔ ہاتھ میں قوت تھی اور بازو میں محنت کرنے کی صلاحیت۔ جہاں بھی جاتے دو ایک روپیہ روز مزدوری کر کے پیدا کر لیتے تھے۔ اِتنا اکیلے آدمی کے لئے بہت تھا۔ شادی محض خانہ داری کے جھگڑوں ٹنٹوں سے بچنے کے لئے کی ہی نہیں۔ ہر جگہ دل بہلانے کا سامان مِل جاتا تھا۔ لُطف لیتے اور خوش رہتے تھے ...... باوجود ساٹھ سے زیادہ عمر ہونے کے نہ تو اُن کے کوئی بیوی تھی اور نہ کوئی بچّہ!

فطرت نے بھی بدلا لیا، جس طرح جوانی میں قوّت کی افراط تھی، اُسی طرح بُڑھاپے میں ضعف کی بہتات ہوئی۔ معذوریاں مزید برآں، بصارت کم ہو گئی کمر جُھک گئی اور گردن ہلنے لگی۔ اب نہ شہر کے گُل رو پاس آتے تھے، اور نہ مزدوری سے پیسے ملتے تھے۔ مجبوراً باپ دادا کا وطن یاد آیا۔ وہاں کبھی ایک پھونس کا جھونپڑا اُن کے نام سے بھی موسوم تھا۔ لیکن اِتنے دنوں کی بے التفاتی نے اُس کا نشان تک باقی نہ چھوڑا تھا۔ میر ضمیر حسین زمیندار کے پاس اپنی دُکھ بھری کہانی بیان کرنے گئے۔ اُنھوں نے اُن کے حالِ زار پر رحم کھایا، اپنے مکان میں رہنے کی جگہ دے دی۔

وہیں میر صاحب کے مردانے حِصّے کے ایک دالان میں پڑے

رہتے تھے۔ وہیں دن میں جولاہوں کبڑیوں کے نوعمر لڑکے میر صاحب کی آنکھ بچا کر اُن کی عبادت کرنے کے بہانے حقّہ پینے آتے تھے، یہ بھی دو کش کا لطف لیتے ہوئے خوب چہکتے، اور اِنھیں اپنی فتوحات کے قصّے اور افسانے سُناتے تھے۔ شام کو لاٹھی ٹیکتے، گھر سے باہر نکلتے اور گوبری سُنار کی بیٹھک میں جا بیٹھتے تھے۔

وہ اِن کا ہم سِن تھا اور انھیں کی طرح قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا تھا۔ بیوی مرچکی تھی۔ اولاد کے داغ پر داغ اُٹھا چکا تھا۔ صرف ایک پانچ برس کا لڑکا رام کِھلاون باقی تھا۔ اب وہی زندگی کا سہارا تھا۔ دن بھر غریب اپنی پیری پر روتا اور ہمسایوں سے رام کِھلاون کے لئے لڑتا تھا۔ ہر شخص خواہ مخواہ اُس بِن ماں کے بچّے کا دشمن ہو رہا تھا۔ جسے دیکھئے ایک نہ ایک شکایت لئے کھڑا ہے۔ اب گوبری میں باقاعدہ جنگ کرنے کی صلاحیت ہی نہ تھی۔ وہ لاٹھی چلا نہ سکتا تھا۔ صرف زبان چلاتا اور اپنی معذوری پر گھٹتا رہتا۔

بھمن "لنگوٹیا یار" پُرانے ساتھی جو مِل گئے تو معلوم ہوا کھوئی ہوئی راحت مِل گئی۔ جہاں شام کو یہ آئے اور وہ اپنا نریل بھر فوراً پاس آکر بیٹھ جاتا۔ کبھی پچھلی لڑائیوں کا ذکر رہتا تھا۔ کبھی اُن شرارتوں کا جو دونوں نے مِل کر ساتھ کی تھیں اور کبھی صرف رام کھلاون ہی کی رام کہانی سُنائی جاتی تھی۔ آج فلاں کا یوں مُنہ چڑھا دیا۔ فلاں لونڈے سے اِس طرح بھڑ پڑا، فلاں کو یوں جھڑک دیا۔ اس پر دونوں خوب کِھل کِھلا کر ہنستے تھے۔ پھر بھمن رام کِھلاون کو پاس بُلاتے۔ غصّے کا چہرہ بنا کر پہلے تو آہستہ سے اُس کا کان پکڑتے۔ پھر مُسکرا کر گال میں ہلکی سی

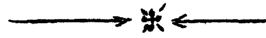
چٹکی لیتے اور پھر کوئی مٹھائی کا ٹکڑا جو مخصوص اس وقت کے لئے مجلس
ومیلاد کے حصّوں میں سے بچائے رکھتے تھے؛ نکال کر اُسے دے دیتے تھے۔
رام کھلاون خوش خوش اُچھلتا کودتا بھاگ جاتا۔ دونوں بوڑھوں کی
نظریں دور تک اس کی بھاگتی ہوئی صورت کا تعاقب کرتیں اور تھک کر
پلٹتیں تو اپنے دامن میں ہزاروں اُمیدیں اور سینکڑوں ارمان لئے ہوئے
آتیں۔ اُس وقت اُن کے چہرے کی شکنیں سِمٹ جاتیں اور جھرّیوں
میں چمک پیدا ہو جاتی تھی۔

لیکن بھمّن کے لئے یہ لُطف کی صحبتیں بھی دو برس سے زائد قائم
نہ رہ سکیں۔ گوبری دفعتہً بیمار ہوا اور تین ہی دن میں بھمّن کو داغِ جدائی
دے گیا۔ گاؤں کے پنڈوں نے لگن سُنار کو کریا کرم کرنے پر مجبور کیا۔
اُس نے گوبری کا سارا مال اسباب بیچ کر یہ فرائض بادلِ ناخواستہ
ادا کر دئے۔ رام کِھلاون کی پرورش کا سوال ہی نہیں پیش آیا۔ گوبری
کے مرتے ہی بھمّن اُسے اپنے ساتھ اُٹھا لائے۔

ضمیر حسین سے پوچھا تک نہیں۔ معلوم تھا کہ اِن کا دل اُن کے
مکان کی طرح کشادہ ہے۔ جیسے اُنھیں چار روٹیاں مِلتی تھیں اُسے بھی
مِل ہی رہیں گے۔ دوسرے لوگ بھی چُپ ہو رہے۔ زمیندار سب کا رکھوالا
ہے اُس کے گھر تو ہندو مسلمان سب پلتے ہی ہیں۔ اس میں اعتراض کی
کونسی گنجائش تھی؟ چلو ایک مُفت کے بوجھ سے بچ گئے۔

ادھر بھمّن اپنی جگہ خوش کہ سات برس کا "پوسا پالا" لڑکا مِلا۔
جس نعمت کی خواہش اب اس عمر میں فطرت نے پیدا کر دی تھی۔ وہ خُدا
نے یوں دے دی۔ طرح طرح سے رام کھلاون کی خاطر کرتے تھے۔ تین روٹی

خود کھاتے تو تین اُسے بھی کھلاتے، اپنے سامنے نہلاتے دُھلاتے۔ اپنی ہی پُرانی دھوتیاں پھاڑ پھاڑ کر اُس کے لئے لنگوٹیاں بناتے اور اپنے ہی ساتھ اپنے پلنگ پر پائنتی سُلاتے۔ کِھلاون بھی اپنی سمجھ کے مطابق خوش تھا۔ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا بہت ہوتا ہے۔ یہاں تو بابو کے سُرگ باش ہوتے ہی "بابا" مِل گئے۔ اب کیا چاہیئے تھا؟"



سب اپنی اپنی جگہ مطمئن اور خوش تھے کہ افتراق نے ایک شہری بابو صاحب کی صورت اختیار کی۔ آئے تو محض کسی مہاجن سے ملنے مگر رام کِھلاون کا قِصّہ سُنتے ہی آگ بگولا ہو گئے "وہ ایک ہندو سُنار کا لڑکا اور ایک مسلمان کے ساتھ رہے، چھی چھی کیسی بے دھرمی کی بات ہے!"

شام ہی کو گاؤں بھر کے ہندو جمع کئے گئے اور بابو جی نے اُنھیں غیرت دلادی "کیا اس سے زیادہ ہندو دھرم کی بدنامی ہو سکتی ہے کہ ایک لڑکا تم لوگوں سے نہیں پالا جا سکتا؟ مسلمان اُسے بے دھرم نہیں بناتا، تم لوگ اپنے ہاتھ سے اُسے بے دھرم بنا رہے ہو۔ اِس سے بڑھ کے ہتیا اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ اُسی کے ساتھ بھوجن کرتا ہے؟ وہ تو بالک ہے، بھولا ہے، وہ کیا سمجھے بوجھے، پر تم تو سب جانتے بوجھتے ہو، وہ ذات برادری میں کیسے لیا جائے گا؟ بس اُسے مسلمان ہونا پڑے گا۔

بات تھی تو لگتی ہوئی، مگر اس بوجھ کو اُٹھائے کون؟ وہ سات برس کا سہی پر کھائے گا تو؟ پہنے گا تو۔ اُسے کون اپنے سر لے۔ ایک نے دوسرے کا مُنہ دیکھا۔ پھر سب کی نظر اُس طرف گئی جہاں لگن سُنار ایک

کونے میں سمٹا سمٹا یا بیٹھا تھا۔ سب یکبارگی بول اُٹھے، بس بس یہ لگن ہی کو کرنا چاہیئے۔ اُسی کی قوم، اُسی کی ذات کا بالک ہے۔ رام کھلاون کی پرورش یہی کرے۔"

لگن نے یہ حکم سُنا تو خاموشی سے مگر جان پر آبنی۔ اُس کا وہ چہرہ جسے لوگ سوکھے ہوئے آم سے تشبیہ دیتے تھے، اور بھی سوکھ گیا۔ اُس کے بخیل دل کی نہ جانے کیا کیفیت ہوئی ؟

جی چاہتا تھا بچوں کا مُنہ نوچ لے۔ مگر پھر بھی ہوشیار تھا۔ زبان سے کچھ نہ بولا۔ گاؤں والے یوں ہی خفا تھے، گوبری کی زندگی بھر کسی نے بات نہ پوچھی تھی۔ اس کے بعد اب دن پلٹے تھے۔ موٹا جھوٹا، باریک اور نازک گاؤں کا سارا کام اب لگن ہی کو ملنے لگا تھا۔ اگر لوگ خفا ہو گئے تو ممکن ہے کہ کوئی سُنار باہر سے بُلا کر بسا لیں۔ یا زیور دوسرے گاؤں بننے کو بھیج دیں۔ اس لئے وہ کھلاون کا بار اُٹھانے پر چُپکے سے راضی ہو گیا۔

یہ تو سب کچھ تھا مگر کھلاون کو بھمن سے لے لینا کوئی آسان کام نہ تھا۔ وہ ضمیر میاں کے یہاں رہتے تھے۔ اگر کبھی میر صاحب اکڑ گئے تو پھر کسی کی اتنی ہمت نہیں کہ چوں بھی کر سکے۔ اس لئے بڑی دیر تک سرگوشی ہوتی رہی۔ ایک وفد تیار کیا گیا اور گاؤں کے مہتو "اگوا" بنے۔ ایک شام کو یہ وفد مہتو کی سرکردگی میں میر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔

میر صاحب باہری مکان کے صحن میں پکّڑ کے نیچے بیٹھے حقّہ پی رہے تھے۔ دوسرے گاؤں کے کچھ اسامی جمع تھے۔ مالگذاری لیتے

جاتے تھے اور رسیدیں کاٹتے جاتے تھے۔

اِن لوگوں کا سلام لے کر بولے "کیا ہے جی، تم لوگ کیسے آئے ؟"

مھتو نے آگے بڑھ کر کہا "میاں وہی گوبر ہی کے لونڈے کے واسطے آئن ہیں"

اُنھوں نے ذرا استعجاب سے پوچھا "کیوں کیا ہوا ؟ کیا اُس نے کوئی شرارت کی ہے ؟ کسی کو گالی دی ہے یا مارا ہے ؟"

"اُنھوں نے کہا "جی نہیں بھمن میاں اُو کا آپن پاس رکھ کے بے دھرم بنار ہا ہیں۔ کل شہر سے جو بابو جی آئن تھا وہ کہت رہن تم سب کا سب کو جات ہو جئے ہو"

میر صاحب کی جبیں شکن آلود ہو گئی۔ وہ اِن شہریوں سے بے حد جلتے تھے۔ بولے "تم لوگ اِس کو خوب کان کھول کر سن لو کہ میں کسی طرح پسند نہیں کرتا کہ یہ شہر والے اس گاؤں میں آکر یہاں کے لوگوں کو بھڑکائیں۔ یہ تو چاہتے ہیں کہ اِن شہروں کی طرح اِس گاؤں میں بھی بلوہ ہو جائے"

مھتو گھبرا کر بولا "نا صاحب بھلا! یہاں لڑائی جھگڑا سے کا مطلب؟"

"میر صاحب نے منہ بنا کر کہا "خیر، نہ سہی، مگر یہ لوگ لڑانے ہی کی فکر میں ہیں ..... رہا وہ لونڈا تو تم اُسے یقینی لے جاؤ" پھر اپنے آدمی کو آواز دی اور کہا "دیکھو ذرا بھمن سے کہو اس لونڈے کو لے کر یہاں آئیں"

بھمن۔ آگے آگے لکڑی ٹیکتے ہوئے آئے۔ اُن کے پیچھے کھلاون ایک روٹی کا ٹکڑا آدھا منہ میں، آدھا ہاتھ میں لئے پہنچا۔

میر صاحب نے بھمن سے کہا " دیکھو جی یہ مھتو اور گاؤں کے لوگ آئے ہیں۔ گوبری کے لونڈے کو مانگتے ہیں۔ اُسے اِن کے حوالے کر دو۔"

بھمن لکڑی ٹیکے کھڑے تھے۔ یہ حکم سُنتے ہی ایسا معلوم ہوا جیسے دفعتہً لکڑی بیچ سے ٹوٹ گئی۔ بعد سے زمین پر بیٹھ گئے اور گھبرا کر بولے " میاں اِسے آخر یہاں کیا تکلیف ہے جو یہ لوگ مانگنے آئے ہیں؟"

میر صاحب نے اِن کی تکلیف کا احساس کرتے ہوئے نرمی سے کہا۔

" یہ لوگ کہتے ہیں کہ وہ تمھارے ساتھ رہ کر بے دھرم ہو جائے گا؟"

اُنھوں نے گھبرا کر پوچھا " میاں وہ بے دھرم کاہے ہو جائے گا؟ اُس کو میں گوشت نہیں کھلاتا۔ ہاں روٹی دال ضرور دیتا ہوں۔ یہی تو یہ لوگ بھی کھاتے ہیں۔"

میر صاحب نے کہا " ہاں جی مگر وہ میرے گھر کی پکّی ہوتی ہے، اور تمھارے ہاتھ سے ملتی ہے۔ ہم تم دونوں مسلمان ہیں اور وہ لڑکا ہندو ہے۔"

بھمن نے کہا " پھر بچپنے میں تو سب ہی کھاتے ہیں۔ وہ بچّہ کھاتا ہے تو کیا حرج ہے؟"

مھتو نے کہا " رام! رام! " لگن موقع کا منتظر ہی تھا جھٹ سے بول اُٹھا " صاحبو میں اِسے اپنے پاس نہ رکھونگا۔ میرا سارا برتن جوٹھا ہو جائے گا۔"

میر صاحب نے اُسے ذرا غصّے سے دیکھا۔ پھر بھمن پر نظر کی اور مھتو سے متوجّہ ہو کر بولے " مصطفےٰ آباد میں آج تک مسلمان اور ہندو بھائیوں کی طرح رہتے ہیں۔ میں اِس لونڈے کی وجہ سے آپس میں جھگڑا نہ کھڑا

کروں گا۔ تم لوگ اُسے ابھی اپنے ساتھ لے جاؤ اور اُس کے پالنے کا معقول انتظام کرو۔"

مہتو یہ سُنکر کھلاون کی طرف بڑھا۔ اُس کے ہاتھ سے روٹی کا ٹکڑا گر پڑا۔ وہ "بابا! بابا" کہتا ہوا بھمن سے آکر لپٹ گیا۔ بھمن نے اُسے پوری قوّت سے کلیجے سے چمٹا لیا اور مجمع پر بڑے غصّے سے نظر کی۔

میر صاحب نے مہتو کو ہاتھ کے اشارے سے روکا۔ وہ اُن دونوں کو رخصت ہونے کا موقع دینا چاہتے تھے۔ پوچھنے لگے "تم میں سے کون اس بچّے کی نگہبانی کرے گا؟"

سب نے کہا "لگن سُنار" لگن کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ میر صاحب بولے "بالکل ٹھیک۔ یہ اُسی کی ذات کا ہے اُسی کا فرض ہے ..... مگر لگن ذرا میری بات بھی سُن لو ..... یہ یتیم ہے۔ اگر تم نے بچّے کو ذرا سی بھی تکلیف دی تو مجھ سے بُرا کوئی نہ ہوگا .... اچھا میاں بھمن اب تم کافی پیار کر چکے۔ اب اس لڑکے کو چھوڑو اور اِن لوگوں کو لے جانے دو۔"

بھمن نے بڑی بے بسی سے میر صاحب کو دیکھا۔ گڑگڑا کر بولے۔ "میاں مجھ سے اُسے نہ چھڑائیے!"

اُنھوں نے ایک سخت دل ڈاکٹر کی طرح ترش روئی سے کہا "کچھ نہیں یہ ابھی جائے گا۔ میں تمھاری خاطر نہیں جھگڑا مول لینے سے رہا!"

بھمن نے مایوسی سے بچّے کو دیکھا اور بڑی مشکل سے اُس کے ہاتھ اپنے گلے سے علیحدہ کئے۔ وہ "بابا! بابا!" کہہ کر رو ہی رہا تھا کہ لگن اور مہتو اُسے پکڑ لے گئے۔ بھمن میر صاحب کے پاس سر جھکائے بیٹھے رہے۔

جب سے چلے گئے تو میر صاحب نے کہا "میاں بھمن! اب آج کل کا زمانہ پچھلا سا نہیں ہے کہ ہندو کے گھر مسلمان پلتے تھے اور مسلمان کے گھر ہندو۔ اب ذرا ذرا سی بات پر مذہب اور دھرم وغیرہ کا سوال اُٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ تم اِس لونڈے کے سارے گاؤں سے لڑائی کیوں مول لو؟ اگر تمھیں بچّوں سے محبّت ہے تو کیا میرے بچّے نہیں ہیں؟ اُنھیں کو پالو، وہ تو تمھارے ہی ہیں!" اُن سے یہ کون کہتا ہے کہ پتھر سے کھیلنے والا شیشے کو ہاتھ لگاتے ہمیشہ ڈرتا ہے!

میر صاحب نے اپنے ہاں اندر ماما دائیوں سے بھی تاکید کر دی کہ اُن کے بچّے زیادہ تر بھمن کے پاس چھوڑ دئے جائیں، بوڑھا آدمی ہے۔ زیادہ چل پھر نہیں سکتا۔ تنہائی سے گھبراتا ہے۔ بچّے اگر اُس کے پاس چلے جائیں گے اُس کا دل بہل جائے گا۔"

مگر بھمن کھلاون سے بچھڑنے کے بعد پھر خوش نہیں ہوئے۔ میر صاحب کے بچّے اُن کے پاس آتے، اُنھیں "نانا" کہہ کر پُکارتے۔ اُن کے بستر کو روندتے۔ اُن کے نریل کی چلم توڑ ڈالتے۔ اُن کا تمباکو پھینک دینے پر بھی بھمن کا جی نہ بہلتا۔ اُن میں اور کھلاون میں بڑا فرق تھا۔ بھمن اُسے جھڑک دیتے، گالی دے دیتے اور مار بیٹھتے تھے۔ یہ بات اُن کے ساتھ کہاں نصیب؟ بھمن کھلاون پر جب خفا ہوتے تھے تو اگر بیٹھے ہوتے تھے تو وہ جلدی جلدی چلمیں ہمراہ لاتا تھا۔ لیٹے ہوتے تھے تو پاؤں دباتا تھا اور کھڑے ہوتے تھے تو گردن میں باہیں ڈالکر لٹک جاتا تھا۔ میر صاحب کے بچّے یہ خدمتیں کیسے انجام دے سکتے تھے؟ وہ اس سے یقینی طور پر زیادہ خوبصورت اور حسین تھے اور اُن کے کپڑے اُس کے قیمتی کپڑوں سے کہیں زیادہ صاف اور عمدہ ہوتے تھے۔ مگر بھمن تو پیار

اُسی کو کرسکتے تھے۔ گلے سے اُسی کو لگا سکتے تھے۔ میر صاحب کے بچّوں کو
تو گود میں بھی لیتے ہوئے جی ڈرتا تھا کہ کہیں اپنے کپڑوں کی بُو اُن کے کپڑوں
میں نہ آ جائے پھر سب سے بڑی بات تو یہ تھی کہ یہ خود اُس کے
محسن تھے اور یہ لڑکے اُن کے محسن۔ انسانی فطرت احسان مند بنتا قبول
نہیں کرتی وہ جس کے ساتھ احسان کرتی ہے اُسی سے محبت کرتی ہے۔
بہن کی فطرت بھی بالکل ہماری ہی آپ کی سی تھی۔ بھلا میر صاحب کے
بچے کھلاؤن کی کمی کو کس طرح پورا کرتے ؟
گھٹنے لگے۔ لاکھ طبیعت کو بہلاتے نہ بہلتی۔
نتیجہ یہ ہوا کہ دل ہی دل میں گھٹتے گھٹتے بیمار پڑ گئے، ستّر برس کا بوڑھاپا یوں ہی کرم خوردہ تھا۔ بدن میں جان
تھی ہی نہیں۔ چار پانچ دن کے بخار نے گھلا کر کانٹا کر دیا۔ ایک دن جب کہ
حالت خراب تھی میر صاحب، خود عیادت کو آئے۔ دیر تک کھڑے کھڑے
اِن کی حالت پوچھتے اور تشفّی دیتے رہے۔ اُنھوں نے بھی بیماری کی کیفیت
بیان کی۔ دل کی حالت نہ کہی۔ جب وہ پلٹنے لگے تو اُن کی نظر بہن کی کوٹھری
کے ایک کونے پر پڑی۔ دیکھا تو ایک مٹّی کی ہانڈی چپنی سے ڈھکی رکھی ہے۔
اُس ہانڈی کے طرف مکھیاں بھنک رہی ہیں۔ اور چیونٹیاں لپٹی ہیں۔ اُنھیں
گندگی سے سخت نفرت تھی۔ ذرا خفا ہو کر پوچھا "کیوں جی اِس ہانڈی میں کیا
سڑا رہے ہو ؟"
بہن کچھ جھیپ گئے۔ بالکل اس طرح جیسے چوری پکڑ لی گئی ہو۔ میر صاحب
اِن کے سکوت پر جھلّا گئے بولے "بولتے کیوں نہیں ؟ اس میں کیا رکھا ہے کہ
ہزاروں مکھیاں بھنک رہی ہیں ؟"
اُنھوں نے ڈرتے ڈرتے کہا "کچھ نہیں میاں، کھلونا کو مٹھائی بہت

پسند تھی۔ سو میں جو چیز میٹھی پاتا تھا، اُسے ضرور دیتا تھا۔ یہ اُسی کا حصّہ رکھا ہے۔ دو مہینے سے وہ لکّن کے پاس ہے۔ اس کا حصّہ کون کھاتا؟"
میر صاحب نے گردن جھکالی، اور خاموش اندر چلے گئے۔ یہ نہ کہا کہ اس ہانڈی کو پھینک دو۔ اور نہ یہ کہ "تم اب کھلونا کا خیال دل سے نکال ڈالو" کیسے کہتے؟ دل پر کسی کا زور چلا ہے؟

ایک روز شب میں جب کہ سب لوگ سو رہے تھے۔ بھمن بیماری ہی کی حالت میں پلنگ سے اُٹھے۔ آہستہ آہستہ صحن والے پکڑ کے درخت سے پتّیاں توڑیں۔ ٹٹولتے ہوئے کوٹھری میں رکھی ہوئی ہانڈی کے قریب گئے۔ پتوں کا دونا بنایا اور ہانڈی سے مٹھائی نکالی۔ ایک ایک ٹکڑے کو سونگھا۔ جس میں بو آتی اُسے چھوڑ دیا۔ جو ٹکڑا ذرا اچھا معلوم ہوا دونے میں رکھ لیا۔ پھر دالان کے کونے سے اپنی لکڑی اُٹھائی اور ایک ہاتھ میں لکڑی ایک ہاتھ میں دونا لئے ہوئے، دبے پاؤں پھاٹک پر پہنچے۔ چپکے سے کنڈی کھولی اور باہر نکل گئے۔

دسمبر کا مہینہ تھا۔ اندھیری رات تھی۔ مطلع ابر آلود تھا۔ ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں۔ لوگ لحافوں میں، کمبلوں میں، گٹھری بنے پڑے تھے۔ مگر یہ ستّر برس کا بڈھا، لکڑی ٹیکتا ہوا، جوان عاشق کی طرح، کوچۂ محبوب کی طرف چلا۔ نہ تو اندھیرے کا ڈر تھا۔ نہ چور اور ڈاکو کا۔ نہ تو سردی کا احساس تھا اور نہ سر اور کمر کے درد کا۔ دُنیا یوں ہی آنکھوں میں تاریک ہو رہی تھی، اب تاریک تر کیا ہوتی؟" چور ڈاکو بھلا اس کا کیا لے سکتے تھے؟ ننگا کیا اوڑھے گا، کیا نچوڑے گا؟ رہی سردی، تو جب جسم میں حرارت ہی باقی

نہ رہ گئی ہو تو سردی کیسی ؟ یوں ہی ٹھنڈا ہو رہا تھا اور سہی ۔ جہاں مردے پر سو من مٹی تھی دس من اور سہی ۔ ہاں سر اور کمر میں درد یقینی تھا لیکن اسی کی دوا کے لئے تو جا رہا تھا کھلاون ، مل جائے آزار جاتا رہے گا ۔
بیماری اسی کے فراق کی تھی ۔ بے چینی اسی کی جدائی کی تھی ۔
اس لئے بھگن بلا کھٹکے جا رہے تھے ۔ وہ تو اس کے پاس جا رہے تھے جس کے وہ محسن تھے ۔ جس کی آس ان سے لگی تھی ۔ جو ان کو "بابا" کہتا تھا ۔

وہ اسی طرح ہانپتے کانپتے ہاتھ میں مٹھائی کا دونا لئے لگن کے گھر پہنچے ۔ دروازہ بھڑ بھڑایا ۔ وہ سمجھا چور ہے اور بھی کمبل میں ڈھک گیا ۔ انھوں نے بار بار پکارا ۔ اپنی قوت بھر خوب چیخے ۔ وہ اتنا ہی ڈرتا گیا ۔ بارہ بجے رات کو اس طرح مہین آواز میں کون بولے گا ؟ یا تو چور ہے اور یا پھر کوئی بھوت پریت ۔ کمبل کو چاروں طرف سے دبا لیا ۔ رام ہی اس ڈراونی رات کو سکھ چین سے کاٹیں ۔ نہ جانے کون بلا ہے ؟
رام کھلاون اگر سن لیتا تو ممکن ہے کہ اپنے بابا کی آواز پہچان لیتا ۔ مگر وہ بچہ تھا اس کی آنکھ ان کی تکلیف چیخ پکار سے بھلا کب کھلتی ؟
جیسے جیسے بھگن کو کواڑ کے کھلنے کی طرف سے مایوسی ہوتی جاتی تھی ، ویسے ہی ویسے ان کی طاقت سلب ہوتی جاتی تھی ۔ جب بالکل ناامید ہو گئے تو وہیں تھرا کر بیٹھ گئے ۔ اب ضعف بھی محسوس ہوا ۔ دوران سر بھی ، سردی بھی اور جوڑوں کا درد بھی ۔ تھوڑی دیر بیٹھے جھوما کئے ۔ پھر اٹھنے کی کوشش کی لڑکھڑائے ، منہ کے بل گر پڑے ۔ دونا ہاتھ سے چھوٹ گیا ۔ کھلاون کی مٹھائی زمین پر بکھر گئی ۔ یہی

حیات کا آخری رشتہ تھا۔ وہ بھی ٹوٹ گیا۔
...... دو تین گھنٹے بہن کی روح نے کھلاؤن کے دونے کی نگہبانی کی ... پھر وہاں فریاد کرنے چلی گئی جہاں دھرم اور مذہب دلوں کے رشتے کے آگے کوئی چیز نہیں۔"

اپنی طرف دیکھ کر

(۱)

میرے دفتر کے کلرکوں میں سادھورام سب سے جونیر تھا۔ اُس کی تنخواہ صرف پچیس روپئے تھی۔ لیکن اُس کا کام سب سے زیادہ اور سب سے صاف ہوتا تھا۔ مَیں نے اُسے کبھی دفتر میں دیر سے آتے نہیں دیکھا۔ نہ کبھی مجھے اُس نے شکایت کا موقع دیا۔ دس بجے سے چار بجے تک وہ برابر سر نیچا کئے کام میں محو رہتا تھا۔ میں کبھی کسی کام سے ذرا باہر چلا جاتا تو تمام کلرک کام چھوڑ کر باتیں کرنے لگتے۔ لیکن سادھورام اُسے ایمانداری سے گرا ہوا فعل سمجھتا تھا۔ وہ اِس دوران میں بھی برابر اپنے کاغذات پر جُھکا رہتا تھا۔ مَیں نے اُسے کبھی کسی سے جھگڑتے نہیں دیکھا۔ وہ وہ اِتنا شریف اور نیک دل تھا کہ چپراسیوں پر بھی حکم چلانا انسانیت سے بعید سمجھتا تھا۔ کئی دفعہ ایسا اتفاق ہوا کہ میں نے سادھورام سے کوئی کام چپراسی کے ہاتھوں کرانے کو کہا، لیکن اُس نے خود ہی کر لیا۔ اِس پر مَیں اُسے ڈانٹ دیتا تھا۔ لیکن وہ اِسے بھی خاموشی سے سر جُھکا کر سہہ لیتا تھا اور اِتنا ہی نہیں، اُس میں اور بھی کئی صفتیں

تھیں۔ تنخواہ قلیل ہونے پر بھی اُس کے کپڑے دوسروں کی نسبت زیادہ صاف ہوتے تھے۔ اور چہرہ دوسروں سے بڑھ کر شگفتہ۔ مَیں نے اُسے کبھی غمگین نہیں دیکھا۔ اُس کی شرافت سے ناجائز فائدہ اُٹھا کر دفتر کے دیگر ملازم بھی اپنا کام اُس کے سپرد کر دیتے تھے۔ مگر سادھورام کی پیشانی پر بل نہ آتا تھا۔ وہ اُسے اُس محنت اور مستعدی سے کرتا تھا گویا وہ اُس کا اپنا کام ہے۔ اِن صفات نے اُس کے لئے میرے دل میں جگہ بنا دی۔ مَیں اکثر اُسے اپنے کمرے میں بُلا کر گھنٹوں باتیں کرنے لگا۔ تب مجھے معلوم ہوا کہ اُس کا سینہ روحانیت کا بحرِ بے پایاں ہے۔ وہ کبھی جوش میں نہ آتا تھا۔ لیکن جس بات پر اَڑ جاتا تھا، اُس پر چٹان کے مانند مضبوط رہتا تھا۔ جس قدر مَیں اُس کے نزدیک ہوتا گیا، اُسی قدر اُس کی محبت دل میں جاگزیں ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ مَیں نے اُسے گھر پر بُلانا شروع کر دیا۔ وہ روزانہ شام کے وقت میرے یہاں آنے لگا۔ آٹھ ہی دن کے بعد میرے لڑکے بالوں کو اُس سے اتنا پیار ہو گیا کہ اِدھر شام ہوتی، اُدھر وہ دروازے پر کھڑے ہو کر سادھورام کا انتظار کرنے لگتے۔ اور اگر اُس کے آنے میں چند منٹ کی بھی دیر ہو جاتی تو وہ بے تاب و مضطرب ہو جاتے۔ لیکن میرے یہاں آکر سادھورام نے کبھی اپنی خودداری کو ہاتھ سے نہیں دیا۔ وہ نہ کبھی بچّوں کی ناجائز نازبرداری کرتا تھا، نہ میری خوشامد۔ اُس کی گفتگو میں متانت کی ایک جھلک تھی، جسے کسی مقام اور کسی موقع پر بھی ہاتھ سے نہ جانے دیتا تھا۔ میری رائے میں وہ کسی دفتر کا انچارج ہونے کے قابل تھا۔ لیکن قسمت نے اُسے قعرِ مذلّت میں گرا رکھا تھا تاہم وہ اپنی حالت پر قانع تھا۔

(۲)

مجھے دفتر میں آئے ہوئے ایک سال گذر گیا۔ اِس اثنا میں کئی اسامیاں خالی ہوئیں۔ جن کے لئے جونیر کلرکوں نے درخواستیں کیں۔ لیکن سادھورام بالکل خاموش رہا۔ میں جانتا تھا کہ سادھورام اُن کے لئے ہر طرح موزوں ہے، اور چاہتا تھا کہ کوئی موقع ملے تو اُسے فیض پہنچاؤں۔ لیکن وہ اس قدر سیدھا سادا اور صابر و شاکر تھا کہ اُس نے درخواست تو ایک طرف، کبھی مجھ سے زبانی بھی نہ کہا کہ میرا خیال رکھنا۔ مَیں نے اُسے تکبّر سمجھا۔ اور ہر بار دوسروں کو ترقی دیتا گیا۔ سادھورام پچیس ہی روپئے پر پڑا رہا۔ وہ میرے گھر روزانہ آتا تھا۔ مجھ سے گھنٹوں باتیں کیا کرتا تھا، لیکن ترقّی کے بارے میں اُس نے نہ مجھ سے کبھی شکوہ کیا، اور نہ سرسری ذکر اذکار۔ یہاں تک کہ اُس کے متکبّر ہونے کے متعلق میرے خیالات تبدیل ہوگئے اور میں نے تصفیہ کرلیا کہ اب پہلا موقع سادھورام کو دوں گا۔

خوش قسمتی سے مجھے زیادہ دیر تک انتظار نہ کرنا پڑا۔ ریکارڈ برانچ کا ایک آدمی چھ ماہ کی رخصت پر جا رہا تھا۔ اُس کی تنخواہ پچاس روپئے تھی۔ دفتر کے کئی کلرکوں نے درخواست کی اور اپنے حقوق پر زور دیا۔ لیکن سادھورام حسبِ معمول خاموش رہا۔ اُس نے درخواست نہ کی۔ جب شام کو وہ میرے مکان پر آیا تو مَیں نے کہا "سادھورام تم نے کچھ سُنا؟ غلام نبی چھ ماہ کی چھٹی پر جا رہا ہے"

سادھورام کا چہرہ سُرخ ہوگیا۔ گویا کسی نے بے عزّتی کر دی ہو۔ تاہم وہ سنبھل کر بولا "جی ہاں! سُنا ہے"

"بہت سے کلرکوں نے اِس پوسٹ کے لئے عرضیاں دی ہیں"

"سادھورام خاموش رہا۔"

"تم نے درخواست کیوں نہیں کی؟ تم تو اُس کام کے لئے موزوں ہو۔"

سادھورام نے بے باکی سے جواب دیا۔ "مجھے عرضی دینے کی کیا ضرورت ہے؟"

مَیں نے متعجبانہ انداز سے پوچھا "تمھیں ضرورت نہیں؟"

"بالکل نہیں۔"

"تو ترقّی کے تمام مواقع ہاتھ سے کھو دوگے؟"

"یہ آپ کا کام ہے۔ گورنمنٹ نے آپ کو ایک ذمہ دار عہدہ دیا ہے۔ بیسیوں آدمیوں کی قسمت آپ کے ہاتھ میں سونپی ہے۔ یہ فیصلہ کرنا آپ کا کام ہے۔ اور کام ہی نہیں، بلکہ فرض ہے کہ ترقّی کا جو موقع نکلے اُس سے وہ آدمی فیض اُٹھائے جو دراصل اس کا مستحق ہے۔ اگر آپ اپنے فرائض کا خیال نہیں کرتے تو پرماتما کے دربار میں جواب دہ ہوں گے۔ میرے عرضی دینے سے کیا ہوگا؟ میرا کام آپ کے سامنے ہے۔"

مَیں سادھورام کو شریف، محنتی اور دیانت دار آدمی سمجھتا تھا، لیکن یہ خیال نہ تھا کہ وہ اس قدر نڈر اور آزادمنش بھی ہوگا۔ اُس کی صاف گوئی نے اُس کا مرتبہ میری نگاہوں میں اور بھی بلند کر دیا۔ میں شرمندہ ہوکر بولا "سادھورام! تم نے میری آنکھیں کھول دی ہیں۔ آئندہ مَیں اس باب میں غلطی نہ کروں گا۔ یہ موقع تمھیں ملے گا۔"

"لیکن اس وجہ سے تو نہیں کہ میرا آپ کے یہاں آنا جانا ہے؟ یا آپ کی رائے میرے حق میں عمدہ ہے؟ اگر ترقّی مجھے اس وجہ سے ملتی ہے تو میں اسے منظور نہ کروں گا۔ لیکن اگر آپ کی رائے

سے ہے کہ فی الحقیقت میرا کام عمدہ ہے اور اس ترقّی پر میرا حق ہے، تو امر دیگر ہے۔"

مَیں نے جواب دیا۔ "نہیں میرا واقعی یہی خیال ہے کہ اس سے پیشتر تمھاری حق تلفی ہوتی رہی ہے۔ اب یہ چانس[5] ہاتھ آیا ہے۔ میں اسے نہ جانے دوں گا۔"

chance

ساؔدھورام نے منکسر المزاجی سے جو متانت کا پہلو لئے ہوئے تھی کہا "تھینک[5] یو۔"

انگریزی تہذیب کے یہ الفاظ مَیں نے سیکڑوں دفعہ سُنے تھے اور ہر دفعہ مجھے یہی معلوم ہوا تھا کہ یہ بے معنی ہیں۔ قطعی بے مصرف اور بے کار۔ لیکن یہی الفاظ ساؔدھورام کے مُنہ سے سُن کر مجھ پر ایک روحانی کیفت کا عالم طاری ہوگیا اور مَیں نے محسوس کیا کہ مَیں نے کوئی نیک کام کیا ہے۔"

اُس سے دوسرے دن مَیں نے اُس جگہ پر ساؔدھورام کو متعین کردیا۔ دفتر میں ہلچل مچ گئی۔ سارے کلرک ساؔدھورام کے مخالف ہوگئے۔ شاید اُن کا یہ خیال تھا کہ ساؔدھورام کام کرنے کے لئے ہے اور وہ ترقیاں لینے کے لئے ہیں۔ لیکن میرے فیصلے نے اُن کا خیال بدل دیا۔ وہ غریب ساؔدھورام کو ستانے لگے۔ کوئی کہتا "اس سے ذرا سوچ سمجھ کر بات کرنا، یہ صاحب

---

[5] زبان ہمیشہ لکھنے کی اور ہوتی ہے اور بولنے کی اور۔ یہ دونوں زبانیں ضرورت کے مطابق وقت کے ساتھ بدلتی رہتی ہیں۔ موجودہ زمانہ میں بولنے والی زبان پر جو اثر زیادہ گہرا ہے وہ انگریزی کا ہے۔ خصوصاً جو لوگ انگریزی جانتے ہیں وہ تھوڑے سے جُملے بھی بغیر انگریزی لفظ مِلائے نہیں بول سکتے۔ ہمارے افسانوں میں جہاں مکالمے ہیں وہاں ایسی مثالیں کافی مِل جائیں گی۔ مثال کے لئے یہ افسانہ کافی ہے۔

سپرنٹنڈنٹ کا منظور نظر ہے" کوئی کہتا" ترقی لینے کا گُر خوشامد ہے۔ وہ اِس نے سیکھ لیا ہے" کوئی کہتا" افسر کے بچّوں کو مٹھائی کھلائی جائے تو افسر مہربان ہو جاتا ہے" کوئی کہتا" ہم تو اِسے سادھو جانتے تھے لیکن یہ معلوم نہ تھا کہ اس شفق کے پیچھے شبِ تار پوشیدہ ہے، خوفناک اور ڈراؤنی" کوئی کہتا" انسانی طبیعت کو سمجھنا آسان نہیں۔ یہ بات سادھو رام نے سکھادی"

لیکن سادھو رام طعنہ بازیاں چُپ چاپ برداشت کرتا گیا، اُس کی زبان سے شکایت کا ایک حرف تک نہیں نکلا۔ وہ جس طرح پہلے شگفتہ رہا کرتا تھا، اُسی طرح اب بھی رہتا۔ نہ ترقی نے اُسے متکبّر بنایا، نہ کلرکوں کی مخالفت نے رنجیدہ کیا۔ میری آنکھوں میں اس کی منزلت اور بڑھ گئی کیسی پاکیزہ زندگی ہے، جو سانحات سے بے نیاز رہتی ہے۔ مخالفت سے بے اثر اور رعایت سے بے پروا، ہر حالت میں شگفتگی اور راہ پر بڑھے جاتی ہے، جو پیشانی پر بل نہیں آنے دیتی اور اپنے معمول پر اس طرح قائم رہتی ہے جس طرح سمندر میں چٹّان۔

(۳)

یہ ترقی سادھو رام کو راس نہ آئی۔ اُس کی بیوی بیمار رہنے لگی۔ سادھو رام میں جہاں اور خوبیاں تھیں، وہاں ساتھ ہی یہ بھی گُن تھا کہ بیوی پر جان دیتا تھا۔ وہ سب کچھ سہہ سکتا تھا۔ لیکن بیوی کی تکلیف نہ دیکھ سکتا تھا۔ اُس کو تکلیف میں دیکھ کر اُس کی روح کانپ جاتی تھی۔ کئی مہینے تک علاج ہوتا رہا، لیکن اُسے افاقہ نہ ہوا۔ سادھو رام کے پائے استقلال متزلزل ہو گئے جس طرح طوفان میں کشتی جھکولے کھانے لگتی ہے۔ اس وقت میں نے دیکھا کہ نہ چہرے پر وہ مسرّت تھی، نہ ہونٹوں پہ وہ مسکراہٹ۔ ایسا معلوم

ہوتا تھا کہ سادھو رام وہ سادھو رام ہی نہیں رہا وہ دفتر میں اب بھی آتا تھا۔ کام اب بھی کرتا تھا۔ لیکن وہ پہلی بات نہ تھی جس قناعت کے پتلے نے ترقی کے مواقع ہاتھ سے جاتے دیکھ کر زبان نہ ہلائی تھی، جس صابر و شاکر شخصیت نے دفتر کے آدمیوں کے طعنے سن کر کلمۂ افسوس نہ نکالا تھا، وہی سادھو رام اب روزانہ میرے پاس آکر چھٹی کے لئے منتیں کرتا تھا۔ اور میں اس کی تبدیلی پر خوش ہوتا تھا۔ کیونکہ میں اسے دیوتا نہیں انسان دیکھنا چاہتا تھا اور انسانی طبیعت کا خاصہ ہے کہ مشکل سے مشکل دل بھی خاص مقامات پر جاکر اپنے مرکز سے ہل جاتے ہیں۔

اسی طرح کئی مہینے گذر گئے۔ سادھو رام جان و دل سے بیوی کے معالجہ میں مشغول رہا۔ اس کا چہرہ مرجھا گیا تھا۔ آنکھوں کی مسرت مرچکی تھی۔ زندہ دلی مفقود ہو چکی تھی۔ تاہم علاج میں مشغول تھا۔ دن کو دفتر میں کام کرتا۔ رات کو بیوی کے سرہانے بیٹھا رہتا۔ صحت خراب ہونے لگی۔ میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے تھے۔

ایک دن ایک کاغذ کا سوداگر میرے پاس آیا۔ ہم دفتر کے لئے عموماً اسی سے کاغذ خریدا کرتے تھے۔ وہ آتے ہی بولا "معاف کیجئے۔ میں شکایت لے کر آیا ہوں"۔

میرے کلیجے میں کسی نے گھونسا مار دیا۔ کاغذ کی خرید و فروخت سادھو رام کے ذمہ تھی۔ میں نے ہچکچاتے ہوئے جواب دیا "کہئے"۔

کاغذ والے نے چند منٹ توقف کیا اور پھر بولا "میں باہر گیا ہوا تھا۔ میری غیر حاضری میں آپ کے کلرک سادھو رام نے میرے نوکر سے مل کر جعلی بل بنوا لیا ہے۔ اور اس طریقے سے گورنمنٹ کا چار سو روپیہ زائد اڑا لیا ہے"۔

میں نے کرسی سے اُچھل کر کہا "مجھے یقین نہیں آتا۔"

"بُلا کر پوچھ لیجئے۔"

میں نے ساّدھورام کو بُلایا اور پوچھا "میرے پاس کاغذ کے متعلق کچھ حالات پہنچے ہیں۔ کیا وہ سچ ہیں؟"

ساّدھورام کے چہرہ کا رنگ لاش کی طرح سفید ہوگیا۔ اُس نے میری طرف اس طرح دیکھا گویا میں اُسے قتل کر رہا ہوں۔ ساتھ ہی کاغذ والے کی طرف نگاہ کی۔ اس نگاہ میں بے بسی چھپی تھی۔

میں نے پوچھا "ساّدھورام! کیا یہ سچ ہے؟"

ساّدھورام نے چند منٹ کے لئے کچھ سوچا، اور پھر مستقل مزاجی سے جواب دیا "جی ہاں، سچ ہے۔"

"تم نے کتنا روپیہ کھایا ہے؟"

"چار سو۔"

"اور ان کے ملازم نے؟"

"چار سو۔"

"تم اقبال کرتے ہو؟"

جی ہاں۔ انکار کیسے کر سکتا ہوں؟ اب تو آپ کے رحم پر ہوں خواہ بچالیں، خواہ زندگی برباد کردیں۔ ساّدھورام نے اِس وقت تک جو نہ کیا تھا، وہ آج کیا۔ خودداری کا جذبہ عنقا ہوگیا تھا، جس طرح سفیدی کو سیاہی دور کر دیتی ہے۔ مجھے بہت صدمہ ہوا۔ یہی جرم اگر کوئی دوسرا کلرک کرتا تو اُسے اِتنی اہمیت نہ دیتا۔ لیکن ساّدھورام کو اس گناہ میں آلودہ دیکھ کر مجھے زہر چڑھ گیا۔ میں اُسے کتنا نیک سمجھتا تھا، اُس پر کتنا بھروسہ کرتا تھا، لیکن اُس نے اپنا

اعتبار زائل کر لیا۔ اس اعتبار کو ٹوٹتے دیکھ کر میرے دل کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔ میں نے رنجیدہ ہو کر کہا "سادھورام مجھے تم سے یہ اُمید نہ تھی۔"

(۴)

گنہگار کا سر اونچا نہیں اُٹھتا۔ سادھورام نے سر جھکا کر جواب دیا۔ "حضور اب تو قصور ہو گیا۔ اس دفعہ معاف ہو جائے۔ پھر تا حیات کوئی قصور نہ ہو گا۔"

میں غصہ سے دیوانہ ہو رہا تھا، جھلا کر بولا "کیا کہتے ہو؟ میں تم دونوں کو پولیس کے حوالے کر دوں گا۔"

سادھورام کے پاؤں تلے سے زمین نکلتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اس نے کہا "حضور میری بیوی بیمار ہے۔" اس سے آگے زبان رُک گئی۔

میری آنکھیں کھُل گئیں۔ وہ نیک وجود جو دفتر بھر میں نیکی کا ستارہ سمجھا جاتا تھا، جس کی خودداری ضرب المثل تھی۔ جس کی ایمانداری پر شک کرنا گناہ تھا۔ اِس وقت گنہ گار مجرم کی حیثیت سے میرے روبرو کھڑا تھا۔ لیکن یہ جرم اس سے حرص کے باعث یا ذائقہ نفس کی خاطر سرزد نہیں ہوا۔ اُسے بیوی کے علاج کے لئے روپے کی ضرورت تھی۔ اسی آزمائش میں وہ گر گیا۔ کیا وہ قصوردار تھا؟ مجھے یکایک یاد آیا کہ ایک ایسا وقت مجھ پر بھی گزر چکا ہے، جب میری بیوی بیمار تھی۔ اُن دنوں میری تنخواہ نہایت قلیل تھی۔ اُس میں گزر اوقات بھی مشکل سے ہوتی تھی۔ میں نے دوستوں سے امداد طلب کی۔ لیکن کسی نے میری پرواہ نہ کی۔ مایوسی نے اپنی تاریکی پھیلا دی۔ اُسی تاریکی میں پاؤں جادۂ صداقت سے پھسلتے ہیں اور ایمانداری کا رستہ آنکھوں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ یہی شب تار ہے، جب انسان کی عمر بھر کی کمائی

لُٹ جاتی ہے اور شیطانِ نفس اُسے گُمراہ کر دیتا ہے۔ جو دن کو سرپٹ دوڑتے جاتے ہیں، رات کے وقت اُن ہی کے قدم ٹھوکریں کھاجاتے ہیں۔ مَیں نے ترغیب کا مقابلہ کیا، لیکن بیوی کی محبت میں دیوانہ ہوکرراہِ صداقت سے پاؤں ہٹائے۔ خیال آیا۔ سادھورام پر بھی وہی وقت پڑا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ اس کا قصور ظاہر ہوچکا ہے، اور میرا جرم تاحال چھپا ہوا ہے۔ کیا اتفاق کے اس ذراسے حادثہ سے مجھے حق حاصل ہے کہ مَیں اِسے پولیس کے حوالے کردوں۔ خیال نے پھر ماضی کے دفتر کھولے۔ اُس وقت مجھے کس قدر خوف، کتنا اندیشہ تھا کہ اگر میرے کرتوت ظاہر ہوگئے تو میری بیوی کو بھوکوں مرنا پڑے گا۔ اب اگر مَیں نے اِس نوجوان کو پولیس کے حوالے کردیا، تو اِس کی بیمار بیوی کا کیا حال ہوگا؟

اس خیال سے میری آنکھوں میں آنسو ڈبڈبانے لگے۔ سادھورام کے لئے دل میں سوئی ہوئی محبت بیدار ہوئی۔ مَیں نے آہِ سرد بھر کر سر اُٹھایا اور کہا "سادھورام! میں تمھیں معاف کرتا ہوں۔ لیکن آئندہ کے لئے اس قسم کی غلطی نہ کرنا!"

سادھورام کا چہرہ چمکنے لگا۔ پھانسی کے تختے پر چڑھتے وقت، مجرم کو رہائی کی خبر سُن کر جو خوشی ہوتی ہے۔ وہی خوشی سادھورام کو یہ الفاظ سُنکر ہوئی۔ وہ گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا اور اشک آلود آنکھوں سے میری طرف دیکھ کر بولا "یہ احسان عمر بھر نہ بھولوں گا!"

اِس واقعہ کو کئی سال گزر چکے ہیں۔ سادھورام اب بھی میرے دفتر میں ہے۔ وہ آجکل ڈیڑھ سو تنخواہ پاتا ہے۔ اُس نے اپنی ایمانداری سے اپنا گناہ دھو دیا ہے۔ اور دفتر کے آدمی اُس پر پھر اُسی طرح اعتبار کرنے

لگے ہیں۔ نہ صرف یہی بلکہ اُس کی نیکی کا شہرہ سارے شہر میں ہے اور مجھے
اُس سے عقیدت ہو چلی ہے، جو صرف چند لمحوں کے لئے زائل ہوئی تھی۔
وہ اب بھی میرے یہاں آتا جاتا رہتا ہے اور میرے لڑکے بالے تو اُسے
اپنا گُرو سمجھتے ہیں۔ (سُدرشن)

نذیر احمد کی کہانی

(مرزا فرحت اللہ بیگ نے ایک طویل مضمون "نذیر احمد کی کہانی
کچھ اُن کی کچھ میری زبانی" کے عنوان سے لکھا ہے اور یہ اُن کی ظرافت نگاری کا
ایک بہت اچھا نمونہ ہے۔ یہ مضمون اُسی طویل مضمون کا ایک اقتباس ہے۔)

۱۸۹۳ء میں میاں داؔنی اور میں نے ہندو کالج دہلی سے ایف۔اے
کا امتحان پاس کیا اور دونوں مشن کالج میں داخل ہو گئے۔ ایف۔اے
میں میرا مضمون اختیاری سائنس اور داؔنی کا عربی تھا۔ اُنھوں نے مجھے
مشورہ دیا کہ بی۔اے میں عربی لے لو۔ دونوں کو ایک دوسرے سے مدد
ملے گی، اور امتحان کی تیاری میں سہولت ہو گی۔ مجھے اپنے حافظہ پر گھمنڈ
تھا۔ یہ بھی نہ سمجھا کہ اس مضمون کو سنبھال بھی سکوں گا یا نہیں۔ جھٹ
راضی ہو گیا۔ القصّہ ہم دونوں بی۔اے کے درجۂ ابتدائی میں شریک
ہو گئے۔ ہمارے عربی کے پروفیسر مولوی جمیل الرحمٰن صاحب تھے۔ بڑے
اللہ والے لوگ تھے۔ عربی کا گھنٹہ بآسانی تصوّف کی باتوں میں گذر جاتا
تھا۔ کچھ تھوڑا بہت پڑھ بھی لیتے تھے۔ داؔنی کچھ سمجھتے ہوں تو سمجھتے ہوں،
بکمترین تو طوطے کی طرح حفظ کر لیتا تھا۔ اب رہی صرف و نحو،

اُس میں کورا کا کورا ہی رہا۔ سُنتے آئے ہیں کہ "مصیبت کہہ کر نہیں آتی" لیکن یہ نہیں سُنا تھا کہ "عربی کے پروفیسر کہہ کر نہیں جاتے"۔ ایک دن جو مولوی صاحب کے کمرے میں ہم دونوں پہنچے تو دیکھا کہ کمرہ خالی ہے۔ دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ مولوی صاحب کل شام کو استعفا دے کر کعبۃ اللہ چل دئے۔ پرنسپل صاحب کے پاس پہنچے، اُن سے پوچھا کہ دوسرے صاحب کب آتے ہیں؟ تو اُنھوں نے کورا جواب دیا کہ ہم عربی کی جماعت کا بندوبست نہیں کرسکتے۔ بہتر یہ ہے کہ مضمون تبدیل کرلو۔ میں نے داؤ سے کہا کہ بھئی تمھارے کہنے سے میں نے عربی لی تھی، اب میرے کہنے سے تم سائنس لے لو، جس سہولت کی بنا پر تم نے میرا مضمون بدلوا یا تھا، اب اُسی سہولت کے مدِّ نظر اپنا مضمون بدلو۔ بقول شخصے کہ "مرتا کیا نہ کرتا" وہ راضی ہوگئے۔ دفتر میں جاکر لکچروں کا حساب کیا تو معلوم ہوا کہ مضمون تبدیل کرنے کا وقت نہیں رہا۔ لکچر کم ہو جائیں گے اور اس طرح بجائے دو سال کے تین سال میں شریک امتحان ہونا پڑے گا۔ سنگ آمد و سخت آمد جب یہ "وہ جو بیچتے تھے دوائے دل وہ دُکان اپنی بڑھا گئے" کی صورت آپڑی تو دوسرے ٹھکانے کی تلاش ہوئی۔ دونوں سر ملا کر بیٹھے، مشورے کئے، رزولیوشن پاس ہوئے، آخر یہ تجویز پاس ہوئی کہ کسی زبردست مولوی کو گھیرنا چاہئے۔ دلّی میں دو تین بڑے عربی داں مانے جاتے تھے۔ ایک مولوی محمد اسحاق صاحب، دوسرے شمس العلماء مولوی ضیاء الدین خاں صاحب ایل۔ ایل۔ ڈی۔ اور تیسرے مولوی نذیر احمد خاں صاحب۔ پہلے کو تو دیوانگی سے فرصت نہ تھی۔ اس لئے وہاں تو دال گلتی معلوم نہیں ہوئی۔ قرعہ دوسرے صاحب کے نام پڑا۔ گرمیوں کا زمانہ تھا۔ مولوی ضیاء الدین صاحب

جامع مسجد میں رات کے دس گیارہ بجے تک بیٹھے وظیفہ پڑھا کرتے تھے۔
ہم دونوں نے بھی جاکر شام ہی سے جامع مسجد کی سیڑھیوں پر ڈیرے ڈال دیے۔ آٹھ بجے، نو بجے، دس بج گئے۔ مولوی صاحب نہ آج نکلتے ہیں نہ کل۔ خدا خدا کرکے دروازے سے قندیل نکلتی ہوئی معلوم ہوئی۔
ہم دونوں بھی ہاتھ پاؤں جھٹک خوشامد کے فقرے سوچ، کھڑے ہوگئے۔ ہم آخری سیڑھیوں پر کھڑے تھے، اس لئے دروازے میں سے پہلے قندیل نکلتی نظر آئی، اس کے بعد جس طرح سمندر کے کنارے سے جہاز آتا دکھائی دیتا ہے، اسی طرح پہلے مولوی صاحب کا عمامہ اس کے بعد نورانی چہرہ، سُرمگیں آنکھیں، سفید ریش مبارک، سفید جبّہ اور سب سے آخر زرد بانات کی سلیم شاہی جوتیاں نظر آئیں۔ آہستہ آہستہ اُنھوں نے سیڑھیوں سے اُترنا، اور اوپر تلے ہمارے سانس نے چڑھنا شروع کیا۔
ہم سوچتے ہی رہے کہ راستہ روک کر کھڑے ہو جائیں، وہ سٹ سے پاس سے نکل گئے۔ آخر ذرا تیز قدم چل کر اُن کو جا لیا۔ اور نہایت ادب سے دونوں نے جھک کر فرشی سلام کیا۔ وہ سمجھے کوئی راہ گیر ہیں، میری وجاہت کی وجہ سے سلام کر رہے ہیں۔ یہ نہ سمجھے کہ سائل ہیں، ان سے پیچھا چھڑانا مشکل ہے۔
وہ تو سلام لیتے ہوئے آگے بڑھے اور ہم نے پھر وہی پہلے والی ترکیب کی کہ چکّر کھا کر پھر سامنے آگئے۔ وہ دیکھ کر ذرا ٹھٹکے۔ پوچھا میں نے آپ صاحبو کو نہیں پہچانا، کیا مجھ سے کوئی کام ہے؟ ہم رام کہانی بیان کرکے عرض مدعا زبان پر لائے۔ فرمانے لگے "تم کو معلوم ہے کہ میں پنجاب یونیورسٹی کا ممتحن ہوں" بالکل اُسی لہجے میں یہ الفاظ ادا کئے جیسے اس زمانہ میں کوئی کہے "تم کو معلوم ہے کہ میں سی۔ آئی۔ ڈی کا انسپکٹر ہوں" لیکن ہم جان سے

ہاتھ دھوئے بیٹھے تھے۔ عرض کیا کہ ہم امتحان میں رعایت کے طالب نہیں، تعلیم میں مدد چاہتے ہیں۔ فرمانے لگے کہ تم کو تعلیم دینا اور پھر ممتحن رہنا میرے ایمان کے خلاف ہے۔ کسی دوسرے کو تلاش کیجئے۔"

ممکن ہے کہ یہ مسئلہ کوئی جزو ایمان ہو، ممکن ہے کہ پنجاب یونیورسٹی نے مولوی صاحب سے تعلیم نہ دینے کا حلف لے لیا ہو" بہرحال کچھ بھی ہو، اُنھوں نے ہم دونوں کو سلام علیکم کا ایک زور سے دھکّا دے کر نوکر کو حکم دیا کہ آگے بڑھو۔ وہ حکم کا بندہ قندیل اُٹھا کر چلا اور مولوی صاحب اُس کے پیچھے پیچھے لمبے ڈگ بھرتے روانہ ہوئے۔ ڈر تھا کہ کہیں دونوں قطاع الطریق پھر راستہ نہ روک لیں، مگر مولوی صاحب کے طرز عمل اور سلام علیکم کے جھٹکے نے ہم دونوں کو مضمحل کر دیا تھا۔ جہاں کھڑے تھے وہیں کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔ اور مولوی صاحب رپٹ کے کنوئیں کی گلی میں گھس اپنے مکان میں داخل ہو گئے۔ چلو اُمید نمبر دو پر پانی پھر گیا۔ لیکن آئندہ کے لئے سبق مل گیا کہ ایسے زبردست دشمن پر کھلے میدان میں حملہ کرنا خطرناک ہے۔ ایسے رستم کو پکڑنے کے لئے صیاد بننا ضرور ہے۔ وہیں سیڑھیوں پر بیٹھ کر کونسل ہوئی اور رزولیوشن پاس ہوا کہ مولوی نذیر احمد صاحب پر حملہ عبدالرحمٰن کی آڑ میں کیا جائے۔ اب میاں عبدالرحمٰن صاحب کا حال بھی سُن لیجئے۔ اِن کے والد کا نام سراج الدین صاحب تھا، نہایت نیک اور پرہیزگار شخص تھے۔ جوتوں کی دوکان بھی تھی۔ مولوی نذیر احمد صاحب اس دوکان کو ہمیشہ رقمی مدد دیا کرتے تھے اور روزانہ شام کو وہاں آکر بیٹھتے تھے۔ مولوی صاحب کو اُن کی تعلیم کا بہت خیال تھا، چنانچہ اُنھیں کی وجہ سے عبدالرحمٰن نے بی۔ اے، ایل۔ ایل۔ بی کے امتحانات پاس کئے۔ اُنہی کی

وجہ سے وکالت میں ترقی کی۔

بہرحال اسکیم تیار ہوگئی اور دوسرے ہی دن میں نے عبدالرحمن کو گانٹھنا شروع کیا۔ دو ایک روز کے بعد اُن سے اظہار مطلب کیا کہنے لگے کہ" بھئی مولوی صاحب کو فرصت کم ہے، کہیں انکار نہ کر بیٹھیں" میں نے کہا:" میاں عبدالرحمن تم اُن تک ہم کو پہنچا دو۔ اگر ہو سکے تو ایک دو کلمۂ خیر بھی ہمارے حق میں کہہ دو، آگے ہم جانیں اور ہماری قسمت"۔ وہ راضی ہوگئے اور کہا" شام کو آٹھ بجے دوکان پر آجانا۔ میں مولوی صاحب سے ملوا دونگا۔ اندھا کیا چاہے ؟ دو آنکھیں۔ ٹھیک آٹھ بجے ہم دونوں سراج الدین صاحب کی دوکان پر پہنچے۔ یہ دوکان فتحپوری کی مسجد کے قریب تھی، جا کر دیکھتے کیا ہیں کہ مولوی صاحب بیٹھے سراج الدین سے کچھ رقم کا حساب کر رہے ہیں۔ ہم نے جاتے ہی فرّاشی سلام کئے اور خاموش تخت کے کونے پر بیٹھ گئے۔ سراج الدین صاحب نے خیریت پوچھی۔ عبدالرحمن ہمارے پاس آ بیٹھے مگر مولوی صاحب روپیوں کے حساب میں اِس قدر مشغول تھے کہ اُنھوں نے دیکھا بھی نہیں کہ کون آیا، کون گیا۔ میں نے سوچا کہ یہاں بھی معاملہ پٹتا معلوم نہیں ہوتا۔ دُھتکار سُن کر یہاں سے بھی نکلنا پڑے گا۔ سچ ہے، مایوسی انسان کو ہمّت والا بنا دیتی ہے۔ میں نے بھی سوچ لیا کہ آج اِس پار یا اُس پار۔ مولوی ضیاء الدین صاحب تو بچ کر نکل گئے، مگر نذیر احمد صاحب سے دو دو ہاتھ ہو جائیں گے۔ قصّہ مختصر مولوی صاحب حساب سے فارغ ہوئے اور پوچھا کہ" یہ دونوں صاحب کون ہیں ؟ عبدالرحمن نے ہمارے نام بتائے۔ کچھ اُلٹے سیدھے خاندانی حالات بھی بیان کئے۔ اُس کے بعد ہماری مصیبت کا بھی ذرا سا تذکرہ کیا اور خاموش ہو گئے۔

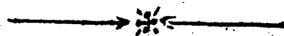
میں نے دل میں کہا "پرائے پرنے کھیلا چوا" آج موا نہ کل موا، اب میاں عبدالرحمٰن کو رہنے دو جو کچھ کہنا ہے خود کہہ ڈالو، کہیں ایسا نہ ہو کہ یہاں سے بھی بے نیل مرام باضابطہ پسپائی ہو۔ میں نے نہایت رقت آمیز لہجہ میں اپنی مصیبت کا تذکرہ شروع کیا۔ فرمانے لگے "تو عربی چھوڑ دو، سائنس پڑھو، بیٹا آج کل مسلمانوں کو سائنس کی بڑی ضرورت ہے، ہمارے ہاں مثل ہے، پڑھیں فارسی بیچیں تیل؛ یہ دیکھو قدرت کے کھیل، فارسی پڑھ کر تیل تو بیچ لوگے، عربی پڑھ کر تیل بھی بیچنا نہ آئے گا" ان کی اس پُر مذاق گفتگو سے ہم دونوں کے دل بڑھ گئے۔ ہم رہنے والے ٹھیرے جامع مسجد کے پیچھے کے، بھلا ایسی باتوں میں ہم سے کون ڈر آ سکتا ہے؟ ہم نے بھی ایسے ہی شگفتہ الفاظ میں جواب دیا۔ مولوی صاحب پہلے تو مسکراتے رہے۔ پھر کھِلکھِلا کر ہنس پڑے۔ داتی کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگے "یہ بڑا غریب معلوم ہوتا ہے مگر تو بڑا بد معاش ہے۔ بیٹا جاؤ کسی دوسرے مولوی صاحب کی تلاش کرو، دلّی میں کیا مولویوں کا کال ہے۔ مجھے ذرا بھی فرصت ہوتی تو کبھی انکار نہ کرتا۔" میں نے عرض کی کہ "جناب کا ارشاد بالکل صحیح ہے، مگر جو مولوی ہیں وہ پڑھاتے نہیں اور جو پڑھاتے ہیں وہ مولوی نہیں۔" کہنے لگے "نہیں ایک آدھ ایسا بھی نکل آئے گا جو مولوی بھی ہوگا اور پڑھائے گا بھی۔ جناب شمس العلما مولوی ضیاء الدین صاحب ایل۔ ایل۔ ڈی۔ (یہ الفاظ بہت طنز سے کہے) کے پاس جاؤ، اُن کو فرصت بھی ہے اور عالم بھی ہیں۔" میں نے کہا "اس کے ساتھ وہ پنجاب یونیورسٹی کے ممتحن بھی ہیں۔" کہنے لگے "میں اس کا مطلب نہیں سمجھا۔" یہاں تو چلے بیٹھے ہی تھے؛ جامع مسجد کی سیڑھیوں والا واقعہ خوب نمک مرچ لگا کر بیان کیا۔

بہت ہنسے اور کہنے لگے کہ "بھئی تم لونڈوں سے ڈرنا چاہیئے ضیاءالدین کو اگر خبر ہو جائے کہ اُن کے اوصاف حمیدہ و خصائل پسندیدہ سراج الدین کی دوکان پر اس طرح معرضِ بحث میں آتے ہیں تو یقین جانو کہ نالش ٹھونک دیں۔ اچھا بھئی میں تم کو پڑھاؤں گا۔ مگر تم بھاگ جاؤ گے" ہم دونوں کے مُنہ سے ایک ساتھ نکلا "نہیں ہرگز نہیں" مولوی صاحب نے کہا کہ "چھٹی ایک دن کی نہ ہوگی" ہم نے کہا "بہت خوب" مولوی صاحب نے کہا کہ "عید بقرعید کو بھی آنا پڑے گا" ہم نے کہا "بہت مناسب" کل کس وقت حاضر ہوں ؟" مولوی صاحب تھوڑی دیر تک انگلیوں پر کچھ اپنے وقت کا حساب کرتے رہے۔ اِس کے بعد کہا "دوپہر کو ڈیڑھ بجے" ہم نے کہا "بہت خوب"

چونکہ اِن باتوں میں رات زیادہ ہوگئی تھی، اس لئے مولوی صاحب دوکان پر سے اُٹھے، ہم سب نے سلام کیا اور وہ وعلیکم اسلام کہتے ہوئے تشریف لے گئے۔ ہم دونوں بھی خوش خوش اُٹھے اور سلام علیکم، وعلیکم اسلام کرکے دوکان سے چلے۔ راستہ میں دائی نے کہا "میاں مرزا، بڑے میاں نے مار ڈالا، بھئی گیارہ بجے کالج سے پڑھ کر نکلیں گے آتے آتے ساڑھے گیارہ بج جائیں گے، دم نہ لینے پائیں گے کہ مولوی صاحب کے یہاں کے چلنے کی تیاری کرنی پڑے گی۔ کہاں چاوڑی، اور کہاں کھاری باؤلی۔ جون کا مہینہ، کہیں راستہ میں لو لگ کر ٹّں نہ ہو جائیں" میں نے کہا "میاں دائی" کچھ دنوں چل کر دیکھو شاید مولوی صاحب کو رحم آجائے" مگر اُن کو آخر تک رحم نہ آنا تھا نہ آیا۔ لطف یہ ہے کہ جاڑوں میں صبح ساڑھے چھ بجے تعلیم کا وقت مقرر ہوا، لیکن ایمان کی بات ہے کہ مولوی صاحب

کی ہمت تھی کہ وہ ہمارے پڑھانے کو تیار ہو گئے۔ بیچاروں کا ایک منٹ خالی نہ تھا اور اُنھوں نے جو وقت ہم کو دیا تھا وہ اپنے آرام کے وقت میں سے کاٹ کر دیا تھا۔ تقریباً دو برس تک ہم اُن سے پڑھتے رہے، نہ ہم نے کبھی گرمی یا سردی کی شکایت کی، اور نہ کبھی وقت بدلنے کا لفظ زبان پر لائے، نہ اُن دو سال میں ایک دن ناغہ کیا۔ یہاں تک کہ مولوی صاحب بھی ہمیشہ کہتے تھے کہ "بیٹا جب تم دونوں آتے ہو، میرا دل خوش ہو جاتا ہے، کیونکہ میں تم میں طالب علمی کی بو پاتا ہوں، میں جانتا ہوں کہ تعلیم کس کو کہتے ہیں اور علم کیوں کر حاصل ہوتا ہے، جس طرح ہم نے پڑھا ہے کچھ ہمارا ہی دل جانتا ہے۔ اِس زمانہ کے لونڈوں پر کچھ ایسی بپتا پڑے تو گھر چھوڑ کر بھاگ جائیں۔ مگر (میری طرف دیکھ کر) اُستاد تم سے مجھے کچھ توقع نہیں۔ تم صرف بی۔ اے پاس کرنے کی فکر میں ہو، داؔتی کو شوق ہے، یہ عربی میں ترقی کرے گا۔ مگر تم کورے کے کورے ہی رہو گے اور انشاء اللہ پانچ چھ برس میں میری ساری محنت اکارت کردو گے۔" خدا کے فضل سے اُن کی یہ پیشین گوئی پوری ہوئی۔

اِس سے پہلے کہ میں مولوی صاحب کی ابتدائی تعلیم کا ذکر کروں، میں مولوی صاحب کی شکل وصورت، مکان کی حالت اُن کے رہنے سہنے کے طریقے اور اُن کے مشاغل کا نقشہ کھینچ دینا مناسب خیال کرتا ہوں، تاکہ مولوی صاحب کے کیرکٹر کا صحیح اندازہ ہو سکے۔



جنھوں نے اسٹیج پر اُن کو شالی رومال باندھے، کشمیری جبّہ یا ایل۔ ایل۔ ڈی کا گون پہنے دیکھا ہے، اُنھوں نے عالی جناب شمس العلما

مولوی، حافظ ڈاکٹر نذیر احمد خاں صاحب ایل۔ایل۔ڈی مدظلہ تعالیٰ کو دیکھا ہے، مولوی نذیر احمد صاحب کو نہیں دیکھا۔ اُن کے گھر کے اور باہر کے لباس میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ اگر اُن کو روزانہ باہر نکلنے کا شوق نہ ہوتا تو لباس کی مدہی اُن کے اخراجات کی فہرست سے نکل جاتی۔ جب شام کو گھر سے نکلتے تو عموماً ترکی ٹوپی یا چھوٹا سفید صافہ باندھ کر نکلتے تھے۔ گرمیوں میں نہایت صاف شفاف سفید اچکن اور سفید کرتا پیجامہ ہوتا، اور جاڑوں میں کشمیرے کی اچکن یا کشمیری کام کا جبّہ۔ چونکہ سراج الدین صاحب سے لین دین تھا، اس لئے لال نری کا سلیم شاہی جوتہ زیادہ استعمال کرتے تھے۔ پھر وقت بے وقت کے لئے دو انگریزی جوڑے لگا رکھے تھے۔ جن پر میری یاد میں پالش ہونے کی کبھی نوبت نہ آئی، یہاں تک کہ دونوں سوکھ کر کھڑنک ہو گئے تھے۔ انھیں کا پاؤں تھا کہ اُن چینیوں کے سے سخت جوتوں کی برداشت کرتا تھا۔ جرابوں سے اُنھیں نفرت تھی گو دربار میں جانے کے لئے دو ایک جوڑیاں پاس رہتی تھیں۔ یہ تو پبلک کے مولوی صاحب ہوئے۔

اب ہمارے مولوی صاحب کو دیکھئے، آیئے میرے ساتھ چوڑی والوں سے چلئے، چوڑی والوں سے نکل کر چاوڑی میں آئیے۔ اُلٹے ہاتھ کو مڑ کر قاضی کے حوض پر سے ہوتے ہوئے، سرکی والوں سے گزر کر لال کنوئیں پر پہنچیے۔ آگے بڑھئے تو بڑیوں کا کٹرہ ہے۔ وہاں سے آگے چل کر نئے بانس میں آئیے۔ یہ سیدھا راستہ کھاری باؤلی کو نکل گیا ہے۔ نکڑ سے ذرا ادھر ہی دائیں ہاتھ کو ایک گلی مڑی ہے۔ یہ بتاشے والوں کی گلی ہے۔ ایک گلی سیدھے ہاتھ کو مڑی ہے، تھوڑی ہی دور جا کر، بائیں طرف ایک پتلی سی

گلی اُس میں سے کٹ گئی ہے۔ اُس گلی میں پہلا مکان مولوی صاحب کا ہے۔ مکان دو منزلہ ہے اور نیا بنا ہوا ہے۔ صفائی کی یہ حالت ہے کہ تنکا پڑا نظر نہیں آتا۔ دروازے کے باہر دونوں پہلوؤں میں دو سنگین چوکیاں ہیں۔ دروازے کو عبور کرنے کے بعد صحن میں آتے ہیں۔ صحن کسی قدر چھوٹا ہے۔ سیدھی طرف دفتر ہے۔ جہاں اکثر دو تین آدمی بیٹھے کلام مجید پڑھا کرتے ہیں۔ اُس کے مقابل بائیں طرف باورچی خانہ ہے۔ چولھے بنے ہوئے ہیں، آگ جل رہی ہے۔ مگر برتن اور ہنڈیاں وغیرہ جو باورچی خانہ کا جزو لاینفک ہیں، سرے سے ندارد ہیں۔ آگ صرف حقّے کے لئے سُلگائی جاتی ہے، کھانا دوسرے گھر سے پک کر آتا ہے۔ دروازے کے بالکل سامنے اکہرا دالان ہے، اور اندر ایک لمبا کمرہ۔ گرمی کا موسم ہے اور مولوی صاحب ایک چھوٹی سی میز کے سامنے کچھ لکھ رہے ہیں۔ کمرے کے دو دروازے بند ہیں ایک کھُلا ہے۔ باہر ایک بُڑھیا پھونس، بیچاری بیٹھی پنکھے کی رسّی کھینچ رہی ہے۔ ہاں تو میں کیا تصویر دکھانا چاہتا تھا؟ مولوی صاحب کا لباس۔ مگر خُدا کے فضل سے اُن کے جسم پر کوئی لباس ہی نہیں ہے۔ جس کا تذکرہ کیا جائے۔ نہ کُرتہ ہے، نہ ٹوپی نہ پیجامہ۔ ایک چھوٹی سی تہمد برائے نام کمر سے بندھی ہوئی ہے، بندھی ہوئی نہیں محض لپٹی ہوئی ہے، لیکن گرہ کے جنجال سے بے نیاز ہے، کمرے میں نہایت اُجلی چاندنی کا فرش ہے۔ ایک طرف پلنگ بچھا ہوا ہے۔ کبھی اُس پر چادر ہے کبھی نہیں ہے۔ سرہانے تکیہ رکھا ہے۔ مگر اُس کی رنگت کا بیان احاطۂ تحریر سے باہر ہے۔ البتہ جس گاؤ تکیہ سے مولوی صاحب لگے بیٹھے ہیں وہ بہت صاف ہے۔ قالین بھی عمدہ اور قیمتی ہے۔ جاڑوں میں مکان کے اوپر کے

حصّے میں رہتے تھے۔ چلئے وہاں کا رنگ بھی دکھادوں۔صدر دروازے سے ملا ہوا زینہ ہے اور سیڑھیوں کے ختم ہونے پر غسل خانہ اور بیت الخلا ہے۔ اس کے بعد ایک دروازہ آتا ہے دروازے سے گزر کے چھت پر آتے ہیں۔ سامنے ہی ایک کمرہ ہے اور اُس کے دونوں جانب کوٹھریاں۔ غسل خانے کے بالکل مقابل، دوسری طرف ایک چھوٹا سا کمرہ ہے۔آخر آخر میں مولوی صاحب یہیں رہا کرتے تھے۔جس زمانہ میں ہم پڑھتے تھے تو اُن کی نشست سامنے والے کمرے میں تھی۔ یہاں بھی چاندنی کا فرش ہے، اُس پر قالین، پیچھے گاؤتکیہ، سامنے ایک چھوٹی سی میز، پہلو میں حقّہ، اُس کی حقیقت کما حقّہ بیان کرنی مشکل ہے۔مولوی صاحب کو حقّہ کا بہت شوق تھا۔ مگر تمبا کو ایسا کڑوا پیتے تھے کہ اُس کے دھوئیں کی کڑوا ہسٹ بیٹھنے والوں کے حلق میں پھندا ڈال دیتی تھی۔ فرشی قیمتی تھی۔ مگر چلم پیسہ کی دو والی، اور نیچہ تو خدا کی پناہ، اُس کے تیار ہونے کی تاریخ لوگوں کے دلوں سے مدّت کی محو ہو چکی تھی۔ ایک آدھ دفعہ ایک صاحب نے نیچہ بدلنے کا ارادہ بھی کیا، مگر مولوی صاحب نے ایسا سخت فقرہ کسا کہ بیچارے ٹھنڈے ہو کر رہ گئے۔ خیر جاڑے کا موسم ہے، مولوی صاحب بیٹھے حقّہ پی رہے ہیں اور پڑھا رہے ہیں۔ سر پر کنٹوپ ہے، مگر بڑا دقیانوسی کبھی کانوں کو ڈھکے ہوئے اور ڈوریاں نیچے لٹکتی ہوئیں۔کبھی اس کے دونوں پاکھے کھڑے ہو کر لاٹ پادری کی ٹوپی کا نمونہ بن جاتے اور ڈوریاں طرّے کا کام دیتیں۔کبھی پاکھوں کو سر پر اوپر تلے ڈوریوں سے کس دیا جاتا اور اس طرح کنٹوپ فلٹ کیپ کی شکل اختیار کر لیتا۔ جسم پر روئی کی مرزئی مگر ایسی پرانی کہ اُس کی روئی کی گرمی مدّت سے

مائل بہ سردی ہو چکی ہے۔ اوپر صندلی رنگ کا دُھبّہ پڑا ہوا۔ لیجئے دیکھا آپ نے ہمارے مولوی صاحب کو؟ چار بجے اور مولوی صاحب نے آواز دی، "پانی تیار ہے؟" جواب ملا "جی ہاں"۔ مولوی صاحب غسل خانے میں گئے۔ کپڑے بدل، یا یوں کہو کہ جون بدل، باہر نکل آئے اور چلے "ٹاؤن ہال" کو۔ لیجئے اب یہ ہمارے مولوی صاحب نہیں رہے، آپ کے مولوی صاحب ہو گئے۔

(مرزا فرحت اللہ بیگ)

